دینِ انسانیت

اسلام کا فکری اور عملی اور تاریخی مطالعہ

مولانا وحید الدّین خاں

دینِ انسانیت

اسلام کا فکری اور عملی تاریخی مطالعہ

مولانا وحیدالدّین خاں

Goodword Books

Deen-e-Insaniyat
By Maulana Wahiduddin Khan

First published 1997
This edition published 2026
This book is copyright free

Goodword Books
A-21, Sector 4, Noida-201301, Delhi NCR, India
Mob. +91 8588822672
info@goodwordbooks.com
www.goodwordbooks.com

CPS International
Centre for Peace and Spirituality International
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110 013, India
Mob. +91-9999944119
info@cpsglobal.org
www.cpsglobal.org

Center for Peace and Spirituality USA
391 Totten Pond Road
Suite 402, Waltham MA 02451, USA
Mob. +1 617 960 7156
info@cpsusa.net

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست

حریت فکر

اظہار خیال کی آزادی 8
خدا کا تخلیقی نقشہ 10
تواصی بالحق 13
اختلاف میں رحمت 16
نصیحت، تعییب 18
افکار کا ٹکراؤ 21
فطرت کا نظام 23
دربار الٰہی میں 24
پیغمبر کی مثال 26
ابوبکر صدیق کی مثال 27
عمر فاروق کی مثال 28
عثمان غنی کی مثال 29
علی مرتضیٰ کی مثال 31
ایک واقعہ 32
ظاہر داری نہیں 33
سوال و جواب 35
حد بندی 36
اختلاف کے باوجود 37
صحت مند نتائج 38
حریت فکر 39
حق کا اعتراف 41
حق کی برتری 43
اضافۂ ایمان 44
بے جا غلو 47
جارحیت نہیں 49
مشترک ذمہ داری 51
آزادی کی حد 54
اختلافات کی توجیہ 56
روشنی کی طرف 62
حکیمانہ قول 64
فرقہ بندی 65
اختلاف رائے 67

دین انسانیت

تمہید 70
خدا اور انسان 71
عبادت اور خدمت 72
والدین کے ساتھ 73
عمل صالح 75
صبر کی تعلیم 76
روحانی ترقی 77
اعلیٰ اخلاق 79
اچھا گمان 80
تواضع 81
نرمی کا انداز 83
قناعت 84
ایثار 85
مہربانی کا سلوک 86
عدل و انصاف 88
قصد و اعتدال 89
نفع بخشی 91
سچائی 92
حق رسانی 93
غصہ نہیں 94
امانت اور عہد 96
پاکی اور صفائی 97

حق کی ادائیگی 98
تیسیر پسندی 99
مشرک کا حکم 101
مجرم کے ساتھ بھی 102
دو طریقے 103
دعوہ کلچر 105
ایک دُعا 106
محنت کی کمائی 107
مالی تعاون 108
انسانیت عامہ 110
عالمی اخوت 111
وسیع تر آدمیت 112
عمومی عزت 114
آفاقی انسان 115
احترام انسانیت 116
سب پر سلامتی 117
خدمت عام 119
رحمت، سیف 120
جنگ کا حکم 121
بین اقوامی رواج 123
فرشتہ کی مدد 124
اِذن اللہ 128
دعا بھی عمل 129

رحمت کلچر

رحمت کلچر 132
آفاقیت نہ کہ محدودیت 133
حقیقتِ اسلام 134
پیغمبرؐ کا طریقہ 136
صبر و توکل 137
حُسن اخلاق 138
اسلامی طریقہ 140
رسول خدا کا اسوہ 141
عافیت کی زندگی 142
غیر اثر پذیر 144
صبر کی اہمیت 145
ایک آیت 146
غلط فہمی 148
مطلوب عمل 149
کلام کی شرط 150
بلند کرداری 152
قرآنی اصول 153
بے حساب اجر 154
قلبی عمل 155
اعتماد و توکل 157
برتر روش 158
اعتدال کا طریقہ 159
بہتر انسان 161
ایک اسلامی حکم 162
شکایت کے باوجود 163
عبادت اور اخلاق 164
معیار کو بلند کرنا 166
ترک تعلق 167
چپ رہنا 168
صبر ضروری 169
اجتماعی آداب 171
درس حدیث 172
پیغمبر کا طریقہ 173
اخلاق کا کرشمہ 175
آگ کا ٹکڑا 176
والدین کی ذمہ داری 178
قرآنی طریقہ 179
چپ رہیے 180
قیامت میں ادائیگی 182

قناعت 183
اختلاف کے باوجود 185
دعا اور اعتراف 187
خیر کثیر 188
صبر کی عبادت 189
برا گمان 190
دفع احسن 192
صبر کی اہمیت 193
تکبیر، تواضع 194
جنت میں مکان 196
سکون کا راز 197
ان شاء اللہ 198
تنگی میں آسانی 199

حیاتِ مومن

ایمان و اسلام کے واقعات 201
صفت مومن 202
مثبت طریقہ 203
قول سدید 204
قابلِ پیشین گوئی کردار 205
خیر پسند 207
اچھا مسلمان 208
جامع اصول 209
بے مسئلہ 210
پڑوسی کے ساتھ 212
حدیث کا مطالعہ 213
اعتراف 214
ناشکری نہیں 216
جنت کے کنارے 217
ذکر و فکر 218
ایک انسانی کردار 219
زاویۂ نظر کا فرق 221
نصرت کا قانون 222
اثر قبول نہ کرنا 223
مخلص، منافق 225
پاکیزہ روش 226
مومن کا طریقہ 227
پہچان کا فرق 229
فکری انقلاب 230
کھجور کی چپل پہننے والے 231
عزت کیسے ملتی ہے 233
ایک دعا 234
خاموش تدبیر 236
زبان کی طاقت 237
حاضر جوابی 238
اعلیٰ کردار کی ایک مثال 240
حوصلہ مندی 241
کامیاب مقابلہ 243
مثبت اثر 245
صرف الفاظ سے 246
اِس پل پر یا اُس پل پر 247
کتے سے بھی زیادہ برا 247
غریبی کا مطلب بے وقوفی نہیں 248
غم آدمی کو گہرا بنا دیتا ہے 248
تنقید کو سن کر 249
نقطۂ انقلاب 250
ترک تعلق 251
برائی کی قسمیں 253
صبر و ہمدردی 254
سچی ہوشیاری 255
اعلیٰ ظرفی 257
مومنانہ طریقہ 258
چھوٹا واقعہ بڑا سبق 259
دو انسان 261
دو گواہ 262
کرنے کا کام 263

مسافر کی زندگی 265
حدیث دعا 266
بعضکم من بعض 267

خاتون جنت

عورت، مرد 272
خاتون جنت 273
فطرت کا نظام 276
تقسیم کار 278
بہترین خزانہ 281
خیر کثیر 283
اخلاق نسواں 286
روزمرہ کی زندگی 289
حسن معاشرت 291
مومن کا گھر 294
تربیت اولاد 296
صلح بہتر ہے 299
انتظار کیجیے 302
پیغمبرانہ نصیحت 304
جنت کا استحقاق 307
سب سے زیادہ 309
غلط فہمی 312
غیبت نہیں 314
ہاجرہؓ — ام اسماعیلؑ 317
حضرت خدیجہ 320
حضرت عائشہ 322
ایمان کی طاقت 325
ایک گواہی 328
تین مرحلے 331
نکاح وطلاق 335
نکاح سے پہلے 335
نکاح کے بعد 335

رحمۃ للعالمینؐ

مطالعہ سیرت 338
دلیل نبوت 339
سیرت کی رہنمائی 354
ممکن سے آغاز 354
عسر میں یسر 355
ہجرت: مقام عمل کی تبدیلی 356
فطرت پر اعتماد 357
دشمن کو استعمال کرنا 358
امن کی طاقت 358
تھرڈ آپشن 359
میدان عمل کی تبدیلی 360
تدریج کا اصول 361
آئیڈیلزم کے بجائے پریگمیٹزم 362
بصیرت کی ضرورت 363
حدیبیہ منہاج 365
جنگ پر بیعت نہیں 377
صبر کی اہمیت 382
تکمیل دین 383
آخری بات 393
پیغمبر اسلام کا اسوہ 394
پیغمبرانہ طریقہ 395
پیغمبرانہ اسلوب 397
اسوۂ حسنہ 398
ہجرت رسولؐ 400
قائد اتحاد 401
سنجیدگی شرط ہے 404
ایک شہادت 406

مذہب امن

اسلام مذہبِ امن 410
دین انسانیت 417
دین انسانیت 419

حریتِ فکر

فکر و خیال کی آزادی اور اسلام

اظہارِ خیال کی آزادی

اسلام میں انسان کو مکمل فکری آزادی دی گئی ہے۔ بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ اسلام ہی نے پہلی بار انسانی تاریخ میں یہ انقلاب برپا کیا کہ ہر آدمی کو فکر و خیال کی آزادی ہو۔ اسلام سے پہلے تاریخ کے تمام زمانوں میں جبر کا نظام قائم تھا اور انسان فکری آزادی سے محروم تھا۔ فکری آزادی کوئی سادہ بات نہیں، حقیقت یہ ہے کہ تمام انسانی ترقیوں کا راز اسی فکری آزادی میں چھپا ہوا ہے۔

فکری آزادی کا پہلا فائدہ یہ ہے کہ انسان اس اعلیٰ نیکی کو حاصل کرتا ہے جس کو قرآن میں خوف بالغیب کہا گیا ہے (5:94)۔ یعنی خدا کی طرف سے ظاہری دباؤ کے بغیر خود اپنے ارادہ کے تحت آزادانہ طور پر خدا کا اعتراف کرنا اور اس سے ڈر کر دنیا میں رہنا۔ جب تک مکمل آزادی کا ماحول نہ ہو کسی کو اس ناقابل بیان لذتِ روحانی کا تجربہ نہیں ہو سکتا جس کو غیب میں خدا سے ڈرنا کہا گیا ہے۔ اور نہ یہی ممکن ہے کہ کسی کو اس اعلیٰ انسانی عمل کا کریڈٹ دیا جا سکے۔

آزادئ فکر وہ چیز ہے جو آدمی کو منافقت سے بچاتی ہے۔ انسان ایک سوچنے والی مخلوق ہے۔ اس کا ذہن لازمی طور پر سوچتا ہے اور رائے قائم کرتا ہے۔ ایسی حالت میں اگر آزادانہ اظہارِ رائے پر پابندی لگا دی جائے تو لوگوں کی سوچ تو بند نہیں ہو گی البتہ ان کی سوچ زبان و قلم پر نہیں آئے گی۔ جو ادارہ یا جو قوم یا جو ریاست اظہارِ خیال کی آزادی پر پابندی لگائے وہ آخرکار منافقوں سے بھر جائے گا۔ ایسے ماحول کے اندر مخلص انسان کبھی پرورش نہیں پا سکتے۔

اسی طرح فکری آزادی کا براہ راست تعلق تخلیقیت سے ہے۔جس سماج میں فکر وخیال کی آزادی ہو وہاں تخلیقی انسان جنم لیں گے۔اور جس سماج میں فکر وخیال کی آزادی پر روک لگا دی جائے وہاں لازمی طور پر ذہنی جمود طاری ہو جائے گا اور نتیجتاً یہ ہوگا کہ ایسے سماج میں تخلیقی ذہن کی پرورش اور اس کا ارتقا ہمیشہ کے لیے رک جائے گا۔

اظہار اختلاف یا تنقید کے معاملہ میں صحیح مسلک یہ ہے کہ لوگ اس معاملہ میں اپنی غیر ضروری حساسیت کو ختم کر دیں، نہ یہ کہ خود تنقید واختلاف کے عمل کو بند کرنے کی کوشش کریں۔یہی اسلام کا تقاضا ہے اور یہی فطرت کا تقاضا بھی۔

حدیث میں مومن کی صفت یہ بتائی گئی ہے کہ: الَّذِينَ إِذَا أُعْطُوا الْحَقَّ قَبِلُوهُ (مسند احمد، حدیث نمبر 24379)۔یعنی وہ لوگ کہ جب انھیں کوئی حق دیا جائے تو وہ اس کو قبول کرلیں۔ یہاں حق سے مراد امر حق ہے۔دوسرے لفظوں میں یہ کہ مومن وہ ہے جس کے اندر اعتراف حق کا مادہ کامل طور پر موجود ہو۔جب بھی کوئی سچائی اس کے سامنے لائی جائے، جب بھی اس کی کسی غلطی کی نشاندہی کی جائے تو کوئی بھی احساس اس کے لیے قبول حق کی راہ میں رکاوٹ نہ بن سکے۔

اس صفت کا کامل درجہ یہ ہے کہ آدمی خود ہی پیشگی طور پر اس انتظار میں رہے کہ کب کوئی بتانے والا اس کو اس قسم کی کوئی بات بتائے اور وہ خوش دلی کے ساتھ فوراً اسے اپنا لے۔ وہ اپنی اصلاح اور اپنی درستگی کا حریص بن جائے۔ یہی مومنانہ کیفیت حضرت عمر فاروق کی زبان سے ان الفاظ میں ظاہر ہوئی کہ انھوں نے کہا کہ اللہ اس انسان پر رحم کرے جو میرے عیوب کا تحفہ مجھے بھیجے: رَحِمَ اللّٰہُ مَنْ أَھْدَی إِلَيَّ عُيُوبِي (مسند الدارمی، حدیث نمبر 675)۔

حقیقت یہ ہے کہ اعتراف حق ایک عبادت ہے، بلکہ وہ سب سے بڑی عبادت ہے۔ یہ وہ عمل ہے جس کے لیے آدمی کوسب سے بڑی قربانی دینا ہوتا ہے، یہ سب سے بڑی قربانی اس کوسب سے بڑی عبادت بنا دیتی ہے۔ یہ قربانی اپنے وقار کی قربانی ہے۔ یہ اپنی بڑائی کو کھونے کی قربانی ہے۔ یہ حق کے لیے اپنے آپ کو بے قیمت کرنے کی قربانی ہے۔ یہ وہ موقع ہے جب کہ آدمی جنت کی قیمت دے کر جنت میں داخلہ کا استحقاق حاصل کرلیتا ہے۔

اس عظیم عبادت اوراس عظیم خوش قسمتی کا موقع کسی کوکب ملتا ہے۔ یہ موقع صرف اس وقت ملتا ہے جب کہ لوگوں کو اظہار خیال کی پوری آزادی ہو۔ جب کسی رکاوٹ کے بغیر ایک آدمی دوسرے آدمی پر تنقید کر سکے۔ جب معاشرہ میں یہ ماحول ہو کہ کہنے والا بےتکلف اپنی بات کو کہے اور سننے والا کھلے طور پر اس کو سنے۔

جس طرح مسجد نماز باجماعت کی ادائیگی کا مقام ہے، اسی طرح اظہار خیال کی آزادی گویا وہ سازگار ماحول ہے جس کے اندر حق کو کہنے اور حق کو قبول کرنے والی عظیم نیکیاں جنم لیتی ہیں۔ اسی طرح کے ماحول میں وہ معاملات پیش آتے ہیں جب کہ ایک شخص کو اعلان حق کا کریڈٹ دیا جائے اور دوسرے شخص کو قبول حق کا انعام۔

خدا کا تخلیقی نقشہ

دنیا میں ہدایت کا نظام ایمان بالغیب (البقرۃ،2:3) کے اصول پر قائم ہے۔ یعنی یہاں تمام حقیقتوں کو غیر مرئی حالت میں رکھ دیا گیا ہے۔ اب یہ انسان کا کام ہے کہ وہ اپنی فکری قوتوں کو عمل میں لا کر ان پوشیدہ حقیقتوں کو دریافت کرے اور پھر ان کی کامل مطابقت میں اپنی زندگی گزارے۔

انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ خدا کو اپنا بڑا بنائے، حالاں کہ خدا کی بڑائی اس کی آنکھوں کے سامنے موجود نہیں۔ انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ خدا کی پکڑ سے ڈرے، حالاں کہ خدا کی تعذیبی طاقت دنیا میں کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ اسی طرح انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ داعیان حق کا ساتھ دے، مگر داعیان حق ہمیشہ عام انسان کے روپ میں سامنے آتے ہیں، ان کو پہچاننا صرف اس کے لیے ممکن ہوتا ہے جو ظاہر سے گزر کر باطن کی سطح پر دیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

یہی عام دنیوی چیزوں کا معاملہ بھی ہے۔ دنیا میں بے شمار مادی امکانات تھے۔ مگر وہ سب زمین کے اندر چھپا کر رکھ دیے گئے۔ ان مادی امکانات کو دریافت کر کے انھیں ایک ترقی یافتہ تمدن کی صورت دینا، یہ انسان کا کام تھا جو موجودہ زمانہ میں بڑے پیمانہ پر انجام دیا گیا ہے۔

اس لحاظ سے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ فطرت کا طریقہ عین وہی ہے جس کو فن تعلیم میں اکتشافی طریقہ (discovery method) کہا جاتا ہے۔

اس اکتشافی طریقہ کو قابل عمل بنانے کے لیے انسان کو ایک اعلیٰ درجہ کا ذہن دیا گیا جو امکانی طور پر ہر قسم کی ضروری صلاحیتوں سے بھرا ہوا تھا۔ انسان کا ذہن اس قابل تھا کہ وہ غور و فکر کر کے اشیاء کی حقیقتوں کو جانے۔ ایک طرف وہ اپنے خالق کو پہچانے، اور دوسری طرف دنیا کے اندر چھپی ہوئی مادی نعمتوں کو دریافت کر کے انھیں اپنی تعمیر حیات میں استعمال کرے۔

پیغمبر کی حیثیت اس عمل میں ایک مستند رہ نما کی ہے۔ خدا کا پیغمبر وہ بنیادی اصول دے دیتا ہے جس کی رہ نمائی میں انسان اپنا اکتشافی سفر شروع کرے اور اس کو کامیابی کی منزل تک پہنچائے۔ اس طرح جو حقیقت ملتی ہے وہ آدمی کے لیے اس کی ذاتی دریافت ہوتی ہے۔ وہ اس کی پوری شخصیت کو متاثر کرتی ہے۔ وہ اس کے لیے ابدی سرمایۂ حیات بن جاتی ہے۔

مگر دنیا کی تاریخ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین پر انسانیت کے آغاز کے جلد ہی بعد بادشاہت کی صورت میں جبر کا نظام قائم ہو گیا۔ تمام آباد دنیا کچھ بادشاہوں کے زیر قبضہ آ گئی۔ ان بادشاہوں نے اپنے اقتدار کو مستحکم بنانے کے لیے کامل جبر کا نظام اختیار کر لیا۔ اس طرح ساری دنیا میں آزادانہ فکر اور آزادانہ اظہار خیال کا خاتمہ ہو گیا۔ وہ چیز جس کو آزادیٔ اظہار (freedomofspeech) کہا جاتا ہے وہ قدیم دنیا میں سرے سے موجود ہی نہ تھی۔

یہی جبر کا نظام ہے جس نے پچھلے زمانوں میں پیغمبروں کی بات کو چلنے نہیں دیا۔ پھر یہی جبر کا نظام ہے جو سائنسی دریافتوں اور ترقیوں میں مسلسل رکاوٹ بنا رہا۔ کیوں کہ کوئی بھی تصور اپنے ارتقا کے لیے آزادانہ سوچ اور آزادانہ بحث چاہتا ہے۔ قدیم نظام جبر میں اظہار خیال کی آزادی نہ تھی، اس لیے کھلا غور و فکر بھی اس زمانہ میں ممکن نہ تھا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت عامہ کے علاوہ یہ خاص کام بھی سونپا گیا کہ وہ دنیا میں قائم شدہ جبر کے نظام کو توڑ دیں۔ اس کے لیے انھیں خصوصی طور پر تمام ضروری مدد فراہم کی گئی۔ چنانچہ آپ نے اور آپ کے ساتھیوں نے سو سال سے بھی کم عرصہ میں ساری دنیا میں یا تو شاہی جبر کے اداروں کو توڑ دیا، یا اس کی بنیادیں اتنی کمزور کر دیں کہ اپنے وقت پر وہ خود ہی گر پڑے۔ اس سلسلہ میں رسولؐ اور اصحاب رسولؐ نے جو جہاد کیا وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک قسم کا خدائی آپریشن تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ جبر کے مصنوعی نظام کو توڑ کر آزادیٔ فکر کے فطری نظام کو قائم کر دیا جائے، تاکہ انسان کے لیے ہر قسم کی دینی اور دنیوی ترقی کا دروازہ کھل جائے۔

اسی نظام جبر کو قرآن میں فتنہ کہا گیا اور یہ حکم دیا گیا کہ اس نظام کے حاملین سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین سب اللہ کے لیے ہو جائے (8:39) اس آیت

میں دین سے مراد دین شرعی نہیں ہے بلکہ دین فطری ہے۔آیت کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی تخلیقی اسکیم میں خلل ڈالنے والے اِن ظالموں سے جنگ کروتا کہ فکری جبر کا غیر فطری نظام جو انھوں نے رائج کر رکھا ہے اس کا خاتمہ ہو اور فکری آزادی کی بنیاد پر خدا کا مطلوب نظام دنیا میں قائم ہو سکے۔مصنوعی حالت ختم ہو کر اصل فطری حالت زمین پر بحال ہو جائے۔یہ کام اب مکمل طور پر ساری دنیا میں انجام پا چکا ہے۔اور اس نے انسان کے اوپر ہر قسم کی سعادت کے دروازے کھول دیے ہیں۔

تواصی بالحق

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اس دنیا میں خسران اور گھاٹے سے صرف وہ لوگ محفوظ رہتے ہیں جو تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کا کام کریں (103:1-3) اسی طرح قرآن میں خیر امت یا بہتر گروہ کی خاص صفت یہ بتائی گئی ہے کہ ان کے درمیان امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا نظام قائم ہو (3:110)۔

یہ تواصی بالحق یا امر بالمعروف کیا ہے، وہ حدیث کے الفاظ میں یہ ہے کہ کوئی آدمی جب کوئی نادرست بات دیکھے تو وہ اس کو درست کرنے کی کوشش کرے۔طاقت ہو تو ہاتھ سے اور طاقت نہ ہو تو زبان سے۔تواصی بالحق اسی عمل کا ابتدائی درجہ ہے، اور امر بالمعروف اسی عمل کا اگلا درجہ یا مرحلہ۔

اس مطلوب شرعی عمل کو کسی سماج میں جاری کرنے کی پہلی شرط یہ ہے کہ وہاں اظہار خیال کی مکمل آزادی ہو۔ہر آدمی کے لیے یہ ممکن ہو کہ جب بھی وہ کسی خلاف حق بات کو دیکھے تو وہ کسی رکاوٹ کے بغیر کھلے طور پر اس کے بارے میں بول سکے۔

اب یہ ظاہر ہے کہ حق اور ناحق کا اصل معیار قرآن وسنت ہے، نہ کہ کسی شخص کا اپنا خیال۔ اس لیے جب بھی کوئی شخص اس احساس میں مبتلا ہوگا تو وہ سب سے پہلے زبان یا قلم کے ذریعہ اس کا اظہار کرے گا تا کہ اس پر بحث شروع ہو۔ اس طرح بحث ومباحثہ کے بعد یہ ثابت ہوگا کہ کیا چیز درست ہے اور کیا چیز نادرست۔ اس طرح ثابت ہونے کے بعد صاحب اثر افراد کا یہ کام ہوگا کہ وہ اس کو حسب استطاعت عملاً نافذ کریں۔ گویا تواصی بالحق اور امر بالمعروف کی تعلیم کا تقاضا ہے کہ مسلم معاشرہ میں دائمی طور پر اظہار خیال کی آزادی موجود رہے۔ اس قسم کی آزادی کے بغیر یہ شرعی عمل سرے سے اپنی صحیح صورت میں جاری ہی نہیں رہے گا۔

اسلام چاہتا ہے کہ ہر شخص کو کسی روک ٹوک کے بغیر یہ آزادی حاصل ہو کہ وہ دوسروں کے بارے میں اپنی رائے دے سکے۔ اس عمل کے پیچھے اگر واقعتاً نیک جذبہ کارفرما ہوگا تو اس کا یہ عمل قابل انعام ہوگا۔ اور اگر اس نے کسی برے جذبہ سے یہ کام کیا ہوگا تو وہ خدا کے یہاں قابل سزا قرار پائے گا۔

قرآن میں حضرت مسیح کی زبان سے یہ آیت ہے کہ: وَجَعَلَنِي مُبَارَكًا أَيْنَ مَا كُنْتُ (19:31)۔ مجاہد نے اس کی تفسیر میں کہا کہ: مُعَلِّمًا لِلْخَيْرِ (کتاب العلم لأبی خیثمۃ، اثر نمبر 30)۔ یعنی خدا نے مجھ کو خیر کا معلم بنایا ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: الْمُؤْمِنُ مِرْآةُ الْمُؤْمِنِ (سنن ابی داؤد، حدیث نمبر 4918)۔ یعنی ایک مومن دوسرے مومن کے لیے آئینہ کی مانند ہے۔ جس طرح آدمی آئینہ کے سامنے کھڑا ہو تو آئینہ کسی کمی بیشی کے بغیر اس کا اصل چہرہ اسے دکھا دے گا۔ اسی طرح مومن اپنے بھائی کو اس کی کمیوں سے آگاہ کرتا رہتا ہے، بغیر اِس کے کہ وہ اپنے آپ کو اونچا سمجھے اور دوسرے کو نیچا۔

یہی بات دوسری حدیث میں اس طرح ہے کہ: فَطُوبَى لِعَبْدٍ جَعَلَهُ اللّٰهُ مِفْتَاحًا لِلْخَيْرِ، مِغْلَاقًا لِلشَّرِّ (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 238) ۔یعنی بابرکت ہے وہ بندہ جس کو اللہ نے خیر کا دروازہ کھولنے والا اور شر کا دروازہ بند کرنے والا بنایا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو آدمی سچا خدا پرست ہو وہ خیر اور شر کے بارے میں انتہائی حساس ہوگا۔ اس کی یہ حساسیت اس کو مجبور کرے گی کہ جب بھی وہ کوئی خلاف حق بات دیکھے تو فوراً اس کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرے۔

تاہم یہ بات یک طرفہ نہیں ہے۔ خدا پرستی جس طرح آدمی کے اندر اظہار حق کا جذبہ ابھارتی ہے، اسی طرح وہ قبول حق کا جذبہ بھی آخری حد تک اس کے اندر پیدا کر دیتی ہے۔ ایسا آدمی جس طرح دوسروں کے خلاف تنقید یا اظہار رائے کرتا ہے، وہ خود بھی ہر وقت اس کے لیے تیار رہتا ہے کہ جب بھی اس کے سامنے امر حق پیش کیا جائے وہ فوراً اس کو قبول کر لے۔

حقیقت یہ ہے کہ دوسروں کے اوپر تنقید کا حق صرف اسی شخص کو ہے جو اسی شدت کے ساتھ خود اپنا بھی احتساب کرتا ہو۔ دوسروں کو نصیحت کرنا اسی کے لیے جائز ہے جو قلب و ذہن کی پوری آمادگی کے ساتھ اس کے لیے تیار رہے کہ جب بھی اس کے سامنے حق پیش کیا جائے گا تو انانیت یا وقار کا سوال اس کے لیے حق کی قبولیت میں رکاوٹ نہیں بنے گا۔ وہ کھلے دل کے ساتھ فوراً اس کو قبول کر لے گا۔

تواصی بالحق یا امر بالمعروف کا کام اسی وقت مفید ہوسکتا ہے جب کہ وہ دوطرفہ ہو۔ اگر وہ یک طرفہ ہو، ایک سنانے والا ہو اور دوسرا صرف سننے والا، تو ایسے ماحول میں کبھی وہ مقصد حاصل نہیں ہوسکتا جو تواصی بالحق اور امر بالمعروف کے نظام سے مطلوب ہے۔

اختلاف میں رحمت

الجامع الصغیر میں یہ حدیث آئی ہے کہ میری امت کا اختلاف رحمت ہے : اخْتِلَافُ أُمَّتِي رَحْمَةٌ (الجامع الصغیروزیادتہ، حدیث نمبر 1243) ۔ کچھ علماء نے اس حدیث کی صحت پر شک کیا ہے۔ مگر اس سے قطع نظر، یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ قرآن اور حدیث کا پورا ذخیرہ جو ہمارے پاس موجود ہے، اس میں خود علمائے امت نے بے شمار اختلافات کیے ہیں۔ قرآن کی تفسیریں اختلافات سے بھری ہوئی ہیں، اسی طرح احادیث کی شرحوں کا یہ حال ہے کہ شاید کوئی بھی حدیث ایسی نہیں جس کی تشریح میں اختلاف موجود نہ ہو۔

سوال یہ ہے کہ یہ اختلاف کیوں۔ اور یہ کہ یہ اختلاف رحمت تھا یا زحمت۔ قرآن ایسی ریاضیاتی زبان میں اترسکتا تھا کہ اس کی تفسیر وتاویل میں کسی قسم کے اختلاف کی سرے سے گنجائش ہی نہ ہو۔ اسی طرح حدیثوں میں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسے الفاظ اختیار کر سکتے تھے جو دو اور دو چار کی مانند ہوں، اور اس کا امکان ہی نہ ہو کہ ان کی شرح میں کوئی شخص اختلاف کا پہلو نکالے۔

اصل یہ ہے کہ اختلاف کوئی غیر مطلوب چیز نہیں، بلکہ وہ عین مطلوب ہے۔ اسی اختلاف کی بنا پر یہ ممکن ہوا کہ لوگ قرآن و حدیث میں زیادہ سے زیادہ غور وفکر کریں۔ اسی بنا پر یہ ممکن ہوا کہ اسلام ان کے لیے کوئی جامد چیز نہ ہو بلکہ وہ ان کے لیے خود دریافت کردہ حقیقت بن جائے۔ اسی بنا پر یہ ممکن ہوا کہ لوگوں کے اندر ذہنی سرگرمیاں جاری ہوں اور آخر کار ہر ایک مومن کو تخلیقی فکر کا حامل انسان بنادیں۔

الزام تراشی اور عیب جوئی ایک جرم ہے۔ بلکہ وہ کمینہ پن ہے جو بلاشبہ سب سے بری اخلاقی صفت ہے۔ مگر علمی اختلاف جو سنجیدہ غور وفکر سے ابھرتا ہے، وہ تو ایک نعمت ہے اور

انسانیت کی ترقی کے لیے لازمی شرط کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ جو سماج اختلاف سے خالی ہوجائے وہ ترقی سے بھی خالی ہوجائے گا۔

انسان کا ذہن ایک بند خزانہ ہے۔ اس بند خزانہ کو جو چیز کھولتی ہے وہ یہی اختلاف ہے۔ اختلاف رائے سے ذہن ترقی کرتا ہے، یہاں تک کہ ایک انسان سپر انسان بن جاتا ہے۔

آج ہمارے سامنے یہ سوال نہیں ہے کہ اختلاف کیا جائے یا نہ کیا جائے، اختلاف تو ہر وقت ہی ہر سطح پر اور ہر دینی معاملہ میں موجود ہے، بلکہ اصل سوال یہ ہے کہ دین میں روز اول سے آج تک جو بے شمار اختلافات پائے جا رہے ہیں ان کی توجیہہ کیا کی جائے۔ گویا مسئلہ موجودگی کی توجیہہ کا ہے نہ کہ اس کو باقی رکھنے کا یا باقی نہ رکھنے کا۔

مثلاً آپ قرآن کا مطالعہ شروع کریں اور اس کے لیے کوئی مستند تفسیر لیں، مثلاً القرطبی (وفات 1273ء) کی الجامع لاحکام القرآن۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم کی تفسیر شروع ہوتے ہی آپ کو یہ فقرہ لکھا ہوا ملے گا: فیھا سبع وعشرون مسئلة (اس میں 27 مسئلے ہیں)۔ گویا چار لفظ کے ایک جملہ میں دو درجن سے زیادہ اختلافی مسائل۔ اسی طرح سورہ فاتحہ میں اتنے زیادہ مسائل ہیں کہ چند سطر کی ایک سورہ کے مباحث پورے 43 صفحہ تک پھیلے ہوئے ہیں۔

اسی طرح 20 جلدوں کی یہ تفسیر آپ اس طرح پڑھیں گے کہ شاید اس کا کوئی بھی صفحہ اختلافی رایوں اور اختلافی اقوال سے خالی نہ ہوگا۔ یہاں تک کہ آپ معوذتین تک پہنچیں گے تو اس کی تفسیر میں دوسرے بہت سے اختلافات کے ساتھ یہ انتہائی نوعیت کا اختلاف آپ کو پڑھنے کے لیے ملے گا کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے خیال کے مطابق، یہ دونوں آخری سورتیں دراصل دعا ہیں وہ قرآن کا حصہ نہیں: وَزَعَمَ ابْنُ مَسْعُودٍ أَنَّهُمَا دُعَاءٌ تَعَوَّذَ بِهِ،

وَلَيْسَتَا مِنَ الْقُرْآنِ (تفسیر القرطبی، جلد 20، صفحہ 251)۔ یہی معاملہ مزید اضافہ کے ساتھ حدیث کا ہے۔ آپ اس کی کوئی بھی شرح لیں، مثلاً صحیح بخاری کی شرح فتح الباری کو لیجیے۔ آپ اس کو کھولیں تو پہلی حدیث یہ ملے گی کہ: إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ۔ یعنی، عمل کا دارومدار نیت پر ہے۔ یہ ایک متواتر حدیث ہے اور نہایت مستند ہے۔ مگر اس کی تقریباً نو صفحہ کی تشریح میں چھ بار اختلف اور اختلفوا جیسے الفاظ آئے ہیں۔ تیرہ جلدوں پر مشتمل پوری فتح الباری اسی طرح اختلافی تشریحات سے بھری ہوئی ہے۔

اس کے بعد اگر آپ فقہ اور عقائد کی کتابیں دیکھیں تو بظاہر ایسا معلوم ہوگا کہ وہ اختلافات کا ایک لامتناہی جنگل ہے۔ یہاں شاید کوئی ایک معاملہ بھی آپ کو ایسا نہیں ملے گا جو اختلافی رایوں سے خالی ہو۔ یہ اختلافات کوئی برائی نہیں، بلکہ وہ فکری مہمیز ہیں۔ وہ لوگوں کو سوچ پر ابھارتے ہیں۔ وہ ذہنوں کو متحرک کرکے انھیں ارتقا کی طرف لے جاتے ہیں۔

نصیحت، تعییب

قرآن میں حق کے داعیوں کے لیے نُصح اور ناصح کے الفاظ آئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ داعی کا کلام نصیحت کا کلام ہوتا ہے۔ یعنی، اس کے لکھنے یا بولنے کا محرک صرف اصلاح اور خیر خواہی ہوتا ہے۔ اس کے سوا کوئی بھی دوسرا محرک نہیں ہوتا جس کے تحت وہ دوسروں کے بارے میں بولے یا دوسروں کے اوپر قلم اٹھائے۔

ناصح کا کلام ذمہ داری کے احساس کے تحت نکلتا ہے۔ وہ بولنے سے پہلے سوچتا ہے اور لکھنے سے پہلے تحقیق کرتا ہے۔ اس کا جذبہ یہ ہوتا ہے کہ اگر میں خاموش رہا تو میں خدا کے یہاں پکڑا جاؤں گا۔ وہ شہرت یا اظہار خویش یا کسی دنیوی فائدے کے لیے نہیں بولتا۔ وہ

صرف اس لیے بولتا ہے کہ وہ محسوس کرتا ہے کہ بولنا اس کے لیے ایک فریضہ کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ وہ جس کے بارے میں بولتا ہے، اس کے حق میں عین اسی وقت وہ دل سے دعا بھی کر رہا ہوتا ہے۔

اس کے برعکس، لکھنے اور بولنے کی دوسری صورت وہ ہے جس کو عیب جوئی یا تنقیص کہا جا سکتا ہے۔ قرآن میں ہے کہ: وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَسْمَعُوا لِهَٰذَا الْقُرْآنِ وَالْغَوْا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُونَ (41:26) اس آیت میں والغوا فیہ کی تشریح حضرت عبداللہ بن عباس نے یہ کی ہے کہ عَيِّبُوهُ (تفسیر ابن کثیر جلد 4، صفحہ 98) یعنی، اس پر عیب لگاؤ، اس کو دوسروں کی نظر میں برا بتاؤ تاکہ لوگ بھڑک کر اس سے دور ہو جائیں۔

نصیحت اگر خیر خواہی کے جذبہ کے تحت نکلتی ہے تو تعییب اس کے برعکس بدخواہی کے جذبہ کے تحت۔ عیب جوئی اور الزام تراشی کرنے والے کے پیچھے نفرت، حسد، انانیت جیسے منفی محرکات ہوتے ہیں۔ اس کا مقصد دوسرے کی اصلاح کرنا نہیں ہوتا، بلکہ دوسرے کو گرانا اور بے وقعت کرنا ہوتا ہے۔

نصیحت نہ صرف جائز ہے بلکہ وہ کارِ ثواب ہے۔ اس کے مقابلہ میں تعییب و تنقیص یقینی طور پر حرام ہے، وہ صرف آدمی کے جرم میں اضافہ کرنے والی ہے۔ نصیحت صحت مند معاشرہ کی علامت ہے اور تعییب صرف بیمار معاشرہ کی علامت۔

جس معاشرہ میں نصیحت کی فضا ہو وہاں لوگ ایک دوسرے کو اپنا سمجھیں گے۔ لوگوں کے درمیان اعتماد کی فضا ہوگی۔ لوگوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے عزت و محبت کے جذبات ہوں گے۔ کوئی کسی کو غیر نہیں سمجھے گا۔ کوئی کسی کو شک کی نگاہ سے نہیں دیکھے گا۔ کوئی کسی کا استحصال کرنے کی کوشش نہیں کرے گا۔

مزید یہ کہ ایسے ماحول میں جب ایک آدمی دوسرے آدمی کے خلاف کوئی تنقیدی بات کہے گا تو سننے والا اس کو اپنے لیے وقار کا مسئلہ نہیں بنائے گا۔ بلکہ اس کو ایک سادہ بات کے طور پر سنے گا۔ اس طرح یہ ممکن ہو جائے گا کہ دونوں کے درمیان کھلی گفتگو ہو۔ دونوں اپنی ذات کو الگ کرکے خالص حق تک پہنچنے کی کوشش کریں، اور پھر جو بات درست ہو اس کو بخوبی قبول کرلیں۔

اس کے برعکس تعییب (عیب جوئی) کے انداز میں صرف نقصان ہی نقصان ہے۔ عیب جوئی کرنے والے کی بات کو سن کر اگر دوسرا آدمی بھڑک اٹھے تو دونوں میں لڑائی شروع ہوجائے گی جو تمام برائیوں میں سب سے زیادہ سنگین برائی ہے۔ اور اگر بالفرض سننے والا متحمل مزاج ہے اور وہ اپنے خلاف عیب جوئی کو سن کر خاموش رہ جاتا ہے تب بھی وہ نقصان سے خالی نہیں۔ اول یہ کہ عیب لگانے والے نے اپنا وقت ضائع کیا۔ وہ اپنے اس وقت کو کسی صحت مند کام میں استعمال کرسکتا تھا۔ دوسرے یہ کہ معاشرہ کے اندر یہ بری روایت قائم ہوئی کہ ایک دوسرے کے خلاف بے بنیاد الزام تراشی کی جاسکتی ہے۔

اس معاملہ میں اسلام کی تعلیم اس حدیث میں ملتی ہے کہ جو شخص اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اس کو چاہیے کہ وہ بولے تو بھلی بات بولے ورنہ چپ رہے: مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ فَلْيَقُلْ خَيْرًا أَوْ لِيَصْمُتْ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 47)۔

قول خیر وہ ہے جو ثابت شدہ حقیقت پر مبنی ہو، جس سے کوئی تعمیری فائدہ مقصود ہو۔ جو تمام تر اظہار حق کے جذبہ کے تحت نکلا ہو۔ جو اصلاً خدا کے لیے ہو نہ کہ کسی انسان کے لیے۔

جو آدمی سنجیدہ ہو، جو اللہ سے ڈرتا ہو، اس کے دماغ میں جب کوئی بات آتی ہے تو وہ بولنے سے پہلے سوچتا ہے۔ اگر وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کی بات فی الواقع کسی مثبت قدر کی حامل ہے تو وہ بولتا ہے، ورنہ وہ خاموشی اختیار کرلیتا ہے۔

افکار کا ٹکراؤ

قرآن (2:36) میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب آدم کو زمین پر بسایا تو پیشگی طور پر ان کو بتا دیا کہ نسلِ انسانی ایک دوسرے کی دشمن ہوگی (بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ)۔ یہ گویا خدا کے تخلیقی نقشہ کا ایک اعلان تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ انسان جیسی ایک مخلوق جب دنیا میں آباد ہوگی تو اس کا یہاں آباد ہونا کوئی سادہ بات نہیں ہوگی۔ یہاں انسانوں کے درمیان اختلاف و نزاع کی صورت پیدا ہوگی جو بعض اوقات شدید ہو کر عداوت تک جا پہنچیں گی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے لیے اس کے خالق نے ترقی کا کیا کورس مقرر کیا ہے۔ وہ کورس یہ ہے کہ انسانوں کے درمیان خیالات کا ٹکراؤ ہو۔ اس سے انسان کی ذہنی صلاحیتیں جاگیں گی۔ اس کی تخلیقیت میں اضافہ ہوگا۔ اس کے نتیجہ میں وہ نئی نئی دریافتیں کرتا چلا جائے گا۔ افکار کا ٹکراؤ اس کی سوئی ہوئی صلاحیتوں کو جگانے کا سبب بن جائے گا۔

اس پہلو سے دیکھئے تو اظہار رائے کی آزادی انتہائی طور پر ضروری ہے۔ کیوں کہ اگر آزادانہ اظہار رائے نہیں ہوگا تو خیالات کا ٹکراؤ نہیں ہوگا۔ اور جب خیالات کا ٹکراؤ نہیں ہوگا تو ذہنی جمود نہیں ٹوٹے گا۔ انسان نئی حقیقتوں تک پہنچنے میں ناکام رہے گا۔

مثلاً اسلام کے دور اول میں جب قرأت کے اختلاف کی بنا پر لوگ قرآن کی تلاوت مختلف انداز سے کرنے لگے تو لوگوں میں یہ بحث شروع ہوگئی کہ کون سی قرأت صحیح ہے اور کون سی قرأت غلط۔ اس کے نتیجہ میں کتابت کے فن نے ترقی کی۔ پھر ایسا ہوا کہ لوگ قرآن کے معانی میں اختلاف کرنے لگے۔ اس نے بھی ایک لسانی بحث کا آغاز کیا جو یہاں تک پہنچا کہ مسلمانوں میں عربی زبان کے ماہرین پیدا ہوئے، اور عربی کی ڈکشنریاں تیار کی گئیں جو پہلے موجود نہ تھیں۔ اسی طرح لوگ شرعی امور میں طرح طرح کے اختلافات کرنے لگے۔ اس کی

وجہ سے زبردست بحثیں شروع ہوئیں۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ اسلام میں علم تفسیر، علم حدیث، علم فقہ، علم عقائد اور دوسرے علوم باقاعدہ صورت میں مدوّن ہو گئے، وغیرہ۔ دوراول میں اگر یہ اختلافات پیش نہ آتے تو نہ ذہنوں میں بیداری پیدا ہوتی اور نہ علوم وفنون کا ارتقا ممکن ہوتا۔

پھر یہ عمل یہیں نہیں رکا۔ عباسی خلافت کے زمانہ تک پہنچ کر یہ ہوا کہ مسلمان ایشیا اور افریقہ کے پورے علاقہ میں پھیل گئے حتی کہ وہ یورپ کے اندر داخل ہو گئے۔ اب ان کا فکری ٹکراؤ مصر، ایران، یونان، وغیرہ ملکوں کے خیالات وافکار سے ہوا۔ اس کے فطری نتیجہ کے طور پر مسلمانوں کے درمیان عقلی بحثیں شروع ہو گئیں۔ یہ فکری ٹکراؤ آخر کار یہاں تک پہنچا کہ ایک نہایت طاقت ور علم کلام مدون ہو گیا۔ یہ کام زیادہ تر عباسی خلیفہ المامون کے زمانہ میں ہوا۔ المامون نہایت فراخ دل تھا۔ اس نے اس زمانہ کے اہل علم کو اظہار خیال کی پوری آزادی دے رکھی تھی: وأَطْلَقَ حُرِّيَّةَ الكَلامِ لِلْبَاحِثِينَ وَأَهْلِ الجِدَالِ وَالفَلاسِفَةِ (الاعلام للزرکلی، جلد 4، صفحہ 142)۔

پھر یہ سیلاب یہیں نہیں رکا۔ علم وتحقیق کا یہ عمل مزید آگے بڑھ کر دوسرے علمی وفنی شعبوں تک پہنچ گیا۔ مسلمانوں میں فلسفہ، طب، ریاضی، بحریات، فلکیات، ارضیات کے ماہرین پیدا ہوئے۔ انھوں نے وقت کے تمام سیکولر علوم میں امامت کا درجہ حاصل کرلیا۔

پہلے مسلمانوں کا فکری ٹکراؤ دوسری قوموں سے ہوا تھا۔ جب مسلمان علمی ترقی میں آگے بڑھ گئے تو اب دوسری قوموں کا فکری ٹکراؤ مسلمانوں کے ساتھ پیش آنے لگا۔ اس ٹکراؤ کے دوران مسلمانوں کے پیدا کردہ علوم اٹلی، اسپین، سسلی اور فرانس تک پہنچ گئے۔ اس کے نتیجہ میں یورپ میں نیا سائنسی دور شروع ہوا جو آخر کار موجودہ صنعتی انقلاب تک جا پہنچا۔ مغرب کا سائنسی اور صنعتی انقلاب براہ راست طور پر دوراول کی مسلم بیداری سے ٹکراؤ کا نتیجہ ہے۔

وہی عرب جب تک اپنے ملک کے حدود میں بند تھے وہ کوئی علمی کارنامہ انجام نہ دے سکے۔ مگر جب وہ اپنے ملک سے باہر نکلے اور بیرونی قوموں سے ان کا فکری وذہنی ٹکراؤ پیش آیا تو انھیں لوگوں نے اتنی ترقی کی کہ وہ علم وفکر کے عالمی امام بن گئے۔ یہ سارا معجزاتی واقعہ آزادانہ فکری تبادلہ کے نتیجہ میں پیش آیا۔

تنقید یا اظہار اختلاف دراصل تبادلۂ افکار ہی کا دوسرا نام ہے۔ کسی معاشرہ میں جتنا زیادہ فکری آزادی ہوگی، اتنا ہی زیادہ وہاں فکری تبادلہ ہوگا، اور اس فکری تبادلہ کے دوران تنقید اور اظہار اختلاف کی صورتیں بھی پیدا ہوں گی۔ فطرت کا مقرر کردہ یہی واحد ترقیاتی کورس ہے، افراد کے لیے بھی اور بحیثیت مجموعی پوری قوم کے لیے بھی۔

فطرت کا نظام

اسلام سے پہلے تقریباً 25 ہزار سال تک انسانی تاریخ کے آثار ملتے ہیں۔ مگر اس لمبی مدت تک انسان کوئی علمی ترقی نہ کر سکا۔ تمام علمی اور سائنسی ترقیاں بعد کو اس وقت شروع ہوئیں جبکہ اسلام نے قدیم شاہانہ جبر کے نظام کو توڑ کر دنیا میں فکری آزادی کے دور کا آغاز کیا۔

اس کا راز یہ ہے کہ ذہنی ترقی ہمیشہ تبادلۂ افکار کے ذریعہ ہوتی ہے۔ اور جبر اور تقلید کے نظام میں افکار کے تبادلہ کا عمل (پراسس) یکسر رک جاتا ہے۔ اسی بات کو امریکی ادیب والٹر لپمان (Walter Lippmann, 1889-1974) نے ان لفظوں میں بیان کیا کہ جب تمام لوگ ایک طرح سوچیں تو کوئی بھی شخص بہت زیادہ نہیں سوچتا:

When all think alike, no one thinks very much.

اصل یہ ہے کہ حقائق کی دنیا ایک لامحدود دنیا ہے۔ مگر ایک شخص کا تنہا ذہن صرف محدود طور پر سوچ پاتا ہے۔ اس لیے اگر جبر اور تقلید کا ماحول ہو تو ہر آدمی صرف محدود واقفیت کا حامل ہو گا۔ اس کے برعکس، اگر لوگوں کو سوچنے اور بولنے کی آزادی حاصل ہو تو لوگوں کے درمیان خیالات کا تبادلہ شروع ہو جائے گا۔ اب ہر آدمی دوسرے سے سیکھنا شروع کر دے گا۔ اس طرح مجموعی طور پر لوگ بہت زیادہ باتوں کو جان لیں گے۔ اس کے برعکس جہاں ایسا ماحول ہو جس میں تمام لوگ اپنے ہی دائرہ میں سوچیں تو ایسے ماحول میں لوگوں کی مجموعی واقفیت بھی بہت کم ہو گی۔

جب لوگوں کو سوچنے اور بولنے کی کھلی آزادی ہو گی تو لازماً اختلاف رائے پیدا ہو گا۔ لوگ ایک دوسرے کے نقطۂ نظر پر تنقید کریں گے۔ یہ تنقیدی عمل ذہنی ارتقا کا لازمی جزء ہے۔ تنقید کا خاتمہ سادہ طور پر صرف تنقید کا خاتمہ نہیں ہے۔ بلکہ وہ ذہنی ارتقا کا خاتمہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں ہمارے لیے انتخاب (چوائس) تنقید اور بے تنقید میں نہیں ہے بلکہ تنقید اور ذہنی جمود میں ہے۔ اگر آپ تنقید کو بند کریں تو عملاً جو چیز باقی رہے گی وہ ذہنی جمود ہو گا نہ کہ صرف بے تنقید صورت حال۔ فکری آزادی فطرت کے نظام میں معاونت ہے اور فکری پابندی فطرت کے نظام میں رکاوٹ۔

دربار الٰہی میں

قرآن میں پہلے انسان (آدم) کی پیدائش کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں ارشاد ہوا ہے: اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔ فرشتوں نے کہا کہ کیا تو زمین میں ایسے لوگوں کو بسائے گا جو اس میں فساد کرے

اور خون بہائے، اور ہم تیری حمد کرتے ہیں اور تیری پاکی بیان کرتے ہیں۔ اللہ نے کہا کہ میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ اور اللہ نے سکھا دیے آدم کو سارے نام۔ پھر ان کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ اگر تم سچے ہو تو مجھے ان لوگوں کے نام بتاؤ۔ فرشتوں نے کہا کہ تو پاک ہے۔ ہم تو وہی جانتے ہیں جو تو نے ہم کو بتایا۔ بے شک تو ہی علیم و حکیم ہے۔ اللہ نے کہا کہ اے آدم، ان کو بتاؤ ان لوگوں کے نام۔ تو جب آدم نے بتائے ان کو ان لوگوں کے نام (اور فرشتوں کا اشکال ختم ہو گیا) تو اللہ نے کہا کہ کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ آسمانوں اور زمین کے بھید کو میں ہی جانتا ہوں (2:30-33)۔

فرشتوں کا یہ قول اللہ سبحانہ وتعالیٰ پر بظاہر ایک اعتراض تھا۔ مگر اللہ نے اس پر زجر و توبیخ نہیں کی۔ بلکہ انھیں اصل منصوبہ کی تفصیل بتائی۔ اس کے بعد ان کا اشکال اپنے آپ ختم ہو گیا۔ اور شبہ کی جگہ یقین واپس آ گیا۔

اس طرح اللہ تعالیٰ نے آغاز انسانیت میں خود اپنی ذات کمال سے یہ نمونہ قائم فرمایا کہ اگر کوئی شخص کسی معاملہ میں اعتراض یا اشکال ظاہر کرے تو خود اعتراض پر اسے مطعون نہیں کیا جائے گا بلکہ اصل معاملہ کی وضاحت کی جائے گی تا کہ مکمل صورت حال سامنے آجائے۔ گویا جو واقعہ آئندہ تاریخ میں انسانوں کے درمیان پیش آنے والا تھا، اس کو خدا اور فرشتوں کے درمیان واقع کر کے عملی طور پر بتا دیا گیا کہ اس طرح کے مواقع پر انسان کو کس قسم کا رویہ اپنانا چاہیے۔

اس واقعہ میں یہ بھی مثال ہے کہ جب معاملہ کی وضاحت کر دی جائے تو معترض کو فوراً اسے دل سے قبول کر لینا چاہیے۔ اس واقعہ میں ایک طرف اگر اعتراض کا نمونہ ہے تو دوسری طرف اس میں اعتراف کا بھی اعلیٰ نمونہ موجود ہے۔

پیغمبر کی مثال

غزوۂ بدر (624ء) کے ابتدائی واقعات میں سے ایک واقعہ ابن اسحاق نے اس طرح بیان کیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفر کرتے ہوئے تیزی سے بڑھے۔ آپ نے بدر کے قریب ایک چشمہ کے پاس پڑاؤ کیا۔ اس وقت الحباب بن المنذر بن الجموح نے کہا کہ اے خدا کے رسول، یہ مقام کیا ایسا ہے کہ یہاں اللہ نے آپ کو اتارا ہے جس میں ہمیں یہ اختیار نہیں کہ ہم اس سے آگے بڑھیں یا اس سے پیچھے ہٹیں۔ یا کہ یہ ایک رائے ہے اور جنگی تدبیر ہے۔ آپ نے فرمایا کہ وہ رائے اور جنگی تدبیر ہے (بَلْ هُوَ الرَّأْيُ وَالْحَرْبُ وَالْمَكِيدَةُ)۔

انھوں نے کہا کہ اے خدا کے رسول، پھر تو یہ کوئی ٹھہرنے کی جگہ نہیں (فَإِنَّ هَذَا لَيْسَ بِمَنْزِلٍ) آپ یہاں سے روانہ ہو کر آگے چلیے۔ ہم لوگ اس چشمہ کے پاس اتریں جو قریش کے قریب ہے۔ اور پھر پیچھے جتنے پانی کے گڑھے ہیں، ان کو ناکارہ کر دیں۔ اور وہاں ایک حوض بنا کر اس کو پانی سے بھر لیں۔ پھر ان لوگوں سے جنگ کریں۔ تاکہ ہم پانی پئیں اور وہ نہ پئیں (فَنَشْرَبُ وَلَا يَشْرَبُونَ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر فرمایا کہ تم نے بہت ٹھیک رائے دی (لَقَدْ أَشَرْتَ بِالرَّأْيِ)۔

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے سب ساتھی اٹھ کر چلے۔ یہاں تک کہ جب قریش کے قریب ترین چشمہ کے پاس پہنچے تو وہاں اتر گئے۔ پھر دوسرے چشموں کے متعلق آپ نے حکم دیا تو وہ ناکارہ کر دیے گئے۔ جس چشمہ پر آپ اترے تھے اس پر حوض بنا کر اس کو پانی سے بھر لیا گیا (سیرت ابن ہشام، جلد 1، صفحہ 620)۔

اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں اظہار رائے کا

کھلا ماحول ہوتا تھا۔ ایک شخص نے جب آپ کی رائے کے خلاف رائے دی تو اس کو برا نہیں مانا گیا اور نہ اس پر غصہ کیا گیا۔ اس کے برعکس صرف یہ پوچھا گیا کہ تمہاری مختلف رائے کیوں ہے۔ جب اس نے وضاحت کی تو معلوم ہوا کہ اس کی رائے درست تھی۔ چنانچہ اس کی تعریف کی گئی اور فوراً اس کو قبول کرلیا گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ لوگوں کو اختلاف رائے کا موقع دینا اور اس کو سن کر اس سے فائدہ اٹھانا بھی پیغمبر کی سنتوں میں ایک سنت ہے۔

ابوبکر صدیق کی مثال

الاقرع بن حابس التمیمی اور عُیینہ بن حصن الفزاری کا شمار مؤلفۃ القلوب میں ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حنین کی فتح کے دن ان میں سے ہر ایک کو تالیف قلب کے طور پر سوسو اونٹ دیے تھے (البدایہ والنھایہ 7/141) روایات میں آتا ہے کہ یہ اونٹ انھیں آپ نے ان کے قبول اسلام سے پہلے دیا۔

ابن ھمام نے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ حضرت ابوبکر کی خلافت کے زمانہ میں یہ دونوں صاحبان آپ کے پاس آئے۔ انھوں نے خلیفہ اول سے ایک زمین طلب کی۔ خلیفہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ کے پیش نظر مطلوبہ زمین انھیں دے دی اور ان کے کہنے پر اس کی ایک تحریر بھی لکھ کر ان کے حوالے کردی۔

دونوں صاحبان تحریر لے کر باہر نکلے۔ حضرت عمر سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے بتایا کہ خلیفہ نے فلاں زمین ہمیں دے دی ہے۔ حضرت عمر نے تحریر ان سے لی اور اس کو پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا (فمزقه عمر) حضرت عمر نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح کی چیز تم کو پہلے دی تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ تم لوگوں کو اسلام کی طرف راغب کیا

جائے۔ لیکن اب اللہ نے اسلام کو عزت و طاقت دے دی ہے اور اس کو تم سے بے نیاز کر دیا ہے۔ تم اسلام پر قائم رہو تو بہت اچھا ہے، ورنہ ہمارے اور تمہارے درمیان تلوار رہے۔

دونوں لوٹ کر دوبارہ حضرت ابوبکر کے پاس گئے اور قصہ بتا کر کہا کہ خلیفہ آپ ہیں یا عمر (الخلیفة انت ام عمر) حضرت ابوبکر نے کہا کہ اگر وہ چاہیں تو وہی خلیفہ ہیں۔ حضرت ابوبکر نے اس معاملہ میں حضرت عمر کی رائے سے اتفاق کیا۔ اور صحابہ میں سے کسی نے بھی اس پر نکیر نہیں کی (تاریخ دمشق لابن عساکر، جلد 9، صفحہ 196-195)۔

اس واقعہ میں نہ صرف خلیفہ اول پر تنقید تھی بلکہ بظاہر ان کی توہین بھی تھی۔ مگر یہ واقعہ جب حضرت ابوبکر اور دوسرے صحابہ کے علم میں آیا تو انھوں نے ان ظاہری پہلوؤں کو کوئی اہمیت نہ دی۔ انھوں نے صرف یہ سوچا کہ باعتبار حقیقت حضرت عمر کی رائے درست ہے یا غیر درست۔ اور جب محسوس ہوا کہ اصولاً وہ بالکل درست ہے تو سب نے اس کو قبول کر لیا۔

عمر فاروق کی مثال

حضرت عمر فاروقؓ جب خلیفہ تھے، وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ میں تمہاری ہی طرح ہوں اور تم لوگوں میں سے صرف ایک ہوں۔ اس لیے تم میرے خلاف جو بات بھی محسوس کروں اسے آزادانہ طور پر کہہ سکتے ہو۔ اس معاملہ میں تمہارے اوپر کوئی پابندی نہیں۔

ایک بار مدینہ کی مسجد کے منبر پر کھڑے ہو کر حضرت عمر لوگوں کے سامنے خطبہ دے رہے تھے، اس دوران انھوں نے کہا کہ میرے اندر اگر تم کوئی ٹیڑھ دیکھو تو اس وقت تم کیا کرو گے۔ ایک لمحہ خاموشی طاری رہی۔ اس کے بعد ایک شخص کھڑا ہوا۔ اس نے کہا کہ خدا کی قسم، اگر ہم نے آپ کے اندر کوئی ٹیڑھ دیکھا تو اس کو ہم اپنی تلواروں سے سیدھا کر دیں گے (لَوْ مِلْتَ عَدَلْنَاكَ)۔

اس کے بعد مسجد میں جو واقعہ پیش آیا وہ راوی کے الفاظ میں یہ تھا کہ حضرت عمر خوش ہو گئے۔ انھوں نے کہا کہ اس اللہ کا شکر ہے جس نے مسلمانوں میں ایسے افراد بنائے جو عمر کی ٹیڑھ کو اپنی تلوار سے سیدھا کر دیں گے: الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي جَعَلَنِي فِي قَوْمٍ إِذَا مِلْتُ عَدَلُونِي (الزہد والرقائق لابن المبارک، اثر نمبر 512)۔

اسلام کے دوسرے خلیفۂ راشد کی یہ مثال بتاتی ہے کہ تنقید و اختلاف کوئی مبغوض چیز نہیں، بلکہ وہ انتہائی محبوب چیز ہے۔ حتی کہ ایک عام آدمی اگر خلیفۂ وقت کے خلاف غیر مودبانہ انداز میں بولے تب بھی اس کو خوش آمدید کہا جائے گا۔

اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ تنقید کے وقت ناقد کو نہ دیکھو، بلکہ اپنے آپ کو دیکھو۔ ناقد اگر تمہاری کسی غلطی کی نشاندہی کر رہا ہے تو وہ عین تمہاری بھلائی کا کام کر رہا ہے۔ ایسے اچھے کام کو صرف اس لیے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اس نے اپنی بات کہنے کے لیے نامناسب اسلوب اختیار کیا تھا۔

خلیفۂ دوم کے اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ معاشرہ میں جو بڑے لوگ ہوں انھیں چاہیے کہ وہ آزادانہ اظہار خیال کی حوصلہ افزائی کریں۔ حتی کہ خود اپنے آپ کو کھلی تنقید کے لیے پیش کریں۔ اور یہ پیش کرنا حقیقی طور پر ہو نہ کہ مصنوعی طور پر۔

عثمان غنی کی مثال

حضرت ابوعبیدۃ بن الجراح نے ایک روز حضرت عثمان سے بحث کی۔ انھوں نے کہا کہ میں تین چیزوں میں آپ سے افضل ہوں۔ حضرت عثمان نے پوچھا کہ وہ کیا چیزیں ہیں۔ حضرت ابوعبیدہ بن الجراح نے جواب دیا۔

اول یہ کہ بیعت رضوان (حدیبیہ) کے وقت میں حاضر تھا، اور آپ اس وقت غائب تھے۔ دوسرے یہ کہ میں بدر کے غزوہ میں شریک ہوا اور آپ نے اس میں شرکت نہیں کی۔ تیسرے یہ کہ غزوۂ احد کے موقع پر میں ان لوگوں میں تھا جو ثابت قدم رہے اور آپ اس میں ثابت قدم نہ رہ سکے۔

راوی کہتے ہیں کہ حضرت عثمان اس پر غصہ نہیں ہوئے بلکہ یہ بولے کہ آپ نے سچ کہا (فلم يغضب عثمان ولكنه قال له صدقتَ)۔

پھر اپنا عذر بیان کرتے ہوئے حضرت عثمان نے کہا کہ جہاں تک بیعت رضوان کا معاملہ ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حاجت کے تحت مجھے مکہ بھیجا تھا۔ اور غزوۂ بدر میں جو ہوا وہ یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اپنی جگہ پر مدینہ میں مقرر فرمایا تھا۔ اور جہاں تک غزوۂ احد میں میری پس پائی کی بات ہے تو اللہ نے مجھے میری اس کوتاہی کے لیے معاف کر دیا (العبر یات الاسلامیہ، صفحہ 571)

اس واقعہ میں حضرت عثمان پر براہ راست حملہ کیا گیا تھا۔ مذکورہ تینوں باتیں بظاہر ان کی شخصیت کو سخت مجروح اور مشتبہ کر رہی تھیں۔ مگر حضرت عثمان اتنی سخت بات کو سن کر بھی غصہ نہیں ہوئے۔ انھوں نے ٹھنڈے طریقہ سے کہا کہ بطور واقعہ آپ کا کہنا بالکل درست ہے۔ پھر اس اعتراف کے بعد انھوں نے تینوں واقعہ کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر بیان کیا۔

تیسرے خلیفۂ راشد کے اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا طریقہ یہ ہے کہ انتہائی سخت تنقید کو بھی ٹھنڈے ذہن کے ساتھ سنا جائے۔ اپنے آپ کو اشتعال سے بچاتے ہوئے سادہ طور پر اصل معاملہ کی وضاحت کی جائے۔

علی مرتضیٰ کی مثال

شورش پسند مسلمانوں کی ایک بھیڑ 35ھ میں مدینہ میں داخل ہوئی اوراس نے خلیفہ سوم حضرت عثمان کوقتل کر دیا۔ اس کے بعد اتنا خلفشار برپا ہوا کہ مدینہ پانچ روز تک خلیفہ سے خالی رہا۔ پھر حضرت علی بن ابی طالب کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت ہوئی۔ تاہم مسلمانوں کا ایک بہت بڑا گروہ اس بیعت پر متفق نہ تھا۔ اس کا مطالبہ تھا کہ پہلے عثمان کا خون کرنے والوں کوسزا دی جائے، اس کے بعد وہ خلیفہ چہارم کی اطاعت کریں گے۔ اس کے مقابلہ میں حضرت علی یہ کہتے تھے کہ پہلے خلافت کے معاملہ کو مستحکم ہونے دو، اس کے بعد قاتلین کے خلاف ضروری کارروائی کی جائے گی۔

اس طرح مسلمانوں کے دو گروہ بن گئے۔ ایک حضرت علیؓ کے ساتھیوں کا، اور دوسرا آپ کے مخالفوں کا۔ دونوں میں سخت اختلاف تھا، یہ اختلاف بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ دونوں فریقوں کے درمیان جنگ کی نوبت آ گئی۔

حضرت علی اپنے ساتھیوں کو لے کر مدینہ سے بصرہ کے لیے روانہ ہوئے۔ لوگوں نے پوچھا کہ آپ کہاں جارہے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ میرا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کا اشتعال ختم ہو اور امت میں اتفاق پیدا ہو جائے۔ ایک شخص نے کہا کہ اگر بصرہ والے آپ کی بات نہ مانیں تو آپ کیا کریں گے۔ حضرت علی نے کہا کہ ہم ان کو چھوڑے رہیں گے جب تک وہ ہم کو چھوڑے رہیں (ترکناھم ماترکونا) کہنے والے نے کہا کہ اگر وہ لوگ آپ کو نہ چھوڑیں اور جنگ پر آمادہ ہو جائیں تو پھر آپ کیا کریں گے۔ حضرت علی نے کہا کہ ہم مدافعت میں لڑیں گے۔ ابوسلام الدالانی نے کہا کہ ہمارا حال اور ان کا حال کیا ہوگا اگر کل کے دن ان سے ہمارا ٹکراؤ ہو جائے۔ حضرت علیؓ نے جواب دیا کہ میں امید کرتا ہوں کہ ہمارا یا ان کا جو آدمی

بھی قتل ہوگا اور اس کا دل پاک ہوگا تو اللہ اس کو ضرور جنت میں داخل کرے گا: إِنِّي لَأَرْجُو أَنْ لَا يُقْتَلَ مِنَّا وَمِنْهُمْ أَحَدٌ نَقَّى قَلْبَهُ للّٰه إِلَّا أَدْخَلَهُ اللّٰهُ الْجَنَّةَ (البدایہ والنھایہ، جلد 7، صفحہ 238)۔

خلیفہ چہارم کے اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر اختلاف اتنا بڑھے کہ باہمی طور پر جنگ کی نوبت آجائے تب بھی مومن فریق ثانی کے بارے میں اچھا ہی گمان رکھتا ہے۔ رائے کا اختلاف کسی بھی حال میں دل کے اختلاف یا بگاڑ کا سبب نہیں بنتا۔

ایک واقعہ

صحیح البخاری (کتاب العلم) میں انس بن مالکؓ کی ایک روایت ہے۔ وہ مدینہ کا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں جس میں وہ خود موجود تھے۔ اس کا ابتدائی حصہ یہ ہے:

بَيْنَما نَحْنُ جُلُوسٌ مَعَ النَّبِيِّ صلى اللّٰه عليه وسلم فِي المَسْجِدِ، دَخَلَ رَجُلٌ عَلَى جَمَلٍ، فأَنَاخَهُ فِي المَسْجِدِ ثُمَّ عَقَلَهُ، ثُمَّ قالَ لَهُمْ:أَيُّكُمْ مُحَمَّدٌ؟ والنَّبِيُّ صلى اللّٰه عليه وسلم مُتَّكِئٌ بَيْنَ ظَهْرَانَيْهِمْ، فَقُلْنا:هذا الرَّجُلُ الأَبْيَضُ المُتَّكِئ. فقالَ لَهُ الرَّجُلُ:ابْنَ عَبْدِ المُطَّلِبِ! فقالَ لَهُ النَّبِيُّ صلى اللّٰه عليه وسلم:قَدْ أَجَبْتُكَ. فقالَ الرَّجُلُ لِلنَّبِيِّ صلى اللّٰه عليه وسلم:إِنِّي سائِلُكَ فَمُشَدِّدٌ عَلَيْكَ فِي المَسْأَلَةِ، فَلا تَجِدْ عَلَيَّ فِي نَفْسِكَ. فقالَ: سَلْ عَمَّا بَدالَكَ. فقالَ: أَسْأَلُكَ بِرَبِّكَ وَرَبِّ مَنْ قَبْلَكَ، آللّٰهُ أَرْسَلَكَ إِلَى النَّاسِ كُلِّهِمْ؟ فقالَ:اللَّهُمَّ نَعَمْ۔ الخ۔ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 63) یعنی، ہم لوگ مسجد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بیٹھے ہوئے

تھے کہ ایک شخص اونٹ پر سوار ہو کر داخل ہوا۔ اس نے اپنا اونٹ مسجد میں بٹھایا، پھر اس نے اسے باندھا۔ پھر اس نے لوگوں سے پوچھا کہ تم میں محمدؐ کون ہیں۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ تکیہ لگائے ہوئے ہمارے سامنے بیٹھے تھے۔ ہم نے کہا کہ یہ سفید آدمی جو تکیہ لگائے ہوئے ہے۔ آنے والے نے کہا، اے عبد المطلب کے بیٹے، آپ نے فرمایا کہ میں نے تمہاری بات سن لی۔ اس نے کہا کہ میں آپ سے سوال کروں گا اور سوال میں آپ سے سختی کروں گا۔ آپ اپنے دل میں میرے اوپر غصہ نہ ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ پوچھو جو تم پوچھنا چاہتے ہو۔ اس نے کہا کہ میں آپ کو آپ کے رب کی اور جو آپ سے پہلے تھے ان کے رب کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا اللہ نے آپ کو سارے انسانوں کی طرف بھیجا ہے۔ آپ نے فرمایا، خدایا ہاں۔ الخ

پیغمبر اسلام کا یہ واقعہ بتاتا ہے کہ اسلامی معاشرہ میں ہر ایک کو آزادی حاصل ہے کہ وہ بڑے سے بڑے آدمی سے بھی جو سوال چاہے کرے۔ حتی کہ وہ اپنے کلام میں سخت انداز اختیار کرنے کے لیے بھی آزاد ہے۔ مخاطب کو چاہیے کہ وہ سائل پر غصہ نہ ہو بلکہ ٹھنڈے طریقہ پر اس کے ہر سوال کا جواب دے۔

ظاہرداری نہیں

قرآن میں وراثت کا قانون بناتے ہوئے ایک آیت یہ آئی ہے کہ: مِنَ الَّذِينَ اسْتَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْأَوْلَيَانِ (5:107)۔ یعنی، ان میں سے جن کا کہ حق دبا ہے جو سب سے قریب ہوں میت کے۔ اس آیت کے لفظ الاولیان کی قرآت میں اختلاف ہے۔ حسن نے

اس کو الاوّلان پڑھا ہے، اور ابن سیرین نے اس کو الاوّلین پڑھا ہے (القرطبی 6/359)۔

ایک بار ایسا ہوا کہ حضرت ابی بن کعب نے یہ آیت پڑھی اور الاولیان کی قرأت اپنے لحاظ سے کی جو کہ خلیفہ دوم عمر فاروق کی قرأت سے مختلف تھی، حضرت عمر نے اس کو سن کر کہا کہ تم نے جھوٹ کہا (کذبتَ) حضرت کعب نے جواب میں کہا کہ تم خود زیادہ بڑے جھوٹے ہو (انتَ اکذب) ایک شخص نے اس کو سن کر حضرت کعب سے کہا کہ تم امیر المومنین کو جھوٹا کہہ رہے ہو۔ انھوں نے کہا کہ میں تم سے زیادہ امیر المومنین کے حق کی تعظیم کرتا ہوں۔ لیکن میں نے ان کو اللہ کی کتاب کی تصدیق کے معاملہ میں جھٹلایا ہے، میں نے اللہ کی کتاب کی تکذیب کے معاملہ میں امیر المومنین کی تصدیق نہیں کی۔ حضرت عمر فاروق نے کہا کہ انھوں نے ٹھیک کہا (تاریخ المدینہ لابن شبۃ، جلد 2، صفحہ 709)۔

یہ گفتگو دو بڑے صحابی کے درمیان ہوئی۔ معترض صحابی نے ایسا نہیں کیا کہ وہ مختلف قرأت سن کر یہ کہتے کہ: يَا فَضِيلَةَ الأُسْتَاذِ، اِسْمَحْ لِي، لَعَلَّكَ أَخْطَأْتَ فِي الْقِرَاءَةِ۔ بلکہ اپنی اندرونی کیفیت کے مطابق، بے تکلف ان کی زبان سے نکلا کہ: کذبتَ (تم نے جھوٹ کہا)۔

اس واقعہ سے ایک اہم اصول اخذ ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ اظہار رائے کی آزادی کسی شرط کے بغیر ہونی چاہیے۔ شرط عائد کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگوں کے دل میں کچھ ہو اور الفاظ کے ذریعہ اس کا اظہار وہ کچھ اور انداز میں کریں۔ یہ طرز کلام دھیرے دھیرے لوگوں کے اندر ظاہر داری پیدا کرے گا، اور ظاہر داری آخر کار ریا کاری کی صورت اختیار کر لے گی۔

ایک بات جس کو آدمی حق سمجھے، فطری طور پر وہ اس کو بے کم و کاست ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ اگر اس کے اوپر مصنوعی پابندی لگائی جائے تو وہ شدید تر نقصان کا باعث بن جائے گی۔ وہ لوگوں کے اندر دہرا شخصیت کی تشکیل کرے گی۔

سوال وجواب

حضرت علی بن ابی طالبؓ کی خلافت کے زمانہ میں مسلمانوں کا ایک طبقہ آپ کا باغی ہو گیا۔ اس نے زبردست خلفشار برپا کیا۔ دو لڑائیاں ہوئیں جن میں تقریباً چالیس ہزار مسلمان مارے گئے۔ حتی کہ خود حضرت علی کو شہید کر دیا گیا۔ اس خلفشار کے زمانہ میں آپ کے مخالف گروہ کا ایک آدمی آپ سے ملا۔ اس نے آپ سے کچھ ناقدانہ سوالات کیے۔ اس نے کہا کہ ایسا کیوں ہے کہ آپ کی خلافت کے زمانہ میں مسلمانوں کے درمیان اتنا اختلاف وانتشار پیدا ہو گیا۔ حالاں کہ ابوبکر وعمر خلیفہ تھے تو ان کے زمانہ میں اس طرح کے اختلافات برپا نہیں ہوئے۔ حضرت علی نے جواب دیا: لِأَنَّ أَبَا بَكْرٍ وَعُمَرُ كَانَا وَالِيَيْنِ عَلَى مِثْلِي وَأَنَا الْيَوْمَ وَالٍ عَلَى مِثْلِكَ (مقدمہ ابن خلدون، صفحہ 211)۔ اس لیے کہ ابوبکر وعمر میرے جیسے لوگوں کے اوپر حاکم تھے اور میں آج تمہارے جیسے آدمی کے اوپر حاکم ہوں۔

اس اعتراض وجواب سے ایک اہم حقیقت واضح ہو کر سامنے آ گئی۔ وہ یہ کہ صحیح اسلامی حکومت کے قائم ہونے کی سب سے اہم شرط کیا ہے۔ وہ شرط یہ ہے کہ سماج کے اندر واضح طور پر اس کے موافق حالات موجود ہوں۔ حضرت علی کے جواب کے الفاظ میں یہ کہنا درست ہوگا کہ صالح سیاسی نظام کے قیام کی شرط یہ ہے کہ ایک طرف صدر ریاست کی کرسی پر ابوبکر و عمر جیسا ایک فرد بیٹھا ہوا ہو، اور دوسری طرف معاشرہ پر اصحاب رسول جیسے لوگوں کا غلبہ ہو۔ خلافت مثل عمر کے ہاتھ میں ہو اور معاشرہ امثال علی پر مشتمل ہو۔

اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام کے دور اول میں کس طرح یہ ماحول تھا کہ ایک عام آدمی وقت کے خلیفہ سے براہ راست ناقدانہ سوال کر سکتا تھا اور خلیفہ معتدل انداز میں اس کا جواب دیتا تھا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب معاشرہ میں سوال وجواب کا

کھلا ماحول ہوتو کس طرح الجھے ہوئے ذہنوں کی صفائی ہوتی ہے۔ کس طرح بڑے بڑے اشکالات کا حل خود متعلق شخصیتوں کے ذریعہ منقح ہو کر سامنے آجاتا ہے۔

حد بندی

طارق بن شہاب بیان کرتے ہیں کہ خالد بن الولید اور سعد بن ابی وقاص کے درمیان ایک معاملہ میں اختلاف تھا، ان لوگوں کے درمیان اس پر بحث ہوتی تھی۔ مگر بہت دن تک دونوں کا اختلاف ختم نہیں ہوا۔

اس درمیان میں ایک شخص سعد بن ابی وقاص کے پاس آیا، اس نے حضرت سعد سے خالد بن الولید کی کچھ برائی بیان کی (مثلاً یہ کہ انھوں نے بہت دیر بعد اسلام قبول کیا اور غزوہ احد میں وہ مشرکین کی فوج کے سردار تھے)۔ حضرت سعد نے مذکورہ شخص کی باتوں کو سن کر کہا کہ رک جا، ہمارے اور خالد کے درمیان جو اختلاف ہے وہ ہمارے دین پر اثر انداز نہیں ہوگا: فَإِنَّ مَا بَيْنَنَا لَمْ يَبْلُغْ دِينَنَا (مصنف ابن ابی شیبۃ، حدیث نمبر 27187)۔

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دو بڑے سے بڑے عالم یا بزرگ کے درمیان گہرا اختلاف ہوسکتا ہے۔ مگر عین اختلاف کے وقت بھی وہ سختی کے ساتھ اپنی حد پر رہے گا۔ وہ کسی حال میں بھی حد سے باہر نہیں جائے گا۔

یہ حد بندی دو اعتبار سے ہوگی۔ ایک تو یہ کہ دونوں جب اس معاملہ میں بحث و گفتگو کریں گے تو ان کا کلام شدت کے ساتھ صرف اختلافی نکتہ تک مرتکز رہے گا، وہ اصل اختلافی نکتہ سے اِدھر اُدھر منحرف نہیں ہوگا۔

دوسرے یہ کہ دونوں فریق کامل طور پر اس کا لحاظ رکھیں گے کہ ان کا اختلاف دماغی

بحث کی سطح پر رہے، وہ اس سے آگے بڑھ کر دلوں کی کدورت نہ بننے پائے۔

"وہ ہمارے دین پر اثرانداز نہیں ہوگا" کا مطلب یہ ہے کہ ایسا نہیں ہوسکتا کہ اس اختلاف کی وجہ سے ہم ایک دوسرے کی نیت پر شبہ کرنے لگیں۔ ہم ایک دوسرے پر اخلاقی نوعیت کا الزام لگانے لگیں۔ ہم ایک دوسرے کی شخصیت پر چوٹ کرنا شروع کر دیں۔ ہم دونوں کی بحث تمام تر دلائل پر چلے گی، نہ کہ الزام تراشی اور عیب جوئی پر۔

اختلاف کے باوجود

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تیسرے خلیفہ راشد تھے۔ آخر عمر میں بعض جھوٹی خبروں کی بنا پر مصر کے ایک ہزار سے زیادہ آدمی مدینہ آئے۔ انھوں نے مدینہ پہونچ کر کافی شور وغل کیا اور آخر کار حضرت عثمان کے مکان کو گھیر لیا۔ اگرچہ حضرت عثمان کے خلاف ان کا الزام سراسر بے بنیاد تھا، مگر یہ مسلمان آپ سے اتنا برہم ہوئے کہ آپ کا گھر سے نکلنا اور گھر میں پانی جانا بند کر دیا۔ یہاں تک کہ 18 ذی الحجہ 35ھ کو حملہ کر کے آپ کو شہید کر دیا۔ بوقت وفات آپ کی عمر 82 سال تھی۔

حضرت عثمان کا محاصرہ تقریباً 40 دن تک جاری رہا تھا۔ بلوائیوں نے جب حضرت عثمان کو گھیر لیا اور مکان سے نکلنے پر پابندی لگا دی تو آپ کے لیے مسجد جانا ممکن نہ رہا۔ خلیفہ کی حیثیت سے نمازوں کی امامت آپ ہی فرماتے تھے۔ جب آپ کا مسجد جانا بند ہو گیا تو بلوائیوں کا سردار غافقی بن حرب عکی امام بن گیا۔ اس نے مدینہ کی مسجد میں نمازوں کی امامت شروع کر دی۔

یہ مدینہ کے مسلمانوں کے لیے بڑی سخت آزمائش کی بات تھی۔ ایک طرف وہ اپنے

لیے ضروری سمجھتے تھے کہ مسجد میں جا کر جماعت کے ساتھ نماز ادا کریں، دوسری طرف وہ دیکھ رہے تھے کہ ایک شخص جو کھلا ہوا مفسد اور غلط کار ہے، وہی مسجد کا امام بنا ہوا ہے۔ اس نازک حالت میں ایک شخص حضرت عثمان سے ملا اور ان سے پوچھا کہ ایسی حالت میں ہم کیا کریں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انھیں یہ ہدایت فرمائی کہ تم لوگ اس کے پیچھے نماز ادا کرو۔ آپ نے فرمایا: فَإِذَا أَحْسَنَ النَّاسُ فَأَحْسِنْ مَعَهُمْ، وَإِذَا أَسَاءُوا فَاجْتَنِبْ إِسَاءَتَهُمْ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 695)۔ یعنی، جب وہ لوگ کوئی نیک کام کریں تو اس میں ان کا ساتھ دو اور جب وہ لوگ کوئی بُرا کام کریں تو ان کی برائی سے دور رہو۔

خلیفہ راشد کے اس واقعہ میں عظیم الشان نمونہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی شخص سے ہمیں خواہ کتنی ہی زیادہ شکایت ہو، اس کے بارے میں اظہار رائے کرتے ہوئے ہمیں ہمیشہ انصاف پر قائم رہنا چاہیے۔ ہمیں اپنے اختلاف کو حد کے اندر رکھنا چاہیے، نہ یہ کہ اختلاف پیدا ہونے کے بعد ہم حد کے باہر نکل جائیں۔

صحت مند نتائج

سعید بن ابی عروبہ تابعی (وفات 157ھ) نے عالِم کی تعریف کرتے ہوئے کہا جو آدمی اختلاف کو نہ سنے اس کو عالم نہ شمار کرو: مَنْ لَمْ يَسْمَعِ الِاخْتِلَافَ فَلَا تَعُدُّوهُ عَالِمًا (جامع بیان العلم وفضلہ، لابن عبد البر، اثر نمبر 1521)۔

اختلاف سے مراد جھوٹی تنقید یا الزام تراشی والی باتیں نہیں ہیں۔ اختلاف سے مراد علمی اختلاف ہے۔ اور سنجیدہ علمی اختلاف اتنی قیمتی چیز ہے کہ جو حقیقی عالم ہوگا وہ اس کا حریص ہوگا نہ کہ وہ اس کو برا مانے اور اس کو بند کرنے کی کوشش کرے۔

علم اتنا زیادہ وسیع خزانہ ہے کہ وہ کسی ایک دماغ میں سما نہیں سکتا۔ اس لیے ہر سچا عالم حرص کی حد تک اس کا طالب رہتا ہے کہ کوئی ملے جو اس کی رائے سے اختلاف کرے۔ تاکہ علم کے نئے گوشے کھلیں، تاکہ دوسروں کے علم سے وہ اپنے علم میں اضافہ کرے۔

تاہم اختلاف اور مذاکرہ کا یہی فائدہ نہیں ہے کہ اس کے ذریعہ سے وہ مزید معلومات سامنے آتی ہیں جو دوسروں کے پاس ہیں۔ بلکہ یہ بھی ہوتا ہے کہ خود عالم کا اپنا ذہن زیادہ منقح ہوتا ہے۔ اختلاف و مذاکرہ کے دوران وہ خود اپنے خیالات کو زیادہ واضح اور جامع صورت میں مرتب کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ایک سچی علمی گفتگو، خواہ وہ کتنا ہی زیادہ اختلافی ہو، ایک صاحب علم اور حقیقت پسند شخص کے لیے لذیذ ترین تجربہ ہے۔ ایسا لمحہ گویا علم کے سمندر میں مشترکہ غوطہ زنی کے ہم معنی ہے۔ جو بے حد پر کیف بھی ہے اور بے حد مفید بھی۔

موجودہ زمانہ میں چونکہ جھوٹے ناقدین بہت بڑھ گئے ہیں اس لیے بہت سے لوگ سچی تنقید کو بھی برا سمجھنے لگے ہیں۔ حالاں کہ دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ جھوٹی تنقید اگر بدبو ہے تو سچی تنقید خوشبو، جھوٹی تنقید اگر کانٹا ہے تو سچی تنقید ایک حسین پھول۔

جھوٹی تنقید ایک قسم کی تخریب کاری ہے۔ اس کے مقابلہ میں سچی تنقید ایک تعمیری عمل ہے۔ وہ اس قابل ہے کہ اس کو ہر حال میں جاری رکھا جائے۔

حریتِ فکر

مدینہ میں غلام طبقہ سے تعلق رکھنے والے ایک مرد اور ایک عورت رہتے تھے۔ مرد کا نام مغیث اور عورت کا نام بریرہ تھا، انھوں نے اسلام قبول کرلیا۔ ایک عرصہ کے بعد خاتون

آزاد ہوگئیں۔ آزادی کے بعد ازروئے قاعدہ انھیں اختیار مل گیا کہ خواہ وہ سابق شوہر کے ساتھ رہیں یا اس سے علیحدگی اختیار کرلیں۔ بریرہ نے علیحدگی کا فیصلہ کیا۔ مگر مغیث کو اس خاتون سے بہت زیادہ لگاؤ تھا۔ اس لیے وہ چاہتے تھے کہ بریرہ اپنے فیصلہ کو بدل دیں اور ان کے ساتھ رہنے پر راضی ہوجائیں۔

یہ ایک لمبا قصہ ہے۔ حدیث کی کتابوں میں اس کی کافی تفصیلات آئی ہیں۔ حتی کہ بریرہ اور مغیث پر مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں۔ خلاصہ یہ کہ آخر کار ان کا معاملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش ہوا۔ اس وقت حالت یہ تھی کہ بریرہ آگے آگے تھیں اور مغیث، جو سیاہ فام تھے، ان کے پیچھے اس طرح چل رہے تھے کہ آنسوؤں سے ان کی داڑھی کے بال تر ہو گئے تھے۔ اس کے بعد ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں: فَقَالَ النَّبِيُّ صلى الله عليه وسلم:لَوْ رَاجَعْتِهِ. قَالَتْ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ، تَأْمُرُنِي؟ قَالَ:إِنَّمَا أَنَا أَشْفَعُ، قَالَتْ: لَا حَاجَةَ لِي فِيهِ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 5283)۔ یعنی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ اچھا ہے کہ تم اس کی طرف رجوع کرلو۔ بریرہ نے کہا کہ اے خدا کے رسول، کیا آپ مجھے اس کا حکم دیتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ میں صرف سفارش کر رہا ہوں۔ بریرہ نے جواب دیا کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں۔

یہ اس بات کی ایک انتہائی اعلیٰ اور آخری مثال ہے کہ اسلام میں عورت اور مرد کو کتنی زیادہ آزادی حاصل ہے۔ یہ آزادی کوئی سرکشی نہیں ہے۔ یہ انسانی فطرت کی رعایت ہے۔ انسان کی شخصیت کا ارتقا صرف آزادی کے ماحول میں ہوسکتا ہے۔ جس طرح ایک درخت کھلی فضا ہی میں پروان چڑھتا ہے، ٹھیک اسی طرح ایک انسان کا ذہنی اور روحانی وجود صرف اسی وقت بھر پور طور پر نشو ونما پاتا ہے جب کہ اس کو کامل فکری آزادی ملی ہوئی ہو۔

حق کا اعتراف

خلیفہ ثانی عمر فاروقؓ کے زمانہ میں 16ھ میں عراق فتح ہوا۔ اس کے بعد یہ سوال تھا کہ دجلہ و فرات کے علاقہ کی زرخیز زمینیں جو مسلمانوں کے قبضہ میں آئی ہیں، ان کا انتظام کس طرح کیا جائے۔ سابق رواج کے مطابق، فوجی سرداروں کی رائے یہ تھی کہ اس مفتوحہ زمین کا بڑا حصہ فوجیوں کے درمیان تقسیم کردیا جائے۔ حضرت عمر کی رائے اس کے خلاف تھی۔ ان کی رائے یہ تھی کہ زمین کو سرکاری بیت المال کے زیر تصرف رہنا چاہئے تاکہ آئندہ نسلوں تک اس کا فائدہ تمام لوگوں کو مل سکے۔

اس مسئلہ پر سخت اختلاف ہوا اور کئی دن تک بحث جاری رہی۔ خاص طور پر خالد بن الولید، عبدالرحمن بن عوف اور بلال بن رباح نے اتنی زیادہ حجت کی کہ حضرت عمر فاروق کی زبان سے یہ الفاظ نکل آئے کہ: اللهُمَّ اكْفِنِي بِلَالًا (السنن الکبری للبیہقی، حدیث نمبر 18392)۔ یعنی، اے اللہ، تو مجھ کو بلال سے نجات دے۔ اس کے بعد اس مسئلہ کو طے کرنے کے ایک مشاورتی بورڈ بنایا گیا جس میں حضرت عثمان، حضرت علی اور حضرت طلحہ جیسے لوگ تھے۔ اس کے باوجود اتفاق رائے سے کوئی فیصلہ نہیں کیا جاسکا۔

کئی دن کی بحث کے بعد آخر کار حضرت عمر کو قرآن کی یہ آیت یاد آئی کہ (غنیمت میں) ان مفلس مہاجروں کے لیے حصہ ہے جو اپنے گھروں اور اپنے مالوں سے نکالے گئے ہیں۔ وہ اللہ کا فضل اور رضامندی چاہتے ہیں۔ اور وہ اللہ اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں، یہی لوگ سچے ہیں۔ اور جو لوگ پہلے سے دارالاسلام میں قرار پکڑے ہوئے ہیں اور ایمان استوار کیے ہوئے ہیں، جو ان کے پاس ہجرت کرکے آتا ہے اس سے وہ محبت کرتے ہیں، اور وہ اپنے دلوں میں اس سے تنگی نہیں پاتے جو مہاجرین کو دیا جاتا ہے۔ اور وہ ان کو اپنے اوپر

مقدم رکھتے ہیں، اگرچہ ان کے اوپر فاقہ ہو۔ اور جو شخص اپنے جی کے لالچ سے بچا لیا گیا تو وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ اور جو اُن کے بعد آئے: وَالَّذِينَ جاؤُ مِنْ بَعْدِهِمْ (59:8-10)۔

حضرت عمر فاروق نے لوگوں کو قرآن کی یہ آیت سنائی اور کہا کہ اس آیت میں غنیمت اور فئی کا حکم بیان کرتے ہوئے والذین جاؤ امن بعد هم (اور جو ان کے بعد آئے) لفظ ہے۔ اس سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ فتوحات کے ذریعہ جو اموال ملیں وہ صرف حال کے لوگوں کے لیے نہیں ہیں بلکہ اس میں آنے والی نسلوں کا بھی حق ہے۔ اگر مفتوحہ زمینوں کو میں موجودہ فاتحین کے درمیان بانٹ دوں تو ہماری آئندہ نسلوں کو اس میں حصہ نہیں مل سکے گا۔ اور یہ قرآن کے منشاء کے خلاف ہو گا۔ حضرت عمر کے اس استدلال کو تمام لوگوں نے مان لیا اور ایک زبان ہو کر کہا کہ آپ ہی کی رائے درست ہے۔ (دیکھیے، الخراج لابی یوسف، صفحہ 37)۔

اس کے بعد یہ اصول قائم ہو گیا کہ فتوحات کے ذریعہ جو زمینیں اسلامی مملکت میں داخل ہوں وہ حکومت اسلامی کی ملکیت قرار پائیں نہ یہ کہ فوج کے افراد میں تقسیم ہو کر ان کی انفرادی ملکیت میں چلی جائیں۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سورہ حشر کی مذکورہ آیت نے لوگوں کے ہونٹ سی دئے اور اب ان کے لیے کچھ بولنے کا موقع باقی نہ رہا۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ ان لوگوں میں قبولیت حق کا مادہ تھا۔ ان کی بحث نہ سمجھنے کی وجہ سے تھی نہ کہ محض سرکشی کی بنا پر۔ اس لیے جب قرآن کی آیت نے حقیقت کھول دی تو اس کے بعد ان کے لیے سمجھنا کچھ دشوار نہ رہا۔

اس دنیا میں بولنے کی گنجائش اتنی زیادہ ہے کہ آدمی ہر دلیل کے جواب میں اس کے خلاف بولنے کے لیے کچھ نہ کچھ الفاظ پا لیتا ہے۔ اب جو لوگ غیر سنجیدہ ہیں وہ اسی طرح ہر

دلیل کے جواب میں الفاظ کا ایک مجموعہ پیش کرکے اسے رد کر دیتے ہیں۔ مگر جو لوگ سنجیدہ ہوں اور اپنے آپ کو اللہ کے سامنے جواب دہ سمجھتے ہوں۔ وہ نہ سمجھنے کی وجہ سے بعض اوقات کسی بات کے مخالف بن جاتے ہیں۔ مگر جب اس بات کو زیادہ واضح دلائل سے ثابت کر دیا جائے تو وہ فوراً مان لیتے ہیں۔ اس کے بعد انھیں اصل بات کو ماننے میں کوئی الجھن پیش نہیں آتی۔

مذکورہ واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اظہار خیال کی آزادی کے آداب وقواعد کیا ہیں۔ وہ یہ ہیں کہ ایک عام آدمی کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ خلیفۂ وقت سے اختلاف کرے۔ مگر اسی کے ساتھ آدمی کو ایسا ہونا چاہیے کہ جب دلیل سامنے آئے تو وہ اس کو پہچان سکے اور اس کے بعد اپنے اختلافات کو ختم کر دے۔

حق کی برتری

ایک عالم کا واقعہ ہے۔ انھوں نے ایک مسئلہ میں اپنے شیخ طریقت پر تنقید کی اور ان سے مختلف رائے دی۔ کسی شخص نے کہا کہ آپ اپنے شیخ سے اختلاف کر رہے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ شیخ ہم کو محبوب ہیں۔ مگر حق ہمیں شیخ سے بھی زیادہ محبوب ہے (الشيخُ حَبِيبٌ إِلَيْنَا وَلَكِنَّ الْحَقَّ أَحَبُّ إِلَيْنَا مِنَ الشَّيْخِ)۔

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ اختلاف اور تنقید کے معاملہ میں صحیح نقطۂ نظر کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہر آدمی کا حسب مراتب احترام کیا جائے گا۔ ہر ایک کے انسانی اور اخلاقی حقوق پوری طرح ادا کیے جائیں گے۔ مگر جب حق کا معاملہ سامنے آجائے تو حق کو سب سے زیادہ برتری حاصل ہوگی۔ انسان اور انسان کا مقابلہ ہو تو انسان اہم ہے۔ اور انسان اور حق کا مقابلہ ہو تو حق اہم ہے۔ حق کی اہمیت مطلق ہے اور انسان کی اہمیت مقید۔

انسان کے ساتھ سلوک کا معاملہ اخلاق کے تابع ہوتا ہے۔مگر جب حق سامنے آجائے تو خود اخلاق بھی حق کے تابع ہو جائے گا۔ کیوں کہ اس دنیا میں حق سے بڑی کوئی چیز نہیں۔حق کی یہ اہمیت اس لیے ہے کہ حق اس دنیا میں خدا کا نمائندہ ہے۔حق کا سامنے آنا گویا خدا کا سامنے آنا ہے۔ پھر جب خدا خود سامنے آجائے تو دوسری کون سی چیز ہوگی جو اس کے مقابلہ میں زیادہ اہمیت رکھتی ہو۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی حق کا نام لے کر کھڑا ہو اس کو دوسروں کے اوپر لامحدود اختیار حاصل ہو جائے گا۔اس معاملہ میں جو فضیلت ہے وہ نفس حق کے لیے ہے نہ کہ حق کا نام لینے والے کسی انسان کے لیے۔حقیقت یہ ہے کہ حق کا نام لے کر اٹھنے والے کسی فرد کو بھی اسی معیار سے جانچا جائے گا جس سے وہ دوسروں کو جانچنا چاہتا ہے۔دونوں میں سے جو بھی حق کے معیار پر پورا نہ اترے وہ قابل ملامت ہے، اور اس کی بہترین سعادت یہ ہے کہ وہ اپنے خلاف حق کے فیصلہ کو دل سے قبول کر لے۔حق کا ظہور خدا کا ظہور ہے۔مبارک ہے وہ جس کے سامنے حق ظاہر ہو اور وہ اس کو پہچان کر فوراً اس کے آگے جھک جائے۔

اضافۂ ایمان

ایمان کوئی جامد چیز نہیں اور نہ کسی مجموعۂ الفاظ کو زبان سے دُہرا لینے کا نام ایمان ہے۔ لفظی مجموعہ ایمان کی ظاہری علامت ہے نہ کہ خود لفظی مجموعہ ہی اصل ایمان ہے۔تمام اعلیٰ حقیقتوں کی اہمیت ان کے معنوی پہلو کے اعتبار سے ہوتی ہے، پھر ایمان جیسی اعلیٰ ترین حقیقت کی اہمیت اس کے الفاظ تک کیوں کر محدود ہو جائے گی۔

ایمان حقیقتِ اعلیٰ کی دریافت ہے۔ایمان علوم کے سرے کو پکڑنا ہے۔ایمان معانی

کے سمندر میں داخل ہونا ہے۔ ایمان اپنی محدودیت کو لامحدود کے درجہ تک لے جاتا ہے۔ ایمان زمینی پستیوں سے اٹھ کر آسمانی بلندیوں تک پہنچ جانا ہے۔ ایمان یہ ہے کہ آدمی ایک ایسے روحانی سفر کا مسافر بن جائے جہاں ہر آن نیا تجربہ ہے۔ وہ ایک ایسا شعوری ارتقا ہے جس کا سلسلہ کبھی اور کہیں ختم نہیں ہوتا۔ چنانچہ قرآن میں ایمان کو ایک ارتقا پذیر حقیقت بتایا گیا ہے، ایک ایسا قلبی سرمایہ جس میں ہمیشہ اضافہ ہوتا رہے (الفتح 48:4) ایمان ایک اعلیٰ ترین علم ہے جو ہمیشہ اللہ کی توفیق سے بڑھتا رہتا ہے۔

ایمان میں یہ زیادتی کس طرح ہوتی ہے۔ اس کا پہلا ذریعہ تفکر وتدبر ہے۔ انسان خدا کی باتوں کو پڑھتا ہے۔ وہ خدا کی چیزوں میں غور کرتا ہے (آل عمران، 3:191) اس طرح حق وصداقت کی نئی نئی تجلیاں اِس پر منکشف ہوتی ہیں۔ پھر وہ اہل ذوق کے ساتھ ان پر مذاکرہ کرتا ہے، جیسا کہ عمر فاروق نے کہا: تعال نؤمن ساعۃ، ھلم فلنذکر ربنا۔ اس طرح فکری تبادلہ کے ذریعہ ہر ایک اپنے علم کو بڑھاتا ہے۔ ہر ایک اپنی معرفت میں اضافہ کرتا ہے۔

فکری ارتقا کے اس عمل کو جاری رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ مسلم معاشرہ میں آزادانہ تبادلۂ خیال کا ماحول ہو۔ لوگ کھلے طور پر اپنی بات کو کہیں اور دوسرے کے تبصرہ کو سنیں۔ کہنے والے کو آزادانہ طور پر اپنے دل کی بات کہنے کا موقع ہو اور سننے والوں میں یہ حوصلہ ہو کہ وہ کھلے ذہن کے ساتھ اس کو سنیں۔ اس طرح تبادلۂ افکار کے ذریعہ شعور ایمان کا ارتقائی سفر مسلسل جاری رہے۔ اضافۂ ایمان خلا میں نہیں ہوتا بلکہ افکار کے طوفانوں کے درمیان ہوتا ہے۔ قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ تم یہ دعا کرتے رہو کہ اے میرے رب، میرا علم زیادہ کر دے: وَقُلْ رَبِّ زِدْنِي عِلْماً (20:114)۔

اس کی تفسیر یہ کی گئی ہے کہ ربّ زِدنی علماً کا مطلب ہے: رَبِّ زِدْنِي فَهْمًا (القرطبی، جلد 11، صفحہ 250) یعنی، میرے فہم دین میں اضافہ کردے۔

اس سے معلوم ہوا کہ فہم دین یا علم دین ایک ایسی چیز ہے جس میں برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ معلومات کے اعتبار سے بھی اور بصیرت و معرفت کے اعتبار سے بھی۔

یہ اضافہ بلا شبہ اللہ کی توفیق سے ہوتا ہے۔ مگر اس عالم امتحان کے لیے اللہ کا قانون یہ ہے کہ یہاں ہر ملنے والی چیز حالات واسباب کے درمیان ملتی ہے۔ اسی طرح دین کا علم وفہم بھی آدمی کو حالات واسباب کے درمیان حاصل ہوتا ہے۔

انھیں حالات واسباب میں سے ایک چیز یہ ہے کہ آدمی ہمیشہ اپنے ذہن کی کھڑکیوں کو کھلا رکھے۔ وہ اضافۂ علم کے لیے مسلسل حریص بنا رہے۔ مطالعہ، مشاہدہ اور مذاکرہ جیسی چیزوں میں برابر مشغول رہے۔ دوسروں سے دیکھنے کے لیے وہ ہر وقت تیار رہتا ہو۔ جب بھی کسی صاحبِ علم یا صاحبِ ذوق سے اس کا ٹکراؤ ہو تو اَنا کے خول سے باہر نکل کر وہ اِس کی باتوں کو سنے اور ذاتی وقار کے احساس سے بلند ہو کر اس سے استفادہ کرے۔

علم میں اضافہ کا براہ راست تعلق طلب میں اضافہ سے ہے۔ بڑھی ہوئی طلب والا ایک آدمی ہی اپنے علم وفہم میں اضافہ کرتا ہے۔ اور طلب کی پہچان یہ ہے کہ آدمی کی کیفیت یہ ہو جائے کہ علم جہاں بھی ملے وہ اس کو لے لے، خواہ وہ اس کے موافق ہو یا اس کے خلاف۔

ہر علم تبادلہ کے ذریعہ بڑھتا ہے، اسی طرح ربانی علم بھی اس دنیا میں تبادلہ کے ذریعہ مسلسل بڑھتا رہتا ہے مذاکرہ، تبادلۂ افکار، ایک دوسرے کے بارے میں اظہار خیال، ایک دوسرے کو اپنی روحانی دریافتیں بتانا اور ان پر اہل ذوق کا تبصرہ سننا، یہ سب وہ ذریعے ہیں جو فہم دین میں اضافہ کرتے ہیں، اور وہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ ماحول میں آزادانہ طور پر افکار و تجربات کا لین دین جاری رہے۔

علم میں اضافہ کی دعا اپنی حقیقت کے اعتبار سے خود اپنی داخلی تڑپ کا ایک دعائیہ اظہار ہے، نہ کہ متعین قسم کے خارجی الفاظ کی کوئی لسانی تکرار۔

بے جا غلو

قرآن میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ — امید ہے کہ تمہارا رب تم کو مقام محمود پر کھڑا کرے: عَسیٰ أَنْ يَبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَاماً مَّحْمُوداً (17:79)۔

بغداد میں 317 ھ میں اس آیت پر دو مسلم گروہوں کے درمیان بحث ہوئی۔ ایک طرف ابوبکر المروزی الحنبلی کے اصحاب تھے، اور دوسری طرف عوام کا ایک طبقہ۔ حنابلہ نے اس آیت کی تفسیر میں کہا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ قیامت کے دن آپ کو عرش کے اوپر بٹھائے گا۔ دوسرے گروہ کا کہنا تھا کہ اس سے مراد شفاعت عظمیٰ ہے۔ یہ اختلاف اتنا بڑھا کہ دونوں گروہوں میں باقاعدہ جنگ ہوگئی جس میں بہت سے لوگ ہلاک ہوگئے (البدایہ والنہایہ لابن کثیر، جلد 11، صفحہ 162)۔

اس قسم کے واقعات پہلے بھی بار بار پیش آئے اور آج بھی ایسے واقعات کثرت سے پیش آرہے ہیں۔ ان کو دیکھ کر کچھ لوگ یہ کہنے لگے ہیں کہ بحث و اختلاف بذاتِ خود غلط ہے۔ اس لیے لوگوں کو چاہیے کہ وہ صرف مقلد بن کر رہیں۔ کسی بھی قسم کی اختلافی بحث میں نہ پڑیں۔ یہ مشورہ ایک غلطی پر دوسری غلطی کا اضافہ ہے۔ مشورہ دینے والوں کو چاہیے کہ وہ لوگوں کو اختلاف کا صحیح طریقہ بتائیں، نہ یہ کہ خود اختلاف کو بند کرنے کا مطالبہ کریں۔

مذکورہ افسوس ناک واقعہ اس لیے ہوا کہ انھوں نے علمی اختلاف اور جنگی ٹکراؤ کے فرق کو نہیں سمجھا۔ علمی اختلاف کا اول و آخر ہتھیار دلیل ہے، اور جنگی ٹکراؤ کا ہتھیار تلوار اور بندوق ہے۔ اگر جنگی ٹکراؤ پیش آجائے تو متشددانہ اسلحہ کا استعمال ایک ناگزیر ضرورت ہوگا۔ کیوں کہ جنگی ٹکراؤ میں فیصلہ کن چیز ہمیشہ ہتھیار ہی رہا ہے۔

مگر علمی اختلاف کا معاملہ سراسر مختلف ہے۔ اس میں ہتھیاروں کا استعمال صرف ایک قسم کا پاگل پن ہے۔ کیوں کہ علمی اختلاف میں اصل اہمیت کی چیز دلیل ہوتی ہے نہ کہ تشدد۔ فریق ثانی اگر ایک دلیل کو نہیں مانتا تو اس کے سامنے دوسری دلیل پیش کیجئے۔ دوسری دلیل سے بھی مطمئن نہیں ہوتا تو تیسری اور چوتھی دلیل پیش کیجئے۔ علمی بحث میں ہمیشہ صرف دلیل پیش کی جائے، خواہ کوئی اسے مانے یا ماننے سے انکار کر دے۔

مذکورہ واقعہ سے جو چیز غلط یا قابل ترک قرار پاتی ہے وہ تنقید اور اختلاف نہیں ہے۔ بلکہ غلو اور شدت پسندی ہے، اور غلو ہر معاملہ میں برا ہے۔

تنقید کو بند کرو، اختلاف رائے کو ختم کرو، تاکہ امت میں اتحاد ہو سکے — یہ جملہ قواعد کے اعتبار سے درست ہے، مگر وہ حقیقت کے اعتبار سے بالکل بے معنی ہے۔ کیوں کہ تنقید و اختلاف انسانی زندگی کا لازمی حصہ ہے، اس لیے وہ کبھی ختم نہیں ہوسکتا۔ زیادہ صحیح اور قابل عمل بات یہ ہے کہ تنقید کو گوارا کرو، اختلاف رائے کو برداشت کرو تاکہ امت میں اتحاد ہو سکے۔ کسی قوم میں اتحاد ہمیشہ اسی دوسرے اصول کی بنیادی پر ہوتا ہے، اور امت مسلمہ میں بھی اتحاد اسی بنیاد پر ہوگا۔ اس کے سوا اتحاد کی دوسری کوئی صورت نہیں۔

صحابہ و تابعین کے درمیان اختلافات تھے۔ اسی طرح محدثین، فقہاء، علماء، صوفیاء سب کے درمیان کثرت سے اختلافات تھے۔ حتیٰ کہ قرآن سے ثابت ہے کہ دنیا میں بیک وقت دو پیغمبر ہوں تو ان کے درمیان بھی کبھی اختلاف ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں اختلاف کو ختم کر کے اتحاد قائم کرنے کی شرط نہ صرف غیر فطری ہے بلکہ وہ غیر شرعی بھی ہے۔

تنقید و اختلاف کوئی برائی نہیں۔ وہ فکری ارتقا کا ذریعہ بنتی ہے۔ مثال کے طور پر غزوۂ بدر کے موقع پر ایک صحابی نے پیغمبر سے اختلاف کیا۔ اس کے نتیجہ میں زیادہ بہتر میدان جنگ کا انتخاب ممکن ہو گیا۔ وغیرہ۔

اصل یہ ہے کہ انسان دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک طالب خویش اور دوسرا طالب حق۔ طالب خویش اپنی ذات میں جیتا ہے۔ اس کی ساری دل چسپی اس میں ہوتی ہے کہ اس کی اپنی شخصیت نمایاں ہو۔ اس کی بڑائی تسلیم کی جائے۔ یہی وہ آدمی ہے جو تنقید و اختلاف سے بھڑکتا ہے۔ کیوں کہ وہ محسوس کرتا ہے کہ تنقید اس کی شخصی عظمت کو گھٹا رہی ہے۔

طالب حق کی نفسیات اس سے بالکل جدا ہوتی ہے۔ وہ صرف حق کا طالب ہوتا ہے۔ وہ تنقید کو اپنی ذات پر حملہ نہیں سمجھتا۔ وہ تنقید کو صرف اس نظر سے دیکھتا ہے کہ وہ حق ہے یا ناحق۔ تنقید اگر غلط ہے تو وہ سادہ طور پر اسے نظر انداز کر دیتا ہے۔ لیکن تنقید اگر برحق ہے تو وہ فوراً اس کو قبول کر لے گا۔ کیونکہ ایسی تنقید میں اس کو عین وہی چیز ملتی ہوئی نظر آئی جو پہلے سے اس کا مطلوب و مقصود تھی۔

جارحیت نہیں

خدا نے انسان کو آزاد پیدا کیا ہے۔ اس لیے انسان خود اپنی فطرت کے تحت یہ چاہتا ہے کہ وہ آزادانہ طور پر سوچے اور آزادانہ طور پر اظہار خیال کرے۔ انسانی فطرت کی یہ ایسی خصوصیت ہے جس کو کسی طرح بھی انسان سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔

اسی کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر انسان ایک منفرد وجود ہے۔ ہر انسان کا طرز فکر دوسرے تمام انسانوں سے جدا ہے۔ اس لیے یہ ناممکن ہے کہ تمام لوگ ایک ڈھنگ پر سوچنے لگیں۔ اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ اختلاف ایک تقاضائے فطرت ہے، ایسی حالت میں انسانوں کے درمیان اختلاف کو ختم کرنا ممکن نہیں۔ انسان کے بارے میں صحیح اور ممکن رویہ صرف یہ ہے کہ لوگ ایک دوسرے کے مقابلہ میں تحمل کا طریقہ اختیار کریں۔ اس

دنیا میں جو شخص جتنا زیادہ متحمل ہوگا اتنا ہی زیادہ وہ کامیاب ہوگا۔

مورخین اسلام اس پر متفق ہیں کہ عملی اعتبار سے حضرت امیر معاویہؓ ایک نہایت کامیاب حکمراں تھے۔ ان کی کامیابی کا راز یہ نہیں تھا کہ انھوں نے اپنی زیر حکم دنیا میں اختلاف کو مٹا دیا تھا۔ اس کے بجائے ان کی کامیابی کا راز وہ تھا جس کو ایک مورخ نے "الحلم السیاسی" کا نام دیا ہے۔ وہ انتہائی غیر موافق بات کو انتہائی تحمل کے ساتھ سن سکتے تھے۔ ابن قتیبہ نے ان کا ایک واقعہ ان الفاظ میں نقل کیا ہے: أَغْلَظَ رَجُلٌ لِمُعَاوِيَةَ فَحَلُمَ عَنْهُ، فَقِيلَ لَهُ: تَحْلُمُ عَنْ هَذَا! فَقَالَ: إِنِّي لَا أَحُولُ بَيْنَ النَّاسِ وَبَيْنَ أَلْسِنَتِهِمْ مَا لَمْ يَحُولُوا بَيْنَنَا وَبَيْنَ سُلْطَانِنَا (عیون الاخبار لابن قتیبۃ الدینوری، جلد 1، صفحہ 397)۔ یعنی، ایک شخص نے امیر معاویہ سے سخت کلامی کی۔ انھوں نے اس سے درگزر کیا۔ ان سے کہا گیا کہ آپ ایسے آدمی سے درگزر کا معاملہ کر رہے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ میں لوگوں کے درمیان اور ان کی زبان کے درمیان حائل نہیں ہوتا جب تک وہ ہمارے درمیان اور ہماری سلطنت کے درمیان حائل نہ ہوں۔

اس تحمل کا تعلق صرف سلطنت یا سیاسی اقتدار سے نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق زندگی کے تمام معاملات سے ہے۔ ہر آدمی کی اپنی ایک دنیا ہوتی ہے، خواہ وہ سیاسی دائرہ میں ہو یا غیر سیاسی دائرہ میں، آپ انسان کی اس دنیا کو ٹھوکر نہ ماریں۔ بلکہ اپنا اختلاف تمام تر صرف دلائل پیش کرنے تک محدود رکھیں، اگر آپ ایسا کریں تو معاشرہ میں کوئی خلل واقع نہ ہوگا۔ البتہ اختلاف اس وقت خلل اندازی کے ہم معنی بن جاتا ہے جب آپ آدمی کی اپنی مخصوص دنیا کے ساتھ تصادم چھیڑ دیں۔

اختلاف کا صحیح اور فطری اصول یہ ہے کہ اختلاف کو صرف اختلاف کے دائرہ میں رکھا جائے، اس کو تصادم یا عملی جارحیت کے درجہ تک ہرگز پہنچنے نہ دیا جائے۔

ایک حاکم کے لیے عملی جارحیت یہ ہے کہ اختلاف کرنے والا نظری اختلاف کی حد سے گزر کر اس کے اقتدار سے ٹکرانا شروع کر دے۔ وہ اس کے قلب و دماغ کو مخاطب کرنے کے بجائے اس کے سیاسی وجود کو مٹانے پر تل جائے۔

ایک عام انسان کے لیے عملی جارحیت یہ ہے کہ آدمی سنجیدہ اختلاف کی حد پر نہ رکے بلکہ اس سے آگے بڑھ کر وہ زیر اختلاف شخص کی ذات کو مطعون کرنے لگے۔ وہ اس کی تذلیل وتحقیر کرے۔ وہ اس کو بدنام کرنے کی مہم چلائے۔ اس کی حیثیت عرفی کو بگاڑنے کی کوشش کرے۔ لوگوں میں اس کے خلاف نفرت پیدا کرے۔ اس کے اخلاقی قتل کی مہم چلائے۔ سازشی منصوبہ کے ذریعہ وہ اس کی تدبیر کرے کہ اس کے سماجی تعلقات ٹوٹ جائیں اور وہ اپنے ماحول میں اکیلا ہو کر رہ جائے۔

عملی جارحیت کیا ہے، اس کا تعین ہر آدمی کے اپنے حالات کے لحاظ سے کیا جائے گا اصولی طور پر عملی جارحیت یہ ہے کہ آدمی کے دماغ سے اپیل کرنے کے بجائے خود اس کے وجود سے تصادم شروع کر دیا جائے۔ اس کو سنجیدہ دلائل سے قائل کرنے کی بجائے غیر سنجیدہ طریقوں سے اسے زیر کرنے کی کوشش کی جائے۔

آزادی ہر انسان کا فطری حق ہے۔ مگر اس حق کو استعمال کرنے کی لازمی شرط یہ ہے کہ آدمی اپنی آزادی کو تشدد اور جارحیت تک نہ لے جائے۔

مشترک ذمہ داری

ابن ماجہ نے اپنی کتاب کے مقدمہ میں یہ حدیث نقل کی ہے کہ بابرکت ہے وہ بندہ جس کو اللہ نے بھلائی کا دروازہ کھولنے والا اور برائی کا دروازہ بند کرنے والا بنایا: فَطُوبَى لِعَبْدٍ جَعَلَهُ اللّٰهُ مِفْتَاحًا لِلْخَيْرِ، مِغْلَاقًا لِلشَّرِّ (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 238)۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک سچے اسلامی معاشرہ میں لوگ کس احساس کو لے کر جیتے ہیں۔ ایسے معاشرہ میں ہر آدمی اس احساس کے تحت جی رہا ہوتا ہے کہ معاشرہ کے احوال میں اسے غیر جانب دار نہیں رہنا ہے بلکہ ہر موقع پر اپنا اصلاحی کردار ادا کرنا ہے۔ جہاں اس کو نظر آئے کہ وہ ایک بھلائی کی روایت قائم کرسکتا ہے تو فوراً وہ اس کے لیے آمادہ ہو جائے گا۔ اسی طرح جہاں اس کو دکھائی دے کہ ایک شر جنم لے رہا ہے تو فوراً وہ اس کو روکنے کے لیے کمر بستہ ہو جائے گا۔ خیر کا راستہ کھولنا اور شر کا دروازہ بند کرنا ایمان کے تقاضوں میں سے ایک اہم تقاضا ہے۔

اسلام کا یہ مطلوب اصلاحی عمل کسی ایسے معاشرہ ہی میں انجام دیا جاسکتا ہے جہاں تنقید کو برا نہ سمجھا جاتا ہو۔ جہاں باتوں کو اس لحاظ سے نہ دیکھا جائے کہ وہ کس کے موافق ہے اور کس کے خلاف۔ اس کی وجہ سے کس کی شخصیت اونچی ہوتی ہے اور کس کی شخصیت نیچی۔ حتی کہ کلام کے اس پہلو کو بھی نظر انداز کر دیا جائے کہ وہ نرم الفاظ میں ہے یا سخت الفاظ میں۔ معاشرہ میں جب تک اس قسم کا آزادانہ ماحول نہ ہو، کسی کے لیے مذکورہ مومنانہ عمل انجام دینا ممکن ہی نہیں۔

کسی معاشرہ میں اس روح کا پایا جانا یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس معاشرہ کے افراد صرف اپنے لیے نہیں سوچتے بلکہ دوسروں کے لیے بھی سوچتے ہیں۔ ان کے اندر اعلیٰ انسانی اور اخلاقی احساسات زندہ ہیں۔ وہ اپنے ماحول کے بارے میں انتہائی سنجیدہ ہیں۔ وہ حق کے لیے کسی اور کی رعایت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ان کے دل میں ہر ایک کے لیے خیر خواہی کا جذبہ موجود ہے۔ وہ مجموعی انسانیت کا فائدہ چاہتے ہیں نہ کہ صرف اپنا یا اپنی ذات کا فائدہ۔ تاہم یہ نیکی صرف ان لوگوں کا مقدر ہے جو اظہار حق کے ساتھ قبولیتِ حق کا مادہ بھی اپنے اندر رکھتے ہوں۔

بھلائی کا دروازہ کھولنا اور برائی کا دروازہ بند کرنا، یہ کوئی یک طرفہ عمل نہیں ہے۔ یعنی ایسا نہیں ہے کہ کسی فرد یا گروہ کو خدائی لائسنس دے دیا گیا ہے کہ وہ دوسرے لوگوں کا احتساب کریں اور دوسروں کو ان کا احتساب کرنے کا حق نہ ہو۔ بلکہ یہ دوطرفہ عمل ہے، اور معاشرہ کے سبھی لوگوں کی طرف سے سبھی لوگوں کے اوپر جاری رہتا ہے۔

اسی لیے قرآن وحدیث میں اس کے لیے وہ صیغے استعمال کیے گئے ہیں جن میں دوطرفہ مشارکت کا مفہوم ہے۔ مثلاً فرمایا کہ: وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ (103:3) یعنی، ایک دوسرے کو باہم حق کی نصیحت کرو۔ اسی طرح فرمایا کہ: كَانُوا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُنكَرٍ فَعَلُوهُ (5:79)۔ یعنی، وہ بگاڑ کے وقت ایک دوسرے کو برے کام سے روکتے نہیں تھے۔ اسی طرح حدیث میں ہے کہ: بَلِ ائْتَمِرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَتَنَاهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (سنن ابی داؤد، حدیث نمبر 4341)۔ یعنی تم آپس میں ایک دوسرے کو معروف کی تلقین کرو اور آپس میں ایک دوسرے کو برائی سے روکو۔

خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق کے بہت سے واقعات اس سلسلہ میں سیرت کی کتابوں میں آئے ہیں۔ مثلاً متعدد بار ایسا ہوا کہ انھوں نے ایک حکم جاری کیا۔ ایک شخص نے شرعی دلیل کے ساتھ بتایا کہ آپ کا حکم درست نہیں۔ اس کے بعد فوراً انھوں نے اپنا حکم واپس لے لیا اور کہا کہ: لَوْلَا فُلَانٌ لَهَلَكَ عُمَرُ (السنن الکبریٰ للبیہقی، اثر نمبر 15558)۔ یعنی، اگر فلاں شخص نہ ہوتا تو عمر ہلاک ہو جاتا۔ ایک مرتبہ حضرت عمر رات کے گشت پر نکلے۔ دیکھا کہ ایک آدمی شہر کے باہر کھڑا ہوا ایک عورت سے بات کر رہا ہے۔ انھوں نے اس کو کوڑا مار دیا۔ اس نے کہا کہ آپ نے کیوں مجھے کوڑا مارا۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ تم رات کے وقت ایک اجنبی عورت سے بات کر رہے ہو۔ اس نے بتایا کہ یہ اجنبی عورت نہیں ہے، یہ میری بیوی ہے۔ ہم دونوں باہر سے آ کر ابھی یہاں پہنچے ہیں۔ ہم مشورہ کر رہے تھے کہ اس وقت

شہر میں کس کے گھر جائیں۔ حضرت عمر نے فوراً کوڑا مذکورہ آدمی کے ہاتھ میں دے دیا اور کہا کہ اب تم مجھے کوڑا مارو، کیوں کہ اس معاملہ میں اصل غلطی میری تھی۔

یہی ہمیشہ تمام صالحین کا معاملہ رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو آدمی اپنے خلاف تنقید سننے کے لیے تیار نہ ہو، اس کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ دوسروں کے اوپر تنقید کرے۔ اسلام میں اختلاف اور محاسبہ کا حق ایک مشترک حق ہے نہ کہ کسی ایک کا مخصوص حق۔

آزادی کی حد

فکری آزادی بلاشبہ کسی انسان کے لیے ایک عظیم نعمت ہے۔ مگر اس دنیا میں ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے، اسی طرح آزادی کی بھی حد ہے۔ آزادی اپنی حد کے اندر نعمت ہی نعمت ہے۔ مگر اپنی حد کے باہر وہ فساد ہی فساد ہے۔

فکری آزادی کی حد یہ ہے کہ وہ معلوم اور ثابت شدہ حقیقتوں کے دائرہ میں جاری ہو، مفروضات اور قیاسات کی بنیاد پر نہ کوئی رائے قائم کی جائے اور نہ اس قسم کی بے اصل باتوں کو لے کر کوئی نظریاتی عمارت کھڑی کی جائے۔ قرآن میں اہل ایمان کو حکم دیا گیا ہے کہ — اور تم ایسی چیز کے پیچھے نہ لگو جس کی تم کو خبر نہیں۔ بے شک کان اور آنکھ اور دل سب کی بابت آدمی سے پوچھ ہوگی (17:36)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کو غیر ذمہ دارانہ کلام سے بچنا چاہیے۔ اس کو وہی بات بولنا چاہیے جس کی بابت سننے اور دیکھنے اور سمجھنے کی طاقتوں کو بھر پور طور پر استعمال کر کے وہ اس کی تحقیق کر چکا ہو۔ اگر اس نے ایسا نہیں کیا تو وہ اس بات کا مجرم قرار دیا جائے گا کہ خدا کی دی ہوئی ضروری صلاحیتوں کو استعمال کیے بغیر بالکل بے بنیاد طور پر اس نے اظہار خیال کرنا شروع کر دیا۔

آدمی اگر کسی شخص کے خلاف یا کسی مسئلہ کے بارے میں کلام کرنا چاہتا ہے تو اس پر لازم ہے کہ وہ اس کی پوری تحقیق کرے۔ وہ اظہار خیال سے پہلے پوری طرح اس کی جانچ کرے۔ اور پھر وہ صرف اس وقت بولے جب کہ اس کے پاس بولنے کے لیے کوئی محکم بات ہو، بصورت دیگر اس پر فرض ہے کہ وہ خاموشی کا طریقہ اختیار کرے۔

بولنا اس آدمی کے لیے جائز ہے جو بولنے سے پہلے اس کی تیاری کرے۔ وہ اپنے آپ کو بولنے کا اہل بنائے۔ سنی سنائی باتوں پر رائے دینا اتنا برا ہے کہ حدیث میں اس کو جھوٹ کہا گیا ہے۔ اسی طرح نیت سے تعلق رکھنے والی باتوں کو زیر بحث لانا سخت گناہ ہے۔ کیوں کہ اس کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں۔ آزادانہ اظہار رائے جس طرح ایک حق ہے اسی طرح وہ ایک ذمہ داری بھی ہے۔ اور وہ یہ کہ کامل واقفیت کے بغیر آدمی کبھی اظہار رائے نہ کرے۔

قتادہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور ابو بکر اور عمر مکہ اور منٰی میں قصر کر کے دو رکعت نماز پڑھتے تھے۔ عثمان نے بھی اپنی خلافت کے ابتدائی زمانہ میں ایسا ہی کیا۔ اس کے بعد عثمانؓ نے قصر نہیں کیا بلکہ چار رکعت نماز پڑھی۔ عبداللہ بن مسعودؓ کو یہ بات معلوم ہوئی تو انھوں نے إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ پڑھا اور اس کو غلط بتایا۔ اس کے بعد وہ اٹھے اور چار رکعت نماز ادا کی۔ ان سے کہا گیا کہ چار رکعت نماز پر آپ نے إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ کہا اور پھر خود بھی آپ نے خلیفہ کی پیروی میں چار رکعت نماز پڑھی۔ انھوں نے جواب دیا کہ خلاف کرنا زیادہ برا ہے —— الخلاف شر (الآثار لابی یوسف، اثر نمبر 147)۔

حضرت عبداللہ بن مسعود کی یہ مثال ایک اہم حقیقت کو بتاتی ہے۔ اور وہ ایک فرق ہے جس کو اس طرح کے اختلافی معاملہ میں ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ وہ فرق یہ ہے کہ اختلافی معاملہ میں بولنے کے وقت تو اصل معیار کو سامنے رکھا جائے گا۔ مگر عمل کرنے کے معاملہ میں عملی پہلوؤں کی رعایت کی جائے گی۔

آزادی ہر فرد کا ایک حق ہے۔ مگر ہر حق کے ساتھ کچھ ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔ اسی طرح آزادی کے حق کے ساتھ بھی کچھ لازمی ذمہ داریاں وابستہ ہیں۔ ان میں سے ایک ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنے اس حق کو استعمال کرنے سے پہلے بار بار یہ سوچے کہ اس کا بولنا نتیجہ کے اعتبار سے کیسا ثابت ہوگا وہ تعمیری نتیجہ پیدا کرے گا یا تخریبی نتیجہ۔

اسی طرح یہ بھی ایک ذمہ داری ہے کہ اجتماعی نظام میں اجتماعی فیصلہ کی پیروی کی جائے۔ جس آدمی کے ہاتھ میں اجتماعی معاملہ کا نظم نہ ہو، وہ زبانی طور پر اپنا اختلاف ظاہر کرسکتا ہے، مگر عملی اعتبار سے اس کو وہی کرنا چاہیے جو دوسرے لوگ کر رہے ہیں۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو اجتماعی اتحاد ٹوٹ جائے گا، اور اجتماعی اتحاد کا ٹوٹنا تمام برائیوں میں سب سے بڑی برائی ہے۔

حدیث میں ہے کہ: فَعَلَيْكُمْ بِالسَّوَادِ الْأَعْظَمِ (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 3950) عَلَيْكُمْ بِالسَّوَادِ الْأَعْظَمِ (مسند احمد، حدیث نمبر 18450)۔ یعنی، سواد اعظم کی پیروی کرو۔ اس حدیث کا مطلب بھی یہی ہے۔ یعنی جب فتنہ کی حالت ہو اور صورت حال پر تمہارا کنٹرول قائم نہ رہے تو تم قول کی حد تک حکیمانہ انداز میں حق کا اعلان کر سکتے ہو۔ مگر عمل کے معاملہ میں تمہیں مسلمانوں کے سواد اعظم کے ساتھ رہنا چاہیے۔ کیوں کہ ایسی حالت میں عملی اختلاف زیادہ بڑی برائی کا سبب بن جائے گا۔

اختلافات کی توجیہ

قرآن میں ارشاد ہوا ہے — کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے۔ اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو وہ اس کے اندر بہت اختلاف پاتے (4:82)۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ نے جو دین اسلام بھیجا ہے وہ ایک ایسا دین ہے جس میں کوئی اختلاف نہیں۔ یہی بات حدیث میں اس طرح کہی گئی ہے کہ میں نے تم کو ایک

روشن دین پر چھوڑا ہے، اس کی راتیں بھی اس کے دنوں کی طرح ہیں: لَقَدْ تَرَكْتُكُمْ عَلَى مِثْلِ الْبَيْضَاءِ، لَيْلُهَا وَنَهَارُهَا سَوَاءٌ (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 5)۔

مگر ایک شخص جب قرآن کی تفسیروں اور حدیث کی شرحوں کو پڑھتا ہے۔ جب وہ فقہ اور عقائد کی کتابوں کو دیکھتا ہے تو بظاہر بالکل برعکس تصویر دکھائی دیتی ہے۔ یہاں وہ اتنے زیادہ اختلافات دیکھتا ہے کہ شاید اسلام کی کوئی ایک تعلیم بھی نہیں جس میں علما کے درمیان کثرت سے اختلاف نہ پایا جاتا ہو۔ یہاں دین اسلام بظاہر دین اختلاف معلوم ہونے لگتا ہے۔

ایک دار العلوم کے شیخ الحدیث نے کہا کہ شوال کے مہینہ میں حدیث کے اسباق کی بسم اللہ ہوتی ہے اور رجب میں اس کی تمت ہوتی ہے۔ ان دس مہینوں میں اسباق کا کوئی دن بھی ایسا نہیں گزرتا جس میں کم از کم بیس مرتبہ یہ نہ کہنا پڑتا ہو کہ اس مسئلہ میں فلاں امام کا یہ مذہب ہے اور فلاں کا یہ مختلف مذہب ہے۔ صحابہ کا یہ مذہب تھا، تابعین میں یہ اختلاف ہے اور یہ کہ: رَأْيُنا صَوَابٌ وَرَأْيُ غَيْرِنا خَطَأٌ (ہماری رائے درست ہے اور دوسروں کی رائے خطا ہے)۔

ایک بے اختلاف دین با اختلاف دین کیوں بن گیا۔ اور اس معاملہ کی اطمینان بخش توجیہہ کیا ہے۔ اس پر پچھلے ہزار برس کے دوران بہت لکھا گیا ہے اور بہت کچھ کہا گیا ہے۔ آج بھی اس کے بارے میں کثرت سے مضامین اور کتابیں شائع کی جا رہی ہیں۔

یہ سوال ابتدائی طور پر صحابہ کے زمانہ ہی میں موجود تھا۔ تاہم باقاعدہ صورت میں وہ تابعین اور تبع تابعین کے زمانہ میں نمایاں ہوا۔ جب حدیثیں اکٹھا کی گئیں تو معلوم ہوا کہ خود روایات میں کثرت سے اختلافات پائے جاتے ہیں۔ اب لوگوں نے یہ سوال کرنا شروع کیا کہ کس روایت کی پیروی کریں اور کس روایت کی پیروی نہ کریں۔

اس وقت ابتداءً یہ نقطۂ نظر اختیار کیا گیا کہ یہ مختلف روایتیں تو خود صحابہ سے مل رہی ہیں۔ اور صحابہ سب کے سب قابل تقلید ہیں۔ پھر ہم کیوں کر ایسا کہہ سکتے ہیں کہ اِس صحابی کی روایت کو مانو اور اُس صحابی کی روایت کو نہ مانو۔

محمد بن عبد الرحمن الصیرفی کہتے ہیں کہ میں نے احمد بن حنبل سے پوچھا کہ کسی مسئلہ میں اصحاب رسول مختلف ہوں تو کیا ہمارے لیے جائز ہے کہ ہم غور کر کے یہ فیصلہ کریں کہ ان میں سے درست قول کون سا ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ رسول اللہ کے اصحاب کے درمیان ایسا غور وفکر کرنا جائز نہیں (لَا يَجُوزُ النَّظَرُ بَيْنَ أَصْحَابِ رَسُولِ اللَّهِ صلى الله عليه وسلم)۔ الصیرفی کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا کہ پھر کس کے قول پر عمل کیا جائے۔ احمد بن حنبل نے کہا کہ ان میں سے جس کی بھی چاہو اتباع کرلو: تُقَلِّدْ أَيَّهُمْ أَحْبَبْتَ (جامع بیان العلم وفضلہ لابن عبد البر: 1705)۔

امام احمد بن حنبل کی یہ بات بجائے خود نہایت درست ہے۔ کیوں کہ ہم کسی صحابی کو صحیح اور کسی صحابی کو غلط نہیں کہہ سکتے۔ ہمارے لیے ہر صحابی قابل اتباع ہے۔ تاہم اس جواب میں اس بات کی علمی توجیہ موجود نہیں ہے کہ ایسا مسلک کیوں درست ہے۔

اس کے بعد دوسرا مسلک وہ ہے جس کو فقہاء کی ایک تعداد نے اختیار کیا۔ مثلاً امام مالک سے پوچھا گیا کہ صحابہ کے اختلافات میں کیا کرنا چاہیے۔ انھوں نے جواب دیا کہ ان میں کچھ نادرست ہیں اور کچھ درست ہیں، تو ان پر غور کر کے کسی کو اختیار کرو — خَطَأٌ وَصَوَابٌ فَانْظُرْ فِي ذَلِكَ (جامع بیان العلم وفضلہ لابن عبد البر: 1694)۔

امام ابوحنیفہ نے اور زیادہ واضح طور پر یہی بات کہی۔ انھوں نے کہا کہ دونوں میں سے ایک قول خطا ہے۔ اور اس خطا کا گناہ معاف کر دیا گیا ہے: أَحَدُ الْقَوْلَيْنِ خَطَأٌ وَالْمَأْثَمُ فِيهِ مَوْضُوعٌ (جامع بیان العلم وفضلہ لابن عبد البر: 1706)۔

یہ جواب بلاشبہہ درست نہیں ہے۔ کیوں کہ مختلف اقوال میں سے ہر قول جب کسی صحابی کی طرف سے ملا ہوتو ہم کو یہ حق نہیں کہ بطور خود ایک کو خطا اور دوسرے کو صواب کہیں۔ صحابہ کے مختلف اقوال کے سلسلے میں ہم مجبور ہیں کہ ہم ایک کو صواب سمجھیں۔ ان کے درمیان امتیاز قائم کرنا ہمارے لیے اپنی حد سے تجاوز کرنے کے ہم معنی ہوگا۔

اس معاملہ میں زیادہ گہرائی کے ساتھ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ دین کے دو حصے ہیں۔ ایک اصول کا حصہ، اور دوسرے فروع اور جزئیات کا حصہ۔ مذکورہ تمام اختلافات فروع اور جزئیات سے تعلق رکھتے ہیں۔ جہاں تک اصول کا تعلق ہے، ان میں کوئی اختلاف نہیں۔ مثلاً پنج وقتہ نماز یا نمازوں میں رکعات کی مختلف تعداد کے بارے میں تمام اہل اسلام متفق ہیں۔ البتہ آمین بالجہر اور آمین بالسر جیسے کثیر مسائل ہیں جن میں ان کے یہاں اختلافات پائے جاتے ہیں۔

اس تقسیم کو قرآن کی روشنی میں دیکھا جائے تو فیصلہ بہت آسان ہو جاتا ہے۔ قرآن میں ہے کہ تمام انبیاء کو ایک ہی الدین (42:13) دیا گیا ہے۔ الدین سے مراد دین کے اصولی اور اساسی احکام ہیں۔ یہ اصولی اور اساسی احکام ابدی ہیں اور یکساں طور پر ہر پیغمبر کو دیے جاتے رہے ہیں۔ ان کے معاملہ میں ایک نبی اور دوسرے نبی کے درمیان کوئی فرق نہیں۔

قرآن کے مطابق، دین کا دوسرا حصہ وہ ہے جس کو شِرعۃ اور منہاج (5:48) کہا گیا ہے۔ یہ دوسرا حصہ مختلف پیغمبروں کے یہاں مختلف رہا ہے۔

یہی فرق اسلام میں داخلی طور پر بھی پایا جاتا ہے۔ گویا قرآن اور اسی طرح حدیث کے اتفاقی اجزاء کی حیثیت الدین کی ہے۔ اور اس کے بعد جو اختلافی اجزاء ہیں وہ اس حصۂ دین سے متعلق ہیں جن کو قرآن میں شِرعۃ اور منھاج کہا گیا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ خود شارع کی اپنی اسکیم کے مطابق، دین کے ایک حصہ میں توحّد

مطلوب ہے اور دین کے دوسرے حصہ میں تنوع اور توسّع۔ ایسا ہونا بالکل فطری ہے۔ اس کو اس طرح سمجھ سکتے ہیں کہ اساسات دین (مثلاً اخلاص للّٰہ) کی حیثیت اسپرٹ کی ہے اور فقہی احکام کی حیثیت فارم کی۔ اور یہ فطرت کا قانون ہے کہ اسپرٹ میں ہمیشہ یکسانیت پائی جاتی ہے۔ مگر فارم میں کبھی یکسانیت نہیں ہوتی اور نہ ہوسکتی۔ مثلاً مکان کی اصل حیثیت یہ ہے کہ وہ شِلٹر کا کام دے۔ اس اعتبار سے ہر مکان یکساں ہوگا۔ مگر فارم کے اعتبار سے ہر مکان یکساں نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح دین اپنی اسپرٹ کے اعتبار سے ہمیشہ ایک رہتا ہے۔ مگر فارم کے اعتبار سے اس میں تنوع ہوتا ہے اور یہ تنوع کبھی ختم ہونے والا نہیں۔ صحابہ کے اختلاف کی اصل حقیقت یہی ہے۔

مگر بات صرف اتنی ہی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اختلاف کی ایک عظیم مثبت افادیت بھی ہے۔ اور وہ یہ کہ کسی معاملہ میں جب اختلاف کا امکان ہو، اسی وقت اس میں ذہنی سرگرمیاں جاری ہوتی ہیں اور اس طرح انسانی فکر کا مسلسل ارتقا ہوتا رہتا ہے۔ اگر اختلاف کی گنجائش نہ ہوتو ذہنی سرگرمیاں بھی جاری نہ ہوں گی، اور پھر انسانی فکر کے ارتقا کا عمل بھی رک جائے گا جس کا آخری نتیجہ ذہنی جمود ہوگا، اور ذہنی جمود اس دنیا میں ذہنی موت کے ہم معنی ہے۔

اس عمل کے دوران لازماً اختلاف واقع ہوگا۔ کوئی عالم ایک رائے پر پہنچے گا، اور کوئی عالم دوسری رائے پر، اور کوئی عالم تیسری رائے پر۔ مگر رایوں کا اختلاف کوئی برائی نہیں۔ اصل قابل لحاظ چیز یہ ہے کہ یہی واحد صورت ہے جس سے کسی گروہ کے اندر فکری سرگرمیاں جاری ہوتی ہیں۔ اور پھر فکری سرگرمیوں کے ذریعہ تخلیقیت (creativity) جنم لیتی ہے اور ذہنی ارتقا کے راستے کھلتے ہیں۔ اس معاملہ میں ''اختلاف'' کی حیثیت فطری کورس کی ہے، اور فکری سرگرمیوں کی حیثیت نتیجہ کی، اور اصل قابل لحاظ چیز نتیجہ ہے نہ کہ کورس۔

اس معاملہ کی ایک مثال لیجیے۔ قرآن میں ایک طرف یہ حکم دیا گیا ہے کہ: فَأَعْرِضْ

عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ (4:81)۔ یعنی، ان سے اعراض کرو اور اللہ پر بھروسہ رکھو۔ دوسری طرف قرآن میں یہ حکم ہے کہ: یا أَیُّهَا النَّبِیُّ جاهِدِ الْکُفَّارَ وَالْمُنافِقِینَ (9:73)۔ یعنی، اے نبی، کافروں اور منافقوں سے جنگ کرو۔

یہ دونوں آیتیں بظاہر ایک دوسرے سے مختلف معلوم ہوتی ہے۔ ایک آیت جن لوگوں سے اعراض کی تعلیم دیتی ہے، دوسری آیت انھیں لوگوں سے ٹکراؤ کا حکم دے رہی ہے۔ اس فرق واختلاف نے ذہنوں کو جھنجوڑا اور لوگوں نے اس پر غور کرنا شروع کیا۔

اب ایک خیال یہ قائم کیا گیا کہ قتال کی آیت نے اعراض کی آیت کو منسوخ کر دیا ہے (فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ) ای لَا تُعَاقِبْهُمْ۔ وَیُقَالُ: إِنَّ هَذَا مَنْسُوخٌ بِقَوْلِهِ تَعَالَى: یَا أَیُّهَا النَّبِیُّ جاهِدِ الْکُفَّارَ وَالْمُنافِقِینَ (تفسیر القرطبی، جلد 5، صفحہ 290)۔

مگر ذہنی عمل یہیں ختم نہیں ہوجاتا۔ چنانچہ اس نے مزید کچھ لوگوں کے ذہن کو متحرک کیا۔ انھوں نے غور کیا تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ اعراض کی آیت منسوخ نہیں ہے۔ چنانچہ انھوں نے اس کو محکمات میں شمار کیا (تفسیر القرطبی 10/202)۔

اب غور کیجیے تو یہی دوسری رائے قرآن کی روح کے زیادہ مطابق نظر آئے گی۔ اصل یہ ہے کہ اعراض ایک مستقل حکم ہے اور اس کا تعلق مومن کی عام اخلاقیات سے ہے۔ دعوت دیتے ہوئے، لوگوں سے معاملہ کرتے ہوئے، یا سفر کرتے ہوئے بار بار ایسا ہوتا ہے کہ دوسروں کی طرف سے ناخوش گوار تجربات پیش آتے ہیں۔ ایسے تمام مواقع پر اعراض کا طریقہ اختیار کرنا ایک مستقل حکم ہے۔ مومن جاہلوں سے اعراض کر کے خلق عظیم کا ثبوت دیتا ہے جو دنیا وآخرت کی تمام سعادتوں کے لیے اساس کی حیثیت رکھتی ہے۔

جہاں تک جہاد (بمعنی قتال) کا تعلق ہے، وہ دفاع کی مصلحت کے تحت ہے۔ جب کسی گروہ کی طرف سے عملاً جارحیت کا فعل کیا جائے تو اس وقت اس کی جارحیت کو فرو کرنے

کے لیے اس سے مقابلہ کیا جائے گا۔ قتال ایک وقتی حکم ہے اور اعراض ایک مستقل حکم۔

معلوم ہوا کہ ”الدین“ میں کوئی اختلاف نہیں۔ جو کچھ اختلاف ہے وہ صرف شریعت میں ہے۔ یہ اختلاف دو قسم کا ہے۔ ایک، وہ جو عبادات سے متعلق ہے، اور دوسرا، وہ جو معاملات سے تعلق رکھتا ہے۔

عبادات میں جو اختلاف ہے وہ تمام تر اس کی ظاہری جزئیات میں ہے۔ اور اس نوعیت کا اختلاف یا فرق بالکل فطری ہے۔ کیوں کہ عبادت ایک ایسا عمل ہے جو ہمیشہ یکساں کیفیت کے ساتھ انجام نہیں دیا جاسکتا۔ کبھی آدمی کے اندر کیفیات زیادہ ہوں گی اور کبھی کم۔ یہی کیفی فرق عبادت کے ظاہری آداب میں فرق پیدا کر دیتا ہے۔ گویا عبادت کے اساسی اجزاء میں وحدت ہے اور عبادت کے ظاہری آداب میں تنوع اور توسع۔ اس معاملہ میں روایات میں جو اختلاف پایا جاتا ہے وہ دراصل اسی تنوع کا ایک ریکارڈ ہے۔

ایک اور اعتبار سے یہی معاملات کی صورت بھی ہے۔ معاملات میں بنیادی احکام اگرچہ نہایت واضح ہیں۔ مگر وہ حالات ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں جن میں کسی حکم کا انطباق مطلوب ہے۔ اس لیے انطباق کے اعتبار سے احکام کی جزئیات وفروع میں اکثر فرق کرنا پڑتا ہے۔ معاملات کے بارے میں حدیث اور فقہ میں جو اختلاف ہے وہ اسی فرق باعتبار انطباق کی مختلف مثالیں ہیں۔

روشنی کی طرف

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ — اللہ نے تمہاری طرف ایک نصیحت اتاری ہے، ایک رسول جو تم کو اللہ کی کھلی کھلی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے تاکہ ان لوگوں کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف نکالے جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیا۔ اور جو شخص اللہ پر ایمان لایا اور

نیک عمل کیا اس کو وہ ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، اللہ نے اس کو بہت اچھی روزی دی (65:10-11)۔ پیغمبر کی ہدایت کو اس آیت میں تاریکی سے نکال کر روشنی میں لانا کہا گیا ہے۔ اس کا مطلب ہے، غلط فکری کی حالت سے نکال کر صحیح فکر کے مرحلہ میں پہنچانا۔

انسان پیدائشی طور پر حقیقت کو جاننا چاہتا ہے۔ مگر انسان کی عقل محدود ہے۔ اپنی اس محدودیت کی بنا پر کوئی شخص حقیقت کا پورا احاطہ نہیں کر پاتا، اس لیے وہ مستقل طور پر بے یقینی کی حالت میں مبتلا رہتا ہے۔ پیغمبر کی ہدایت آدمی کو اس حالت سے نکالتی ہے۔ وہ آدمی کو کامل یقین کے دور میں پہنچاتی ہے۔

ہر آدمی یہ چاہتا ہے کہ اس کی زندگی بہتر انجام تک پہنچے۔ مگر انسان جب کوشش شروع کرتا ہے تو اپنی کامیابی کی آخری حد پر پہنچ کر وہ صرف یہ دریافت کرتا ہے کہ جو کچھ میں چاہتا ہوں وہ اس دنیا میں کبھی ملنے والا نہیں۔ یہاں پیغمبر کی ہدایت اس کے لیے تاریکی میں روشنی بن کر ظاہر ہوتی ہے۔ وہ اس کو صحیح سوچ اور صحیح عمل کا راستہ دکھاتی ہے۔

موجودہ دنیا میں سب سے اہم چیز صحیح طرزِ فکر ہے، موت سے پہلے کی زندگی کے بارے میں بھی، اور موت کے بعد کی زندگی کے بارے میں بھی۔ مگر موجودہ دنیا بے شمار چیزوں کا ایک جنگل ہے۔ یہاں ان گنت آوازیں بیک وقت گونج رہی ہیں۔ ایسی حالت میں کسی انسان کے لیے یہ مشکل ترین امر ہے کہ وہ فکر کے صحیح سرے کو دریافت کرے اور اس پر یقین کے ساتھ جم جائے۔

پیغمبر کی رہنمائی یہاں انسان کی مدد کرتی ہے۔ وہ انسان کو سوچ کا وہ صحیح سرا دیتی ہے جہاں سے وہ اپنے لیے صحیح نقطۂ آغاز پالے۔ اور صحیح نقطۂ آغاز کو پالینا ہی اس دنیا میں حقیقی منزل تک پہنچنے کی سب سے زیادہ یقینی ضمانت ہے۔

حکیمانہ قول

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ حقیقی عالم وہ ہے جو لوگوں کو اللہ کی رحمت سے مایوس نہ کرے: إِنَّ الْفَقِيهَ حَقَّ الْفَقِيهِ، مَنْ لَمْ يُقَنِّطِ النَّاسَ مِنْ رَحْمَةِ اللّٰهِ (مسند الدارمی، اثر نمبر 305)۔ یہ ایک نہایت بامعنی قول ہے اور اس کے بہت سے پہلو ہیں۔

اس قول کا ایک مطلب یہ ہے کہ وعظ و نصیحت کی مجلس میں جب عام لوگوں کو نیک عملی کی تلقین کی جائے تو ایسا معیار ان کے سامنے نہ رکھا جائے کہ وہ سمجھنے لگیں کہ دین پر عمل کرنا ان کے بس میں نہیں ہے، اور وہ خدا کی رحمت سے مایوس ہو جائیں۔ اس کے بجائے بات کو اس طرح کہا جائے کہ اس میں ترغیب و تشویق کا پہلو نمایاں ہو، جس کو سن کر لوگوں کے اندر عمل کا حوصلہ پیدا ہو۔

اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ روزمرہ کے معاملات میں لوگوں کو جو رہ نمائی دی جائے اس میں شدت کے طریقہ سے پرہیز کیا جائے۔ کم علمی سے شدت پسندی پیدا ہوتی ہے۔ مگر جو آدمی گہرا علم رکھتا ہو اس کی نظر وسیع ہوگی۔ اس بنا پر وہ ایسی بات کہے گا جس میں رعایت اور سہولت کا پہلو نظر انداز نہ ہونے پائے۔ جس میں خدا کا دین ہر آدمی کو قابل عمل دکھائی دینے لگے۔

اسی طرح اس قول کا ایک پہلو وہ ہے جو وسیع تر حالات سے تعلق رکھتا ہے۔ مقابلہ کی اس دنیا میں جب ایک قوم دوسری قوم پر غالب آ جائے۔ جب ایک گروہ دوسرے گروہ کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھ جائے۔ یہاں تک کہ قومی زندگی میں نئے نئے مسائل پیدا ہو جائیں۔ اس وقت کم علم آدمی ظاہر حالات کو دیکھ کر شکایت اور احتجاج کی زبان بولنے لگے گا۔ وہ سازش اور ظلم کا انکشاف کر کے لوگوں کو محرومی اور مظلومی کے احساس میں مبتلا کر دے گا۔

لیکن جو شخص گہرا علم رکھتا ہو وہ زیادہ گہرائی کے ساتھ حالات کا جائزہ لے گا، وہ حقائق کو

زیادہ دور تک دیکھنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ ایسا شخص تاریکی میں روشنی کے امکانات کو دریافت کرے گا۔ چنانچہ وہ لوگوں کو عسر میں یسر کی خبر دے گا۔ وہ مسائل کے درمیان مواقع کی نشاندہی کرے گا۔ وہ لوگوں کے اندر امید اور حوصلہ پیدا کرے گا، کیوں کہ وہ بتائے گا کہ تم کس طرح اپنے مائنس (نہیں) کو دوبارہ پلس (ہے) میں تبدیل کرسکتے ہو۔

فرقہ بندی

مشہور روایت کے مطابق، رسول اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بنواسرائیل کے لوگ بہتّر فرقوں میں بٹ گئے اور میری امت کے لوگ تہتّر فرقوں میں بٹ جائیں گے۔ سب کے سب آگ میں جائیں گے سوا ایک کے (كُلُّهُمْ فِي النَّارِ إِلَّا مِلَّةً وَاحِدَةً)۔ پوچھا گیا کہ اے خدا کے رسولؐ، یہ ایک کون ہے۔ آپ نے فرمایا کہ وہ طریقہ جس پر میں اور میرے اصحاب ہیں: مَا أَنَا عَلَيْهِ وَأَصْحَابِي (سنن الترمذی، حدیث نمبر 2641)۔

علماء اسلام نے "72" گمراہ فرقوں کی نشاندہی کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً سید عبدالقادر جیلانی نے غُنیۃ الطالبین میں اس پر تفصیلی بحث کی ہے اور نام بنام ان کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً خارجیہ، شیعہ، معتزلہ، مرجیہ، مشبہ، جہمیہ، ضراریہ، کلابیہ، وغیرہ۔ پھر ہر فرقے کے ذیلی فرقے۔ اس طرح انھوں نے اس تعداد کو بہتر اور تہتر تک پہنچا دیا ہے۔ اگرچہ ان میں سے بیشتر فرقے اب صرف کتابوں میں ہیں، عملی دنیا میں ان کا کہیں وجود نہیں۔

تاہم ان تاریخی فرقوں کی اہمیت باعتبار حصر نہیں ہے بلکہ باعتبار علامت ہے۔ یعنی وہ علامتی طور پر بتاتے ہیں کہ امت میں جب گمراہی آئے گی تو وہ کس طرح اور کس راستہ سے آئے گی۔ ان فرقوں کا مطالعہ بتاتا ہے کہ یہ تمام گمراہ فرقے اعتقادیات میں غیر ضروری خوض

کے نتیجہ میں پیدا ہوئے۔ اور یہی ان کی اصل گمراہی تھی۔ غور وفکر اسلام میں مطلوب ہے۔ حتی کہ قرآن کے نزول کا مقصد ہی تدبر بتایا گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ صحیح تدبر آدمی کی معرفتِ حق میں اضافہ کرتا ہے۔ اس کے برعکس، منحرفانہ تدبر ذہنی انتشار پیدا کرتا ہے، اور آخر کار گمراہی کے گڑھے میں گرا دیتا ہے۔

عقائد کا تعلق امورِ غیب سے ہے۔ غیب کے بارے میں آدمی براہ راست علم حاصل نہیں کر سکتا، اس لیے صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس معاملہ میں اتنے ہی پر قناعت کیا جائے جو بتا دیا گیا ہے: أَبْهِمُوا مَا أَبْهَمَهُ اللّٰه (الأصل لمحمد بن الحسن الشيباني، جلد 10، صفحہ 182) اور نامعلوم کے دائرہ میں خیال آرائی کی کوشش نہ کی جائے۔ یہی اس معاملہ میں اصحاب رسول کا طریقہ تھا۔

جو آدمی اپنی غور وفکر کو معلوم کے دائرہ میں استعمال کرے وہ ما انا علیہ واصحابی کا مصداق ہے، اور جو آدمی غیر معلوم یا ممنوعہ دائرہ میں خوض کرنے لگے وہ ہدایت کے دائرہ سے نکل گیا۔

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ: وہ اللہ ہے جس نے تمہارے اوپر کتاب اتاری۔ اس میں کچھ آیتیں محکم ہیں، وہ کتاب کی اصل ہیں۔ اور دوسری آیتیں متشابہ ہیں۔ پس جن کے دلوں میں ٹیڑھ ہے وہ متشابہ آیتوں کے پیچھے پڑ جاتے ہیں، فتنہ کی تلاش میں اور اس کی تاویل کی تلاش میں۔ حالاں کہ ان کی تاویل اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اور جو لوگ پختہ علم والے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم ان پر ایمان لائے، سب ہمارے رب کی طرف سے ہے۔ اور نصیحت وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو عقل والے ہیں (3:7)۔

یہ آیت بتاتی ہے کہ غلط قسم کا غور وفکر کیا ہے۔ اور وہ کون سا غور وفکر ہے جو آدمی کو ہدایت کی طرف لے جانے والا ہے۔ اس آیت میں متشابہات سے مراد متماثلات ہے۔ یعنی تمثیلی اسلوب کلام۔ وہ باتیں جن کا تعلق غیبی حقیقتوں سے ہے ان کو قرآن میں تمثیل کی زبان

میں بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً خدا کا ہاتھ تمثیل کی زبان ہے نہ کہ حقیقت کی زبان۔ اس طرح کی باتوں کو آدمی تعیین وتحدید کے ساتھ نہیں سمجھ سکتا۔ اس لیے ان معاملات میں صحیح یہ ہے کہ مجمل علم پر قناعت کی جائے۔ اس سے زیادہ جاننے کی کوشش آدمی کو صرف فکری انتشار (confusion) تک پہنچائے گی۔ اور فکری انتشار ہی کے اگلے نتیجہ کا نام گمراہی ہے۔

محکم سے مراد وہ آیتیں ہیں جو براہ راست زبان میں ہیں اور جن سے قطعی دلالت حاصل ہوتی ہے۔ یہ معلوم انسانی دائرہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان میں سنجیدہ غور وفکر سے آدمی کے علم ویقین میں اضافہ ہوتا ہے۔ وہ ہدایت کے راستہ پر بڑھتا چلا جاتا ہے۔

مثال کے طور پر جبر وقدر کا جو مسئلہ ہے وہ پورا کا پورا متشابہات سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے بارے میں مجمل علم پر قانع رہنا ہی عقل کا تقاضا بھی ہے اور شریعت کا تقاضا بھی۔ اور یہی عین سائنسی نقطۂ ہے۔

دوسری چیز وہ ہے جو عالم فطرت سے تعلق رکھتی ہے۔ یعنی زمین وآسمان میں پھیلی ہوئی نشانیوں پر غور کرنا۔ یہ غور وفکر عین مطلوب ہے۔ اس قسم کا غور وفکر آدمی کے یقین کو بڑھاتا ہے۔ اس کی روحانیت کو غذا فراہم کرتا ہے۔ اس کی شخصیت کو ربانی شخصیت بناتا ہے۔ اس کو وہ اعلیٰ انسان بنا دیتا ہے جس کو عام زبان میں حقیقت شناس اور مذہبی زبان میں خدا شناس کہا جاتا ہے۔

اختلاف رائے

مولانا محمود حسن دیوبندی (1851-1920) تحریک خلافت کے پرجوش حامیوں میں سے تھے۔ ان کے شاگرد مولانا اشرف علی تھانوی (1863-1943) تحریک خلافت کے مخالف تھے۔ وہ اس تحریک پر کھلم کھلا تنقید کرتے تھے۔ مگر استاد نے اپنے شاگرد کی اس

" گستاخی" کو کبھی برا نہیں مانا۔ دونوں کے درمیان آخر وقت تک مخلصانہ تعلق باقی رہا۔

مولانا اشرف علی تھانوی ایک گفتگو کے ذیل میں اپنے استاد اور شیخ کے بارے میں کہتے ہیں: "حضرت کے قلب پر میرے اختلاف سے ذرہ برابر بھی گرانی نہ تھی۔ ایک مرتبہ تحریک خلافت کے زمانہ میں حضرت کی بیٹھک میں کچھ لوگ بیٹھے ہوئے میرے متعلق برے بھلے الفاظ کہہ رہے تھے۔ کچھ الفاظ حضرت کے کانوں میں پڑ گئے۔ باہر تشریف لے آئے۔ بہت خفا ہوئے اور یہ فرمایا کہ خبردار، جو آئندہ ایسے الفاظ کبھی استعمال کئے۔ اور یہ فرمایا کہ میرے پاس کیا وحی آتی ہے کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں وہ سب ٹھیک ہے۔ میری بھی ایک رائے ہے، اس کی بھی ایک رائے ہے۔ ایک مرتبہ حضرت نے یہ فرمایا کہ ہمیں تو اس پر فخر ہے کہ جو شخص تمام ہندستان سے بھی متاثر نہ ہوا اور کسی کی بھی پروا نہ کی وہ بھی ہماری ہی جماعت سے ہے۔" (ملفوظات حکیم الامت، مولانا اشرف علی تھانوی، ادارہ تالیفات اشرفیہ، ملتان، صفحہ 114)

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اختلاف کے معاملہ میں علما امت کا طریقہ کیا ہونا چاہئے۔ اس طرح کے اختلافات میں وہی روح کارفرما ہونی چاہئے جس کو امام شافعی نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے: میری رائے درست ہے، مگر احتمالِ خطا کے ساتھ، دوسرے کی رایے غلط ہے مگر احتمال صحت کے ساتھ۔ (رَأْيِي صَوَابٌ يَحْتَمِلُ الْخَطَأَ، وَرَأْيُ غَيْرِي خَطَأٌ يَحْتَمِلُ الصَّوَابَ (یہ اختلافات عام طور پر اجتہادی امور میں ہوتے ہیں اور اجتہادی امور میں ہمیشہ ایک سے زیادہ رائے کی گنجائش ہوتی ہے۔ اس لیے صحیح ترین مسلک یہ ہے کہ آدمی اختلاف کے باوجود اپنے آپ کو فریق ثانی کی نفرت سے بچائے۔ وہ اپنے نقطۂ نظر کو شدت کے ساتھ پیش کرے، اس کے باوجود اس کی نفسیات یہ ہو کہ یہ معاملہ 50 فیصد اور 50 فیصد کا ہے، نہ کہ صد فی صد کا۔

دین انسانیت

اسلام کی اخلاقی اور انسانی تعلیمات

تمہید

لندن کی خاتون رائٹر کارین آرم اسٹرانگ نے مذہب پر ایک درجن سے زیادہ کتابیں لکھی ہیں۔ ان کی تقریباً تین سوصفحہ کی ایک کتاب سیرتِ رسولؐ پر ہے:

Muhammad: A Western Attempt to Understand Islam by Ms Karen Armstrong

Published by *Victor Gollancz Ltd.*, London, 1992.

اس کتاب میں اسلام کا منصفانہ مطالعہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ خاص طور پر اس میں اس پروپیگنڈے کورد کیا گیا ہے کہ اسلام کوئی تشدد پسند مذہب ہے، کتاب کا خاتمہ ان الفاظ پر ہوتا ہے — محمد ایک ایسے مذہب اور ایک ایسے کلچر کے بانی تھے، جس کی بنیاد تلوار پر نہیں تھی۔ مغربی افسانہ کے باوجود، اسلام کا نام امن اور صلح کا مفہوم رکھنے والا ہے:

Muhammad... founded a religion and a cultural tradation that was not based on the sword__despite the Western myth__and whose name 'Islam' signifies peace and reconciliation. (p.266)

جن لوگوں نے بھی منصفانہ انداز میں اسلام کا علمی مطالعہ کیا ہے، ان سب نے اسلام کے بارے میں اسی قسم کی رائے کا اظہار کیا ہے جس کی ایک مثال اوپر نقل کی گئی۔ کسی مسلمان یا کسی مسلم گروہ میں عملی انحراف پایا جا سکتا ہے۔ مگر جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، اس کا معاملہ یہی ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام کی تعلیمات تمام تر امن اور صلح اور انسانیت پر مبنی ہیں۔ اسلام پورے معنی میں امن اور انسانیت کا مذہب ہے۔ خالق کے معاملہ میں اس کا اصولی تصور توحید ہے، اور مخلوق کے معاملہ میں اس کا اصولی تصور انسانیت۔

خدااورانسان

ابومسعود انصاری مدینہ کے ایک مسلمان تھے۔ ایک روز وہ کسی بات پر اپنے غلام سے بگڑ گئے اور اس کو ڈنڈے سے مارنے لگے۔ عین اس وقت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ادھر سے گزر ہوا۔ آپ نے دیکھ کر فرمایا کہ اے ابومسعود، جان لو کہ خدا تمہارے اوپر اس سے زیادہ قابو رکھتا ہے جتنا تم اس غلام پر قابو رکھتے ہو (اعْلَمْ أَبَا مَسْعُودٍ، لَلّٰهُ أَقْدَرُ عَلَيْكَ مِنْكَ عَلَيْهِ) یہ سنتے ہی ابومسعود کے ہاتھ سے ڈنڈا چھوٹ کر گر گیا۔ اور انھوں نے کہا کہ آج سے یہ غلام آزاد ہے۔ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 1659)۔

ابومسعود پہلے معاملہ کو ایک انسان اور دوسرے انسان کا معاملہ سمجھتے تھے۔ اس وقت انھیں نظر آتا تھا کہ وہ مالک ہیں اور دوسرا آدمی غلام۔ اپنی ذات انھیں اونچی سطح پر نظر آئی اور غلام کی ذات نیچی سطح پر۔ مگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تنبیہہ کے بعد انھیں نظر آیا کہ سارا معاملہ خدا کا معاملہ ہے۔ اب انھیں اپنا وجود بھی وہیں پڑا ہوا نظر آیا جہاں وہ اپنے غلام کو بٹھائے ہوئے تھے۔ دونوں یکساں طور پر خدا کے آگے عاجز نظر آئے۔ یہی وجہ تھی کہ اٹھا ہوا ڈنڈا ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔

حقیقت یہ ہے کہ سماجی زندگی کی تمام خرابیاں اسی لیے پیدا ہوتی ہیں کہ آدمی معاملہ کو انسان کی نسبت سے دیکھتا ہے نہ کہ خدا کی نسبت سے۔ ایک آدمی کو دولت مل جائے تو وہ ان لوگوں کے مقابلہ میں اپنے کو اونچا سمجھنے لگتا ہے جن کے پاس دولت نہیں۔ حالانکہ اگر وہ خدا کی نسبت سے دیکھے تو اس کو نظر آئے گا کہ وہ بھی اتنا ہی مفلس ہے جتنا کوئی دوسرا شخص۔ کسی آدمی کو بڑا عہدہ مل جائے تو وہ سمجھنے لگتا ہے کہ میں تمام لوگوں سے بڑا ہوں۔ حالانکہ اگر وہ خدا کی نسبت سے دیکھے تو وہ پائے گا کہ وہ بھی اتنا ہی حقیر ہے جتنا کہ دوسرے لوگ۔ ایک آدمی تیز ہے اور وہ دوسرے آدمی کے خلاف زبان چلا رہا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ اپنے مقابلہ

میں وہ اس کو کمتر سمجھ رہا ہے۔ اگر وہ خدا کی نسبت سے دیکھے تو اس کے الفاظ کا ذخیرہ ختم ہو جائے کیونکہ خدا کی نسبت سے وہ بھی اتنا ہی بے زور ہے جتنا کہ دوسرا آدمی۔

اسلام وہ انسان بناتا ہے جو معاملات کو ایک آدمی اور دوسرے آدمی کا معاملہ نہ سمجھے۔ بلکہ ہر معاملہ کو ایسا معاملہ سمجھے جو آخر کار خدا کے سامنے پیش ہونے والا ہے۔ یہ چیز تمام برائیوں کی جڑ کاٹ دیتی ہے۔ اس کے بعد کسی کے لیے گھمنڈ، حسد، جاہ پسندی اور بے انصافی کا موقع ہی باقی نہیں رہتا۔ اس کے بعد اس کا "ڈنڈا" اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑتا ہے، بجائے اس کے کہ وہ کسی دوسرے آدمی کے سر کے اوپر پڑے۔

عبادت اور خدمت

اسلام کی عبادتیں اصلاً خدا کی یاد اور خدا کی پرستش کے لیے ہیں۔ تاہم ان کا نظام اس طرح بنایا گیا ہے کہ وہ انسانیت کی تعمیر کا ذریعہ بھی بن گئی ہیں۔ اہل اسلام ان عبادتوں کی ادائیگی کے دوران خدا کا حق ادا کرتے ہوئے بندوں کا حق ادا کرنے کی تربیت بھی حاصل کرتے رہتے ہیں۔

نماز خدا کے لیے ذکر و دعا کے ساتھ بندوں کے درمیان مساوات کا ذریعہ بھی بن گئی ہے۔ نماز باجماعت میں روزانہ پانچ بار تمام مسلمان ایک ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر مراسم عبادت ادا کرتے ہیں۔ چھوٹا اور بڑا، امیر اور غریب، بے اقتدار، عالم اور غیر عالم، سب کے سب ایک فرش پر اور ایک صف میں اس طرح کھڑے ہو جاتے ہیں کہ ایک اور دوسرے میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ اس طرح نماز کی عبادت عین اسی وقت مساوات انسانی کا عظیم سبق بھی بن گئی ہے۔

روزہ کے مہینہ میں ہر آدمی صبح سے شام تک مکمل طور پر بھوکا رہتا ہے۔ خواہ وہ کتنا ہی دولت مند ہو مگر روزہ میں اس کو بھی اسی طرح بھوکا رہنا ہے جس طرح کوئی عام آدمی۔ اس طرح روزہ رکھ کر ایک مسلمان جہاں خدا کی عبادت کرتا ہے وہیں وہ ضرورت مند انسانوں کی ضرورت کا بھی ذاتی تجربہ کرتا ہے۔ روزہ آدمی کو خدا کا عبادت گزار بنانے کے ساتھ انسانوں کا غم گسار بھی بنا دیتا ہے۔

زکوٰۃ کی نوعیت بھی واضح طور پر یہی ہے۔ زکوٰۃ کا اصل مقصد مالی عبادت ہے۔ زکوٰۃ میں آدمی یہ کرتا ہے کہ وہ خدا کے نام پر اپنی کمائی کا ایک حصہ نکال کر اسے غریبوں اور حاجت مندوں کو دیتا ہے۔ اس طرح زکوٰۃ بیک وقت خدا کی عبادت بھی ہے اور اسی کے ساتھ بندوں کی خدمت گزاری بھی۔ زکوٰۃ کی رقم نکال کر ایک طرف آدمی خدا کے معطی ہونے کا اعتراف کرتا ہے اور دوسری طرف بندوں کے سلسلہ میں وہ اپنی ذمہ داریوں کے احساس کو پختہ کرتا ہے۔

حج بھی اصلاً ایک عبادت ہے۔ مگر حج کے سفر میں حاجیوں کو لڑنے جھگڑنے سے روک دیا گیا ہے (البقرۃ، 2:197)۔ حج میں طرح طرح کے لوگوں سے سابقہ پیش آتا ہے۔ لیکن حاجی اس احساس کے تحت لڑائی سے بچتا ہے کہ میرا حج کہیں باطل نہ ہو جائے۔ اس طرح حج خدا کی عبادت کے ساتھ بندوں کے درمیان پر امن زندگی گزارنے کی سالانہ تربیت بھی بن جاتا ہے۔

والدین کے ساتھ

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اور ہم نے انسان کو تاکید کی کہ وہ اپنے باپ اور ماں کے ساتھ نیک سلوک کرے: وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْناً (29:8)۔ قرآن میں کئی مقامات پر اس طرح کی آیتیں ہیں جن میں یہ تاکیدی حکم دیا گیا ہے کہ انسان کو

چاہیے کہ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ بہتر سے بہتر سلوک کرے۔ ان کے تمام حقوق ادا کرے۔حتیٰ کہ اگر وہ اپنی اولاد کو جھڑکیں تب بھی اولاد کو چاہیے کہ وہ ان کی سخت کلامی کا برا اثر نہ لے اور ان کی محبت اور خدمت میں کوئی کمی ہرگز نہ کرے۔ وہ یک طرفہ طور پر ان کے ساتھ حسن سلوک کا پابند رہے۔

حدیث میں ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔اس نے کہا کہ اے خدا کے رسولؐ، میرے لیے حسن صحبت کا تمام لوگوں میں سب سے زیادہ حق دار کون ہے۔آپ نے فرمایا کہ تمہاری ماں۔ اس نے کہا کہ اس کے بعد کون۔آپ نے فرمایاں کہ تمہاری ماں۔ اس نے کہا کہ اس کے بعد کون۔ آپ نے فرمایا کہ تمہاری ماں۔ اس نے کہا کہ اس کے بعد کون۔آپ نے فرمایا کہ پھر تمہارا باپ: جَاءَ رَجُلٌ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ صلى الله عليه وسلم؛ فَقَالَ: مَنْ أَحَقُّ النَّاسِ بِحُسْنِ صَحَابَتِي؟ قَالَ: أُمُّكَ. قَالَ: ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ: ثُمَّ أُمُّكَ. قَالَ: ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ: ثُمَّ أُمُّكَ. قَالَ: ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ: ثُمَّ أَبُوكَ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 2548)۔

اس طرح کی بہت سی حدیثیں ہیں جو بتاتی ہیں کہ خدا کے بعد انسان کے اوپر سب سے زیادہ حق ماں اور باپ کا ہے۔ اس کا ایک پہلو یہ ہے کہ کسی انسان پر اس دنیا میں سب سے زیادہ احسان ماں اور باپ کا ہوتا ہے۔ اس لیے ہر انسان پر لازم ہے کہ بڑا ہونے کے بعد وہ ہر طرح اپنے والدین کی خدمت کرے۔ وہ ان کے بڑھاپے میں اسی طرح ان کے کام آئے جس طرح اس کے بچپن میں اس کے والدین اس کے کام آئے تھے۔

دوسرا پہلو یہ کہ آدمی اپنے ماں باپ کی خدمت کر کے اپنے آپ کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ وسیع تر انسانیت کا خدمت گزار بن سکے۔ وہ تمام انسانوں کو محبت کی نظر سے دیکھے۔ وہ تمام انسانوں کی عزت کرنا سیکھے۔ وہ تمام انسانوں کے حقوق ادا کرنے والا بن جائے۔

عمل صالح

قرآن میں بار بار عمل صالح کا حکم دیا گیا ہے۔ مثلاً سورہ النحل میں فرمایا کہ جو شخص صالح عمل کرے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت تو ہم اس کو زندگی دیں گے، ایک اچھی زندگی۔ اور جو کچھ وہ کرتے رہے اس کا ہم ان کو بہترین بدلہ دیں گے: مَنْ عَمِلَ صالِحاً مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهُ حَياةً طَيِّبَةً وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ ما كانُوا يَعْمَلُونَ (16:97)۔

صالح کا مطلب ہے درست، نیک، ٹھیک۔ عربی میں کہا جاتا ہے: ھُو صالح بکذا۔ یعنی اس کے اندر یہ صلاحیت ہے کہ فلاں کام کو عمدگی کے ساتھ کر سکے۔ صلح فی عملہ کا مطلب ہوتا ہے کام میں درست ہونا۔ صلاح دراصل فساد کا ضد ہے۔ ہر عمل جو غلط ہو وہ عملِ فاسد ہے۔ اسی طرح ہر عمل جو صحیح اور درست ہو وہ عملِ صالح ہے۔

عملِ صالح کا تعلق انسانی زندگی کے تمام معاملات سے ہے۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ آدمی لوگوں کے ساتھ موجودہ دنیا میں اس طرح رہے کہ اس کا ہر عمل صالح عمل ہو۔ گھر سے لے کر باہر تک اس کا کوئی بھی عمل صالح روش سے ہٹا ہوا نہ ہو۔ اس اعتبار سے پوری شریعت عمل صالح کی شریعت ہے۔ شریعت اسلامی کے تمام احکام دراصل یہ بتانے کے لیے ہیں کہ کس معاملے میں کون سی روش صالح روش ہے، اور کون سی روش صالح روش نہیں۔

مثلاً سچ صالح قول ہے اور جھوٹ غیر صالح قول۔ انصاف صالح عمل ہے اور ظلم غیر صالح عمل۔ محبت صالح کیفیت ہے اور نفرت غیر صالح کیفیت۔ امن صالح حالت ہے اور بدامنی غیر صالح حالت۔ خیر خواہی ہی صالح جذبہ ہے اور بدخواہی غیر صالح جذبہ۔ امانت داری صالح فعل ہے اور خیانت غیر صالح فعل۔ حقوق کی ادائیگی صالح روش ہے اور حق تلفی غیر صالح روش، وغیرہ۔

خدا کا پسندیدہ عمل وہی ہے جو صالح عمل ہو، ایسے ہی لوگوں کے لیے خدا کا انعام ہے۔ جو عمل غیر صالح ہو وہ خدا کا مقبول اور پسندیدہ عمل نہیں۔ اس دنیا میں صرف صالح بیج اگتا ہے اور سرسبز وشاداب ہوتا ہے۔ اسی طرح اس دنیا میں صرف صالح انسان ترقی کرتا ہے۔ غیر صالح انسان کے لیے خدا کی اس دنیا میں نہ کوئی ترقی ہے اور نہ کوئی کامیابی۔

صبر کی تعلیم

ایک مغربی مبصر ولیم پیٹن (William Paton) نے لکھا ہے کہ اسلام کا ایک پھل انسانیت کے لیے یہ رہا ہے کہ اس نے لوگوں میں شدید اور مستقل صبر پیدا کیا۔ صبر کی یہ کیفیت ان میں اللہ کی کامل اطاعت سے پیدا ہوئی:

> One of the fruits of Islam has been that stubborn, durable patience which comes of the submission to the absolute will of Allah.

یہ تبصرہ نہایت درست ہے۔ اسلام میں صبر کی بے حد اہمیت ہے۔ قرآن کی بیشتر آیتیں، براہ راست یا بالواسطہ طور پر، صبر ہی سے متعلق ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ صبر کی صفت ایک ایسی صفت ہے جس کے بغیر ایمان واسلام کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔

موجودہ دنیا اس ڈھنگ پر بنی ہے کہ یہاں بار بار آدمی کو ناخوشگوار تجربات سے سابقہ پیش آتا ہے، گھر کے اندر بھی اور گھر کے باہر بھی۔ اب اگر آدمی ہر ایسے موقع پر لوگوں سے الجھ جائے تو وہ انسانی ترقی کی طرف زیادہ آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اس لیے اسلام میں صبر کی بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے۔ تاکہ آدمی ناخوش گواریوں کو نظر انداز کرتے ہوئے مقصد اعلیٰ کی طرف اپنے سفر کو جاری رکھ سکے۔

قرآن میں بار بار صبر کی تاکید کی گئی ہے۔ مثلاً فرمایا کہ جو مصیبتیں تمہارے اوپر پڑیں ان پر صبر کرو (31:17)۔ صبر کرو، اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے (8:46)۔ فرمایا کہ گھاٹے سے محفوظ رہنے والے لوگ وہ ہیں جو ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کریں اور ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کریں (103:2-3)۔

اسی طرح حدیث میں کثرت سے صبر کی اہمیت بتائی گئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسْمَعُوا وَأَطِيعُوا وَاصْبِرُوا (مسند احمد، حدیث نمبر 8005) یعنی سنو اور مانو اور صبر کرو۔ آپ نے فرمایا: أَمَرَ اللَّهُ عز وجل بِالصَّبْرِ وَالْعَفْوِ (سنن ابی داؤد، حدیث نمبر 3000)۔ یعنی اللہ نے صبر اور عفو و درگزر کا حکم دیا ہے۔ ایک صحابی کہتے ہیں: كَانَ النَّبِيُّ صلى الله عليه وسلم وَأَصْحَابُهُ —يَصْبِرُونَ عَلَى الْأَذَى (صحیح البخاری، حدیث نمبر 4566)۔ یعنی، رسول اور اصحاب رسول ہمیشہ ایذاؤں پر صبر کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ صبر اسلامی عمل کی بنیاد ہے۔ فتنوں اور آزمائشوں کی اس دنیا میں صبر کے بغیر کوئی آدمی اسلامی کردار پر قائم نہیں رہ سکتا۔

روحانی ترقی

اسلام کا اصل نشانہ روحانی ترقی ہے۔ انسان کی روحانیت جاگے، انسان کے اندر چھپی ہوئی ربّانیت بیدار ہو، یہ اسلام کا اصل مقصود ہے۔ قرآن میں اس کو تطہیر اور تزکیہ (التوبۃ، 9:102) کہا گیا ہے۔

اصل یہ ہے کہ ہر انسان پیدائش سے فطرتِ صحیح لے کر پیدا ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے ہر انسان اپنی ابتدائی شخصیت کے اعتبار سے پاک صاف ہی ہوتا ہے۔ مگر دنیا میں زندگی

گزارتے ہوئے اس پر خارجی غبار چھا جاتے ہیں۔ اس خارجی غبار سے پاک کرنا اور اپنے آپ کو دوبارہ اپنی فطری حالت پر لے جانا، یہی تطہیر اور تزکیہ ہے۔

تطہیر اور تزکیہ کا یہ عمل آدمی کو خود کرنا پڑتا ہے۔ ایک چھوٹا بچہ اپنے آپ ہی طاہر اور پاک ہوتا ہے۔ مگر اس کی یہ حالت کسی ذاتی کوشش کی بنا پر نہیں ہوتی، بلکہ فطرت کی تخلیق کی بنا پر ہوتی ہے۔ بڑا ہونے کے بعد جب آدمی اپنے آپ کو روحانی اعتبار سے طاہر اور پاک صاف بناتا ہے تو یہ اس کا اپنا عمل ہوتا ہے۔ یہ شعوری طور پر خود اپنے ارادہ اور اپنی کوشش سے اپنے آپ کو روحانی ترقی کے درجہ تک پہنچانا ہے۔ یہی خود حاصل کردہ روحانی ترقی وہ اصل چیز ہے جو اسلام میں مطلوب ہے۔ اسی کو قرآن میں قلب سلیم کہا گیا ہے (26:89)۔

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرماتے ہوئے کہا: اللَّهُمَّ اجْعَلْ فِي قَلْبِي نُورًا (صحیح البخاری، حدیث نمبر 6316)۔ یعنی اے اللہ، میرے دل میں نور ڈال دے۔ اسی طرح آپ نے ایک شخص کے بارے میں دعا کرتے ہوئے فرمایا: اللهُمَّ اغْفِرْ ذَنْبَهُ، وَطَهِّرْ قَلْبَهُ (مسند احمد، حدیث نمبر 22211)۔ یعنی، اے اللہ، اس کے گناہ کو بخش دے، اور اس کے قلب کو پاک کر دے۔ اسی طرح موطا الامام مالک میں حضرت لقمان کا ایک قول اس طرح نقل کیا گیا ہے کہ اللہ دل کو حکمت کے نور سے اسی طرح زندہ کرتا ہے جس طرح وہ مُردہ زمین کو بارش سے زندہ کرتا ہے: إِنَّ اللّٰهَ تبارك وتعالى يُحْيِي الْقُلُوبَ بِنُورِ الْحِكْمَةِ، كَمَا يُحْيِي الأَرْضَ الْمَيْتَةَ بِوَابِلِ السَّمَاءِ (الموطا، اثر نمبر 2117)۔

یہی روحانی ترقی ہے، اور روحانی ترقی ہی اسلام کا اصل مقصود ہے۔ جو آدمی روحانی ترقی سے محروم ہو وہ یقینی طور پر اسلام سے بھی محروم ہوگا۔

اعلیٰ اخلاق

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے جس اخلاق کی تعلیم دی تھی اور جس کو آپ نے اپنی زندگی میں پوری طرح اپنا لیا، اس کا تذکرہ قرآن میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے— اور بے شک تم ایک اعلیٰ اخلاق پر ہو: وَإِنَّكَ لَعَلى خُلُقٍ عَظِيمٍ (68:4)۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبر اسلام نہ صرف اخلاق پر تھے بلکہ وہ اعلیٰ اخلاق کا نمونہ تھے۔ اخلاق اگر سادہ قسم کے اخلاق کا نام ہے تو اعلیٰ اخلاق سے مراد وہ اخلاق ہے جب کہ آدمی دوسروں کے رویہ سے بلند ہو کر عمل کرے۔ اس کا طریقہ یہ نہ ہو کہ برائی کرنے والوں کے ساتھ برائی اور بھلائی کرنے والوں کے ساتھ بھلائی۔ بلکہ وہ ہر ایک کے ساتھ بھلائی کرے، خواہ دوسرے اس کے ساتھ برائی ہی کیوں نہ کر رہے ہوں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اخلاق کے اسی اعلیٰ معیار پر تھے۔ اس طرح آپ نے خود نمونہ بن کر لوگوں کو عملی طور پر بتایا کہ وہ کس طرح اپنی زندگی کو حقیقی معنوں میں بااخلاق بنائیں۔ اس قسم کا کردار کسی شخص کے بارے میں یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ ایک بااصول انسان ہے۔ ایسے آدمی کی شخصیت حالات کی پیداوار نہیں ہوتی بلکہ خود اپنے اعلیٰ اصولوں کی پیداوار ہوتی ہے۔ ایسا اخلاق کسی آدمی کے بارے میں اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ وہ سچا انسان ہے، وہ فطرت کے راستہ پر قائم ہے۔

حدیث میں کثرت سے حسن اخلاق کی تعلیم دی گئی ہے۔ ایک حدیث میں آپ نے فرمایا کہ میں اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ اچھے اخلاق کی تکمیل کروں: إِنَّمَا بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْأَخْلَاقِ (مسند الشہاب القضاعی، حدیث نمبر 1165)۔ اسی طرح آپ نے فرمایا کہ سب سے زیادہ کامل ایمان اس کا ہے جس کا اخلاق سب سے زیادہ اچھا ہو: أَكْمَلُ الْمُؤْمِنِينَ

إِيمَانًا أَحْسَنُهُمْ خُلُقًا (سنن ابی داؤد، حدیث نمبر 4682)۔آپ نے فرمایا کہ قیامت کے دن میزان میں سب سے افضل چیزاچھا اخلاق ہوگا: إِنَّ أَفْضَلَ شَيْءٍ فِي الْمِيزَانِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ الْخُلُقُ الْحَسَنُ (مسند احمد، حدیث نمبر 27496)۔

مومن خدائی بلندیوں میں جینے والا انسان ہوتا ہے۔ اس لیے ہر حال میں وہ ایک بلند کردار انسان بنا رہتا ہے۔ اس کی بلند فکری کسی حال میں ختم نہیں ہوتی، کوئی بھی صورت حال اس کی بلند کرداری کو ختم کرنے والی ثابت نہیں ہوتی۔

اچھا گمان

مدینہ میں ایک بار ایک معاملہ میں باہمی بدگمانی کا واقعہ پیش آیا، اس موقع پر قرآن میں یہ حکم اترا کہ جب تم لوگوں نے اس بات کو سنا تو مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں نے ایک دوسرے کی بابت نیک گمان کیوں نہیں کیا، اور کیوں نہ کہا کہ یہ کھلا ہوا بہتان ہے (24:12)۔

اس سے معلوم ہوا کہ اسلام چاہتا ہے کہ معاشرہ کے اندر خوش گمانی کی فضا ہو۔ لوگ کسی کے خلاف کوئی بات سنیں تو نہ صرف یہ کہ اس کو بیان نہ کریں بلکہ دل میں بھی اس پر یقین نہ کریں۔ وہ اپنے ذہن کو ہمیشہ اچھے خیالات سے آباد کریں۔

قرآن کی ایک اور آیت میں فرمایا کہ تم لوگ بہت سے گمانوں سے بچو، کیونکہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں (49:12)۔ سماج میں اختلاف اور تفریق کی برائیاں ہمیشہ کسی بدگمانی سے شروع ہوتی ہیں۔ اگر بدگمانی کو شروع ہی میں ختم کر دیا جائے تو باہمی تعلقات بگڑنے کی نوبت ہی نہ آئے۔ اور سماج کے اندر خوشگوار انسانی ماحول مسلسل باقی رہے۔ گمان سے بچنا گویا فتنہ کو اس کے آغاز ہی میں کچل دینا ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: إِيَّاكُمْ وَالظَّنَّ فَإِنَّ الظَّنَّ أَكْذَبُ الْحَدِيثِ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 2563)۔ یعنی، تم لوگ بدگمانی سے بچو، کیوں کہ بدگمانی سب سے زیادہ جھوٹی بات ہے۔

اس طرح کی بہت سی حدیثیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس بارے میں اسلام کا حکم اور اس کا تقاضا کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ لوگ ایک دوسرے کے بارے میں اپنے دل کو صاف رکھیں۔ اگر کسی کے بارے میں کوئی غلط بات کہی جائے تو محض سننے کی بنیاد پر ہرگز اس کو نہ مانیں۔ یا تو اس کو خوش گمانی پر محمول کرتے ہوئے اپنے ذہن سے نکال دیں۔ اور اگر کسی وجہ سے اس کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنا ضروری ہو تو معاملہ کی پوری تحقیق کریں۔ مکمل تحقیق کے بغیر نہ کوئی رائے بنائیں اور نہ اس کی بنیاد پر کوئی اقدام کریں۔

اسلام کا مطلوب انسان وہ ہے جو دوسروں کے بارے میں اچھی رائے رکھے۔ جس کا سینہ دوسروں کے بارے میں خوش گمانیوں سے بھرا ہوا ہو۔

تواضع

اسلام کی ایک تعلیم تواضع ہے۔ قرآن میں سورہ لقمان میں فرمایا کہ لوگوں سے بے رخی نہ کرو اور زمین میں اکڑ کر نہ چلو۔ بے شک اللہ کسی اکڑنے والے اور فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔ اور اپنی چال میں میانہ روی اختیار کرو اور اپنی آواز کو پست رکھو۔ بے شک سب سے بری آواز گدھے کی آواز ہے (31:18-19)۔

انسان کا حسن اکڑنے میں نہیں ہے بلکہ جھکنے میں ہے۔ انسان کو فخر زیب نہیں دیتا

بلکہ تواضع کی روش اسے زیب دیتی ہے۔ انسان کا کمال یہ نہیں ہے کہ وہ شور والی آوازیں نکالے، انسان کا کمال یہ ہے کہ اس کی بول میں نرمی کی صفت پیدا ہو جائے۔ اکڑ کا انداز غیر سنجیدگی کی علامت ہے۔ اسلام آدمی کو آخری حد تک سنجیدہ بناتا ہے۔ اس لیے ایک شخص جب پورے معنی میں مسلم بنتا ہے تو وہ پورے معنی میں متواضع بھی بن جاتا ہے۔ تواضع خلاصۂ انسانیت ہے، اور اسی کے ساتھ وہ خلاصۂ اسلام بھی ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

إِنَّ اللّٰهَ أَوْحَى إِلَيَّ أَنْ تَوَاضَعُوا حَتَّى لَا يَبْغِيَ أَحَدٌ عَلَى أَحَدٍ، وَلَا يَفْخَرَ أَحَدٌ عَلَى أَحَدٍ (سنن ابی داؤد، حدیث نمبر 4895)۔ یعنی، اللہ تعالیٰ نے میری طرف یہ وحی بھیجی کہ تم لوگ تواضع کی روش اختیار کرو، یہاں تک کہ کوئی شخص کسی کے اوپر دراز دستی نہ کرے، کوئی شخص کسی کے اوپر فخر نہ کرے۔

اسلام یہ تصور دیتا ہے کہ بڑا صرف ایک خدا ہے، اس کے سوا جو انسان ہیں وہ سب کے سب یکساں طور پر اس کے بندے ہیں۔ یہ عقیدہ جب صحیح طور پر دلوں میں بیٹھ جاتا ہے تو وہ اپنے آپ تواضع کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ خدا کو اپنا بڑا بنانے والے انسان کے اندر جو صفت پیدا ہوتی ہے، اس کا دوسرا نام تواضع ہے۔

تواضع انسانیت کا زیور ہے۔ جس سماج کے افراد میں تواضع کی صفت ہو، اس سماج میں دوسری تمام خوبیاں اپنے آپ پیدا ہو جائیں گی۔ تواضع والا آدمی اپنی فطرت پر ہوتا ہے اور غیر متواضع آدمی اپنی فطرت سے ہٹ جاتا ہے، تواضع آدمی کو حقیقت پسند بناتی ہے۔ جس آدمی کے اندر تواضع نہ ہو اس کے اندر حقیقت پسندی بھی نہیں ہو گی۔ وہ بظاہر انسان ہو گا مگر حقیقتاً غیر انسان۔

نرمی کا انداز

اسلام کی تعلیمات کو اپنانے کے بعد آدمی کے اندر جو مزاج بنتا ہے وہ نرمی اور رفق کا مزاج ہے۔ اسلام میں وہ اس حقیقت کو دریافت کرتا ہے کہ خدا بڑا ہے (اللہ اکبر) یہ دریافت اس کو بتاتی ہے کہ بڑائی تو صرف خدا کے لیے ہے، میرے لیے بڑائی نہیں۔ اس طرح اپنے آپ اس کے اندر انکسار اور فروتنی کا مزاج پیدا ہو جاتا ہے۔

تاہم نرمی کے سلوک پر قائم رہنے کی لازمی شرط یہ ہے کہ آدمی کے اندر بے پناہ حد تک برداشت کا مزاج ہو۔ موجودہ دنیا میں بار بار دوسروں کی طرف سے ناخوش گواری کا تجربہ ہوتا ہے۔ اس لیے نرمی کے سلوک پر وہی شخص قائم رہ سکتا ہے جو ردعمل کی نفسیات سے اپنے آپ کو بچا سکے۔ اسی لیے قرآن میں خدا پرست انسان کی یہ صفت بیان کی گئی ہے کہ — غصہ کو پی جانے والے اور لوگوں کو معاف کرنے والے: وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ (3:134)۔

بخاری اور مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نرم ہے اور ہر معاملہ میں نرمی کو پسند کرتا ہے: إِنَّ اللَّهَ رَفِيقٌ يُحِبُّ الرِّفْقَ فِي الْأَمْرِ كُلِّهِ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 6927)۔

اسی طرح آپ نے فرمایا: إِنَّ اللَّهَ رَفِيقٌ يُحِبُّ الرِّفْقَ، وَيُعْطِي عَلَى الرِّفْقِ مَا لَا يُعْطِي عَلَى الْعُنْفِ، وَمَا لَا يُعْطِي عَلَى مَا سِوَاهُ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 2593)۔ یعنی، اللہ نرم ہے اور نرمی کو پسند کرتا ہے۔ وہ نرمی پر وہ چیز دیتا ہے جو سختی پر نہیں دیتا اور نہ کسی دوسری چیز پر۔ اسی طرح ایک اور حدیث میں ہے کہ: مَنْ يُحْرَمِ الرِّفْقَ يُحْرَمِ الْخَيْرَ كُلَّهُ (سنن ابی داؤد، حدیث نمبر 4809)۔ یعنی، جو شخص نرمی سے محروم ہو وہ تمام بھلائیوں سے محروم ہو جائے گا۔

اگر آپ لوگوں سے معاملہ کرتے ہوئے اکڑ سے کام لیں تو آپ لوگوں کی اَنا کو جگائیں گے۔ اس طرح مسئلہ بڑھے گا۔ پہلے اگر آپ کو کڑوے بول سے سابقہ پیش آیا تھا تو اب آپ لوگوں کے پتھر کو سہنے کے لیے مجبور کر دیے جائیں گے۔ اس کے بجائے اگر آپ معاملات میں نرمی والا طریقہ اختیار کریں تو آپ کا یہ سلوک لوگوں کے ضمیر کو جگائے گا۔ اب معاملہ برعکس ہو گا۔ پہلے اگر کوئی شخص آپ کا مخالف بنا ہوا تھا تو اب وہ مخالفت کو بھول کر آپ کا قریبی دوست بن جائے گا۔ نرمی کامیاب انسان کی صفت ہے اور اکڑنا کامیاب انسان کی صفت۔

قناعت

انسان کی ایک اہم اخلاقی صفت وہ ہے جس کو قناعت کہا جاتا ہے۔ بہتر سماج کی تعمیر کے لیے ضروری ہے کہ افراد کے اندر قناعت کا مزاج موجود ہو۔ جس سماج کے افراد میں قناعت کا مزاج پایا جائے اس سماج میں ایک دوسرے کے درمیان محبت کی فضا ہو گی۔ اور جس سماج کے افراد میں یہ مزاج نہ پایا جائے وہ یقینی طور پر باہمی محبت کی فضا سے خالی ہو گا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس شخص نے فلاح پائی جس نے اسلام کو قبول کیا اور جس کو بقدر ضرورت رزق دیا گیا۔ اور وہ اللہ کے دیے پر قانع ہو گیا: قَدْ أَفْلَحَ مَنْ أَسْلَمَ، وَرُزِقَ كَفَافًا، وَقَنَّعَهُ اللَّهُ بِمَا آتَاهُ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 1054)۔

موجودہ دنیا میں کسی انسان کی سب سے بڑی خوش نصیبی یہ ہے کہ وہ اپنے رب کا شاکر بندہ بن کر رہ سکے، اور حقیقی معنوں میں شاکر بندہ وہی بن سکتا ہے جس میں قناعت کا مزاج پایا جائے۔ چنانچہ حدیث میں یہ روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وَكُنْ قَنِعًا، تَكُنْ أَشْكَرَ النَّاسِ (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 4217)۔ یعنی، تم قانع بن جاؤ اور پھر تم سب سے زیادہ شکر کرنے والے بن جاؤ گے۔

قناعت کی روش اختیار کرنے سے آدمی کو قلبی سکون حاصل ہوتا ہے۔ اور قناعت نہ کرنے سے حرص کا مزاج بنتا ہے۔ اور جس آدمی کے اندر حرص کا مزاج آجائے وہ کبھی اور کسی حال میں مطمئن نہیں ہوسکتا۔ وہ ہر حال میں کمی کا شکوہ کرتا رہے گا۔

قناعت آدمی کو ذہنی اطمینان دیتی ہے اور حرص سے آدمی کے اندر ذہنی پراگندگی پیدا ہوتی ہے۔ قناعت فکری بلندی کی طرف لے جاتی ہے اور حرص فکری پستی کی طرف۔ قناعت آدمی کو دوسروں سے محبت کرنے والا بناتی ہے اور حرص دوسروں سے نفرت کرنے والا۔ قناعت روحانی ترقی کا ذریعہ ہے اور حرص روحانی پستی کا ذریعہ۔

قناعت کا مزاج آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ ادنی باتوں سے اوپر اٹھ کر اعلیٰ حقیقتوں میں جی سکے۔ وہ سادہ زندگی اور اونچی سوچ والا انسان بن جائے۔

ایثار

قرآن میں اہل ایمان کی جو صفات بتائی گئی ہیں ان میں سے ایک صفت دوسرے کے مفاد کے لیے اپنے مفاد کو قربان کرنا ہے۔ یعنی اپنی ضرورت پر دوسرے کی ضرورت کو مقدم سمجھنا۔ خود زحمت اٹھا کر دوسرے کی مدد کرنا۔ اپنی ذات پر دوسرے کی ذات کو ترجیح (Preference) دینا۔ اس انسانی صفت کے لیے قرآنی لفظ ایثار ہے۔

ہجرت کے بعد اچانک بہت سے لوگ مکہ سے مدینہ آگئے۔ یہ لوگ بظاہر مدینہ والوں کے اوپر بوجھ تھے۔ کیوں کہ مہاجرین اس وقت بالکل خالی ہاتھ تھے۔ اور مقامی باشندوں (انصار) کے پاس مکان، زمین، باغ وغیرہ تھے۔ مگر اہل مدینہ نے انتہائی خوش دلی کے ساتھ ان نو واردین کا استقبال کیا جو بظاہر ان کی معیشت پر بوجھ بن کر آئے تھے۔ اس کا تذکرہ کرتے ہوئے قرآن میں فرمایا:

اور جولوگ پہلے سے مدینہ میں قرار پکڑے ہوئے ہیں اور ایمان استوار کیے ہوئے ہیں، جوان کے پاس ہجرت کرکے آتا ہے اس سے وہ محبت کرتے ہیں اور وہ اپنے دلوں میں اس سے تنگی نہیں پاتے جو مہاجرین کو دیا جاتا ہے۔ اور وہ ان کو اپنے اوپر مقدم رکھتے ہیں (ایثار کا معاملہ کرتے ہیں) اگرچہ ان کے اوپر فاقہ ہو۔ اور جو اپنے جی کے لالچ سے بچالیا گیا تو وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں (59:9)۔

یہ ایثار ایک اعلیٰ انسانی صفت ہے۔ یہ ایک ایسا معاملہ ہے جو ہر روز ہر آدمی کے ساتھ پیش آتا ہے۔ ہر صبح وشام یہ موقع سامنے آتا ہے جبکہ ایک آدمی محسوس کرتا ہے کہ اسے اپنے آپ کو پیچھے کرکے دوسرے کو آگے بڑھنے کا راستہ دینا چاہیے۔ خود تکلیف اٹھا کر دوسرے کو آرام پہنچانا چاہیے۔ اپنے اخراجات میں کمی کرکے دوسرے کی مدد کرنا چاہیے۔ اپنے وقت کا ایک حصہ نکال کر اس کو دوسرے کی خدمت میں لگانا چاہیے۔ اپنی ذات کو حذف کرکے دوسرے کو اوپر اٹھانا چاہیے۔ خود چپ ہو کر دوسرے کو بولنے کا موقع دینا چاہیے۔ سڑک پر اپنی گاڑی کنارے کرکے دوسرے کو گنجائش دینا چاہیے کہ وہ اپنی منزل کی طرف جاسکے۔

اسی ذاتی قربانی (self-sacrifice) کا نام ایثار ہے۔ یہ ایک اعلیٰ انسانی صفت ہے۔ قرآن کے مطابق، وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں جن کے اندر یہ انسانی صفت پائی جاتی ہو۔

مہربانی کا سلوک

قرآن میں خدا کی صفت الرحمٰن اور الرحیم بتائی گئی ہے۔ یعنی بہت زیادہ مہربان، نہایت رحم والا۔ اسی طرح پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو رحمۃ للعالمین (21:107) کہا گیا

ہے۔یعنی، آپ ساری دنیا کے لیے رحمت بنا کر بھیجے گئے ہیں۔آپ کی سب سے زیادہ نمایاں صفت آپ کا آفاقی رحمت کا حامل ہونا ہے۔

قرآن میں انسان کو یہ خدائی ہدایت دی گئی ہے کہ وہ ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کریں اور ایک دوسرے کو ہمدردی کی نصیحت کریں: وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ (90:17)۔اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر انسان دوسرے انسان کے ساتھ شفقت اور ہمدردی اور مہربانی کا سلوک کرے، حتی کہ اگر دوسروں کی طرف سے زیادتی کا تجربہ ہو تب بھی اس کو برداشت کرتے ہوئے اپنا ہمدردانہ رویہ بدستور پوری طرح باقی رکھے۔ القرطبی نے وَتَواصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ خلق خدا کے ساتھ رحمت کا معاملہ کیا جائے: بِالرَّحْمَةِ عَلَى الْخَلْقِ (الجامع لأحکام القرآن، جلد 20، صفحہ 71)۔

اس سلسلہ میں کثرت سے روایتیں حدیث کی کتابوں میں آئی ہیں۔مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: الرَّاحِمُونَ يَرْحَمُهُمُ الرَّحْمَنُ (سنن ابو داؤد، حدیث نمبر 4941)۔ یعنی، رحم کرنے والوں پر خدائے رحمن رحم فرمائے گا۔اسی طرح آپ نے فرمایا: ارْحَمُوا مَنْ فِي الأَرْضِ يَرْحَمْكُمْ مَنْ فِي السَّمَاءِ (سنن الترمذی، حدیث نمبر 1924)۔یعنی تم زمین والوں پر رحم کرو، آسمان والا تمہارے اوپر رحم کرے گا۔ایک اور حدیث کے الفاظ یہ ہیں: إِنَّمَا يَرْحَمُ اللَّهُ مِنْ عِبَادِهِ الرُّحَمَاءُ۔یعنی اللہ اپنے بندوں میں ان پر رحم کرے گا جو دوسروں پر رحم کرتے ہیں (صحیح البخاری، حدیث نمبر 1284) اسلام کی یہ تعلیم اتنی زیادہ پھیلی کہ وہ پوری دنیا کے مسلم لٹریچر میں شامل ہو گئی۔ ہر زبان میں اس کی گونج سنائی دینے لگی۔ ہندستان کے ایک مسلم شاعر نے کہا:

کرو مہربانی تم اہل زمیں پر   خدا مہرباں ہوگا عرش بریں پر

اس معاملہ کی اہمیت اسلام میں اتنی زیادہ ہے کہ اس کو انتہائی ذاتی مسئلہ کی حیثیت دے دی گئی ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لَا يَرْحَمُ اللّٰهُ مَنْ لَا يَرْحَمُ النَّاسَ۔ یعنی، اللہ اس انسان پر مہربانی نہیں کرے گا جو دسرے لوگوں پر مہربانی نہ کرے (صحیح البخاری، حدیث نمبر 7376)۔

عدل وانصاف

انسانیت کا ایک نہایت اہم تقاضا یہ ہے کہ آدمی لوگوں سے معاملہ کرتے ہوئے عدل و انصاف سے کام لے۔ وہ کسی حال میں بھی ظلم اور بے انصافی کا طریقہ اختیار نہ کرے۔ چنانچہ اسلام میں شدت کے ساتھ عادلانہ رویہ اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ بے شک اللہ حکم دیتا ہے عدل کا اور احسان کا (16:90) دوسری جگہ فرمایا کہ کہو کہ میرے رب نے مجھے قسط کا حکم دیا ہے (7:29) قسط اور عدل کی مادی علامت ترازو ہے۔ جس طرح ترازو کسی چیز کو ٹھیک ٹھیک باٹ کے مطابق تول دیتا ہے۔ اسی طرح آدمی کا قول وعمل بھی ہونا چاہیے۔ آدمی کو چاہیے کہ جب اس کے سامنے کوئی معاملہ پیش آئے تو وہ پوری طرح منصفانہ روش اختیار کرے۔ جب وہ بولے تو اس کا بول حقیقت کے ترازو میں تلا ہوا ہو۔

قرآن میں بار بار حکم دیا گیا ہے کہ اجتماعی معاملات کو ہمیشہ عدل وانصاف کے مطابق طے کرو۔ مثلاً فرمایا کہ جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو (4:58) اسی طرح فرمایا کہ معاملات میں جب بولو تو انصاف کی بات بولو (الانعام، 6:152) اسی طرح

فرمایا کہ نزاعی معاملات پیش آئیں تو فریقین کے درمیان عدل کے ساتھ صلح کراؤ اور ان کے ساتھ ہمیشہ انصاف کرو (الحجرات، 49:9)۔

یہ ایک عمومی حکم ہے۔ خاندان اور سماج میں ہمیشہ اختلافات پیش آتے ہیں۔ ایسے مواقع پر تمام متعلقین کا فرض ہے کہ وہ معاملہ کو انصاف کے مطابق طے کریں۔ کسی فریق کی طرف جھکے بغیر امر واقعہ کے مطابق معاملہ کا فیصلہ کرائیں۔

پھر فرمایا کہ: اے ایمان والو، تم اللہ کے لیے قائم رہنے والے اور انصاف کے ساتھ گواہی دینے والے بنو۔ اور کسی گروہ کی دشمنی تم کو اس پر نہ ابھارے کہ تم انصاف نہ کرو، تم بہر حال انصاف کرو، یہی روش تقویٰ سے زیادہ قریب ہے (المائدہ، 5:8) اس سے معلوم ہوا کہ عدل وانصاف کی اہمیت اتنی زیادہ کہ زیر معاملہ آدمی دشمن ہو تب بھی انصاف کو نہ چھوڑا جائے، تب بھی وہی بات کہی جائے جو عدل وانصاف کے مطابق ہو۔ زمین وآسمان کا نظام سراپا عدل پر قائم ہے۔ یہاں انسان کے لیے بھی وہی روش درست ہے جو عدل وانصاف پر مبنی ہو۔ غیر عادلانہ روش کے لیے اس دنیا میں کوئی جگہ نہیں۔

قصد واعتدال

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ما أَحْسَنَ الْقَصدَ فِي الْغِنَى، وَأَحسَنَ القَصْدَ فِي الفَقْرِ، وَأَحْسَنَ القَصْدَ فِي العِبَادَةِ (مسند البزار، حدیث نمبر 2946)۔ کیا ہی اچھی ہے میانہ روی دولت مندی میں، کیا ہی اچھی ہے میانہ روی مفلسی میں، کیا ہی اچھی ہے میانہ روی عبادت میں۔ ایک اور روایت کے مطابق آپ نے فرمایا: الْقَصْدَ الْقَصْدَ تَبْلُغُوا (صحیح البخاری، حدیث نمبر 6463)۔ یعنی، میانہ روی، میانہ روی، تم منزل پر پہنچ جاؤ گے۔

قرآن میں ہے: سَفَراً قاصِداً (9:42) یعنی، بے مشقت سفر۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ایک صحابی کہتے ہیں: كَانَتْ صَلَاتُهُ قَصْدًا. وَخُطْبَتُهُ قَصْدًا (صحیح مسلم، حدیث نمبر 866)۔ یعنی، آپ کی نماز معتدل ہوتی تھی اور آپ کا خطبہ بھی معتدل ہوتا تھا۔ لسان العرب میں قصد کی تشریح کرتے ہوئے بتایا ہے کہ وہ درمیانی عمل جس میں نہ افراط ہو اور نہ تفریط (لسان العرب، جلد 3، صفحہ 354)۔

مومن کا طریقہ قصد کا طریقہ ہے، انفرادی معاملات میں بھی اور اجتماعی معاملات میں بھی۔ وہ ہمیشہ معتدل انداز اختیار کرتا ہے، خواہ وہ ایک طرح کی صورت حال میں ہو یا دوسری طرح کی صورت حال میں۔

موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ اس لیے یہاں کسی فرد یا قوم کی حالت کبھی یکساں نہیں رہ سکتی۔ یہاں انسان کے لیے کبھی اچھے حالات ہوتے ہیں اور کبھی برے حالات۔ اس کو کبھی پُرسکون ماحول میں رہنا ہوتا ہے اور کبھی اشتعال انگیز ماحول میں۔ وہ لوگوں کے درمیان کبھی طاقتور رہوتا ہے اور کبھی کمزور۔ اس کی زندگی کبھی اپنوں کے درمیان گزرتی ہے اور کبھی غیروں کے درمیان۔ اس کو کبھی دوستوں کے ساتھ سابقہ پیش آتا ہے اور کبھی دشمنوں کے ساتھ۔

مگر ایمان اس کو ایک تھما ہوا انسان بنا دیتا ہے۔ وہ ہر حال میں اعتدال پر قائم رہتا ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے آپ کو اللہ کی رسّی میں باندھے رہتا ہے۔ اہل ایمان اہل اعتدال ہوتے ہیں۔ حالات کا اتار چڑھاؤ ان کے سکون کو برہم نہیں کرتا۔ ان کے خود اپنے مقرر اصول ان کی زندگی کا رخ متعین کرتے ہیں نہ کہ بیرونی اشخاص کے چھیڑے ہوئے مسائل۔

نفع بخشی

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اس دنیا کو اس کے بنانے والے نے اس طرح بنایا ہے کہ یہاں جماؤ اور ٹھہراؤ صرف اس کو ملتا ہے جو نفع بخشی کا ثبوت دے: وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ (13:17)۔ اس دنیا کی ہر چیز اسی اصول پر بنائی گئی ہے۔ اس دنیا میں کوئی چیز صرف اس وقت تک قائم رہتی ہے جب تک وہ دوسروں کے لیے نفع بخش بنی ہوئی ہو۔ جب کوئی چیز اپنی نفع بخشی کھو دے تو اس کے بعد وہ زندگی کا حق بھی کھو دیتی ہے۔ اس کے بعد فطرت کا نظام اس کو غیر مطلوب قرار دے کر اسے باہر پھینک دیتا ہے۔

اسی نظام فطرت کو خدا نے انسان کے لیے بھی پسند کیا ہے (آل عمران، 3:83) خدا کا مطلوب انسان وہ ہے جو اس دنیا میں ایک نفع بخش وجود بن کر رہے۔ جو حقیقی معنوں میں دینے والا بن جائے۔ جس سے دوسروں کو وہ چیز مل رہی ہو جو انھیں اپنی زندگی اور بقا کے لیے درکار ہے۔ ایسا ہی انسان یہ حق رکھتا ہے کہ اس کو انسان کہا جائے۔ ایسا ہی انسان اس کا مستحق ہے کہ اس کے لیے خدا کی اس دنیا میں کامیابی اور ترقی کا فیصلہ کیا جائے۔

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے جو شخص اپنے بھائی کو فائدہ پہنچا سکے تو وہ ضرور اس کو فائدہ پہنچائے: مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمْ أَنْ يَنْفَعَ أَخَاهُ فَلْيَفْعَلْ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 2199)۔

نفع بخش بننے کے لیے اس کی ضرورت نہیں کہ آدمی بہت زیادہ اسباب و وسائل کا مالک ہو۔ ہر آدمی اپنے امکان کے دائرہ میں دوسرے کے لیے نفع بخش بن سکتا ہے۔ مثلاً کسی کے حق میں خیر خواہی کا ایک کلمہ بھی اس کو نفع پہنچانا ہے۔ اسی طرح کسی کو ایک اچھا مشورہ دینا، کسی کا بوجھ اٹھا دینا، کسی کے کام میں اپنی مدد شامل کر دینا، کسی بھٹکے ہوئے کو

راستہ دکھا دینا، بقدر وسعت کسی کی مالی مدد کرنا، راستہ کی رکاوٹوں کو دور کرنا، وغیرہ سب نفع بخشی میں شامل ہیں۔ حتی کہ اگر کوئی شخص کسی بھی قسم کی مدد پہنچانے کی پوزیشن میں نہ ہو تو وہ اپنے بھائی کے حق میں نیک دعا کرے۔ یہ بھی اس کی طرف سے نفع پہنچانے کا ایک کام ہوگا۔

سچائی

قرآن (الاحزاب) میں اہل ایمان کو سچ بولنے والے مرد اور سچ بولنے والی عورتیں: وَالصَّادِقِينَ وَالصَّادِقَاتِ (33:35) ۔ کہا گیا ہے۔ یہ کسی مرد یا کسی عورت کی نہایت اعلیٰ انسانی صفت ہے کہ جب وہ بولے تو ہمیشہ سچ بولے۔ وہ اپنی زبان سے کبھی سچ کے خلاف کوئی بات نہ نکالے۔ یہی استبازانہ کردار کسی انسان کے شایان شان ہے۔

اس سلسلہ میں بہت سی حدیثیں آئی ہیں جو سچ کی اہمیت کو بتاتی ہیں۔ مثلاً ایک روایت کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عَلَيْكُمْ بِالصِّدْقِ فَإِنَّ الصِّدْقَ يَهْدِي إِلَى الْبِرِّ، وَإِيَّاكُمْ وَالْكَذِبَ فَإِنَّ الْكَذِبَ يَهْدِي إِلَى الْفُجُورِ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 2607) ۔ یعنی تم ہمیشہ سچ بولو، کیوں کہ سچ بولنا آدمی کو نیکی کی طرف لے جاتا ہے۔ اور تم جھوٹ بولنے والے سے بچوں، کیونکہ جھوٹ بولنا آدمی کو برائی کی طرف لے جاتا ہے۔

اس حدیث میں سچ بولنے کا حکم بھی دیا گیا ہے اور اسی کے ساتھ اس کی حکمت بھی بتادی گئی ہے۔ جب آدمی سچ بولنے کا اہتمام کرتا ہے تو اس کے اندر سچائی والی شخصیت پیدا ہوتی ہے۔ اس کے مزاج اور اس کی سوچ پر سچائی کا رنگ غالب آجاتا ہے۔ اس کے اندر ایک ایسی روح پرورش پاتی ہے جو نفسیاتی پیچیدگی کی خرابیوں سے پاک ہو۔ اس طرح سچ بولنے کی صفت اس کو ہر اعتبار سے ایک سچا انسان بنا دیتی ہے۔

اس کے برعکس، جس آدمی کا حال یہ ہو کہ وہ بولے تو جھوٹ بولے، اس کی اندرونی شخصیت گندی ہوتی رہتی ہے۔ اس کے اندر پاک صاف روح کی پرورش نہیں ہوتی۔ وہ برائیوں میں لت پت ہوتا چلا جاتا ہے۔

اسی لیے حدیث میں آیا ہے کہ: أَحَبُّ الْحَدِيثِ إِلَيَّ أَصْدَقُهُ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 3131)۔ یعنی، سب سے زیادہ اچھی بات میرے نزدیک وہ ہے جو سچی بات ہو۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: التَّاجِرُ الصَّدُوقُ الأَمِينُ مَعَ النَّبِيِّينَ (سنن الترمذی، حدیث نمبر 1209)۔ یعنی، سچا اور امانت دار تاجر قیامت کے دن نبیوں کے ساتھ ہوگا۔

حق رسانی

ہجرت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سلمان اور حضرت ابوالدرداء کے درمیان مواخاۃ قائم فرمائی تھی۔ حضرت سلمان اور حضرت ابوالدرداء کا جب ساتھ ہوا تو حضرت سلمان نے دیکھا کہ ابوالدرداء دن کو روزہ رکھتے ہیں اور رات کو کثرت سے نمازیں پڑھتے ہیں۔ دوسری انسانی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لیے ان کے پاس زیادہ وقت باقی نہیں رہتا۔

حضرت سلمان نے حضرت ابوالدرداء کو اس سے منع کیا۔ انھوں نے کہا کہ خدا کے حقوق کے ساتھ انسانوں کے حقوق بھی تمہارے اوپر ہیں۔ تم کو چاہیے کہ تم ہر حق دار کا حق ادا کرو (فَأَعْطِ كُلَّ ذِي حَقٍّ حَقَّهُ)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کا علم ہوا تو آپ نے فرمایا کہ سلمان نے ٹھیک کہا (صدقَ سلمان) صحیح البخاری حدیث نمبر 1968۔ دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ سلمان فقیہہ ہیں (علل الدارقطنی، جلد 8، صفحہ 128)۔ سلمان کو علم میں حصہ ملا ہے (حلیۃ الاولیا للاصفہانی، جلد 1، صفحہ 188)۔

حق داروں کو ان کا حق پہنچانے کا یہ معاملہ اسلام میں اتنا سنگین ہے کہ حدیث میں آیا ہے کہ اگر تم نے دنیا میں حق دار کو اس کا حق نہ دیا تو قیامت کے دن تمہیں ان کا حق ادا کرنا ہو گا۔ لَتُؤَدُّنَّ الْحُقُوقُ إِلَى أَهْلِهَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 2582) یعنی، موجودہ امتحان کی دنیا میں جو آدمی حقوق کی ادائیگی میں ناکام رہے گا وہ آنے والے فیصلہ کے دن شدید تر انداز میں اس کا بھگتان ادا کرنے پر مجبور ہو گا۔

حقوق کی ادائیگی کا یہ معاملہ کسی ایک چیز سے متعلق نہیں ہے بلکہ تمام چیزوں سے متعلق ہے۔ مثلاً گھر کا حق یہ ہے کہ آپ اپنے بیوی بچوں کے تئیں اپنی ذمہ داریوں کو پورا کریں۔ پڑوسی کا حق یہ ہے کہ آپ ان کے لیے کسی قسم کا کوئی مسئلہ نہ پیدا کریں۔ راستہ کا حق یہ ہے کہ آپ کوئی ایسا فعل نہ کریں جس سے دوسرے راستہ چلنے والوں کو تکلیف پہنچے۔ سماج کا حق یہ ہے کہ آپ تمام لوگوں کے ساتھ خیر خواہی کا معاملہ کریں۔ قوم کا حق یہ ہے کہ آپ اس کی صلاح وفلاح کو اپنی ذمہ داری سمجھیں اور کبھی اس سے غافل نہ ہوں۔

حقوق کی ادائیگی ایک مکمل نظریہ ہے اور اس کا تعلق زندگی کے تمام معاملات سے ہے۔

غصہ نہیں

قرآن میں مومن کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ وہ ایسے لوگ ہیں کہ جب ان کو غصہ آتا ہے تو وہ معاف کر دیتے ہیں: وَإِذَا مَا غَضِبُوا هُمْ يَغْفِرُونَ (42:37)۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ مومن کو جب دوسرے شخص سے ایسا سلوک ملتا ہے جو اسے غصہ دلا دے تو وہ غصہ کا جواب غصہ سے نہیں دیتا۔ بلکہ وہ غصہ کا جواب معافی سے دیتا ہے۔ وہ ردعمل کے بجائے درگزر کا طریقہ اختیار کر کے پہلے ہی مرحلہ میں اس کو ختم کر دیتا ہے۔ وہ

فریق ثانی سے الجھنے کے بجائے خود اپنی ذات میں مشغول ہو جاتا ہے۔

ایک شخص پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ اس نے کہا کہ اے خدا کے رسولؐ، مجھے کوئی ایسی بات بتائیے جس کو میں اپنی زندگی بنا لوں۔ اور وہ بات مختصر ہو تا کہ میں اسے بھول نہ جاؤں۔ آپ نے جواب دیا: لَا تَغْضَبْ۔ یعنی، غصہ نہ کر (موطأ الامام مالک، حدیث نمبر 1891)۔

غصہ کبھی خلا میں نہیں آتا۔ غصہ ہمیشہ اس وقت آتا ہے جب کہ کوئی شخص آپ سے غصہ دلانے والی بات کرے۔ جب کوئی شخص آپ کے ساتھ برا سلوک کرے۔ جب کسی سے آپ کو ایسی تکلیف پہنچے جو آپ کی اَنا کو بھڑکانے والی ہو۔ غصہ ایک جوابی عمل ہے۔ وہ ہمیشہ اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب کسی سے آپ کو کوئی ناپسندیدہ تجربہ پیش آیا ہو۔

ایسے موقع پر ایک طریقہ ردعمل کا ہوتا ہے، یعنی جو کچھ دوسرے شخص نے کیا ہے وہی خود بھی کرنا۔ مگر یہ اسلام کی تعلیم نہیں۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ دوسرا شخص آپ کو غصہ دلائے تب بھی آپ غصہ نہ ہوں۔ دوسرا شخص اشتعال انگیزی کرے تب بھی آپ اپنے کو مشتعل ہونے سے بچا لیں۔

مومن کو یقین ہوتا ہے کہ لوگوں کی تکلیفوں پر اگر وہ صبر کر لے تو خدا کے یہاں اس کو زیادہ بہتر اجر ملے گا۔ یہ غصہ، اس کے سینہ میں ایک ایسا اتھاہ سکون پیدا کر دیتا ہے جو کسی بھی مخالفانہ بات سے برہم نہ ہو۔ وہ عین اپنے ایمانی مزاج کے تحت غصہ کو معافی میں بدل دیتا ہے۔ وہ اشتعال انگیزی کو اعراض کے خانہ میں ڈال دیتا ہے۔ وہ اَنا کو بھڑکانے والی بات سے برعکس طور پر تواضع اور انسانیت کی غذا لے لیتا ہے۔

امانت اور عہد

قرآن میں اہل حق کی ایک پہچان یہ بتائی گئی ہے کہ وہ اپنی امانتوں کا اور اپنے عہد کا پورا خیال کرنے والے ہوتے ہیں : وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ (23:8)۔ مولانا شبیر احمد عثمانی (1887-1949) نے اس کی مختصر اور جامع تفسیر ان الفاظ میں کی ہے: یعنی وہ امانت اور قول و قرار کی حفاظت کرتے ہیں خیانت اور بدعہدی نہیں کرتے، نہ اللہ کے معاملہ میں اور نہ بندوں کے معاملہ میں (صفحہ 443)۔

ہر انسان کے پاس جو کچھ ہے وہ سب کا سب امانت ہے، وہ یا تو خدا کی دی ہوئی امانت ہے یا بندوں کی دی ہوئی امانت۔ اسی طرح ہر انسان عہد اور قرار میں بندھا ہوا ہے۔ کچھ عہد ایسے ہیں جو اس نے لفظی صورت میں کر رکھے ہیں، اور کچھ عہد ایسے ہیں جو الفاظ بولے بغیر اپنے آپ اس کے اوپر قائم ہوتے ہیں۔ ان تمام قسم کی امانتوں اور ان تمام قسم کے عہدوں کو اسے پورا کرنا ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو وہ انسانیت کے معیار پر پورا نہیں اترتا۔ وہ اللہ کے نزدیک اپنے آپ کو مجرم ثابت کر رہا ہے۔

آدمی کا جسم اور اس کا قلب و دماغ خدا کی امانت ہے۔ اس پر لازم ہے کہ وہ اپنے اس پورے وجود کو صرف اسی حد کے اندر استعمال کرے جو خدا نے اس کے لیے مقرر کر دی ہے۔ اس کا ہاتھ اور پاؤں انصاف کے لیے اٹھے مگر وہ ظلم کے لیے نہ اٹھے۔ اس کا ذہن خیر خواہی کی بات سوچے مگر وہ بدخواہی کی بات کبھی نہ سوچے۔ اسی طرح انسانوں کی جو امانتیں اس کے پاس ہیں، خواہ وہ لکھی ہوئی ہوں یا بغیر لکھی ہوئی، وہ ان کو پوری طرح امانت داروں کو ادا کرے۔ وہ دوسرے کی چیز کو کبھی اپنی چیز نہ سمجھے۔

اسی طرح ہر آدمی ایک طرف خدا اور دوسری طرف بندوں کے عہد میں بندھا ہوا ہے۔

قرآن کے مطابق، ایک خدا کا فطری عہد ہے جس میں ہر ایک انسان پوری طرح شامل ہے۔ دوسرا ایمانی عہد ہے، اس میں وہ لوگ شامل ہیں جو خدا پر باقاعدہ ایمان لائیں۔ اور شعوری طور پر خدا کے عہد میں بندھ جائیں۔ اس کے بعد بندوں کے عہد کا معاملہ ہے۔ کچھ الفاظ میں لکھے ہوئے عہد ہیں، اور کچھ وہ ہیں جو کسی خاندان یا سماج یا ریاست کا فرد ہونے کی حیثیت سے آدمی کے اوپر اپنے آپ قائم ہوتے ہیں۔ ان تمام عہدوں اور ذمہ داریوں کو پورا کرنا آدمی کا فطری فرض بھی ہے اور شرعی فرض بھی۔

پاکی اور صفائی

پاک اور صاف ستھرا رہنے کو اسلام میں بہت پسند کیا گیا ہے۔ قرآن میں ہے کہ: إِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِینَ وَیُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِینَ (2:222)۔ یعنی، اللہ محبوب رکھتا ہے توبہ کرنے والوں کو اور اللہ محبوب رکھتا ہے پاک رہنے والوں کو۔

آدمی جب غلطی کرنے کے بعد شرمندہ ہوتا ہے اور دوبارہ سچائی کی طرف پلٹ آتا ہے تو اس عمل کو توبہ کہا جاتا ہے۔ توبہ کا یہ عمل آدمی کے اندرون کو پاک کر دیتا ہے۔ اسی طرح پانی باہر کی گندگی کو پاک کرنے کا ذریعہ ہے۔ توبہ کے ذریعہ آدمی اپنی روح کو پاک کرتا ہے اور پانی کے ذریعہ اپنے جسم کو۔ اور دونوں ہی چیزوں کی اسلام میں بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے۔

حدیث میں ہے کہ: الطُّهُورُ نِصْفُ الإِيمَانِ (سنن الترمذی، حدیث نمبر 3519)۔ یعنی، پاکیزگی آدھا ایمان ہے۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: إِنَّ اللّٰهَ نَظِيفٌ يُحِبُّ النَّظَافَةَ (سنن الترمذی، حدیث نمبر 2799)۔ یعنی، اللہ نظیف ہے اور نظافت کو پسند کرتا ہے۔ ابن ماجہ، کتاب الطہارۃ میں ایک مستقل باب ہے جس کا عنوان ہے: باب ثواب الطہور (پاکی کے ثواب کا باب)۔

انسان ایک ایسی مخلوق ہے جس کو خصوصی طور پر حساسیت کی صفت عطا ہوئی ہے۔ اس لیے فطری طور پر انسان صفائی ستھرائی کو پسند کرتا ہے۔ اسلام چوں کہ دین فطرت ہے، اس لیے اس میں اس بات کی بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے کہ انسان ہمیشہ صاف ستھرا رہے۔ اس کا جسم، اس کا لباس، اس کا گھر، اس کی ہر چیز میں ستھراپن دکھائی دے۔

صفائی ستھرائی کی اسی اہمیت کی بنا پر اصحاب رسول میں روزانہ غسل کا عام رواج تھا۔ موطا امام مالک (کتاب الطہارۃ) میں حضرت عبداللہ بن عمر کے صاحبزادہ کی روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میرے باپ (عبداللہ بن عمر) ہر وضو سے پہلے غسل کرتے تھے۔ اس طرح وہ روزانہ پانچ بار نہاتے تھے۔ خلیفہ سوم حضرت عثمان بن عفان کے بارے میں روایت ہے کہ وہ ہر دن ایک بار نہاتے تھے: كَانَ عُثْمَانُ يَغْتَسِلُ كُلَّ يَوْمٍ مَرَّةً (مسند احمد، حدیث نمبر 484)۔ یعنی، جسم اور روح کی صفائی اسلام کے تقاضوں میں سے ایک لازمی تقاضا ہے۔

حق کی ادائیگی

البخاری میں روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں تین شخص کے خلاف قیامت میں مدعی بنوں گا۔ ان میں سے ایک وہ شخص ہے جس نے آدمی کو اپنے یہاں مزدور رکھا اور اس سے پورا کام لیا مگر اس نے اس کی مزدوری نہیں دی: رَجُلٌ اسْتَأْجَرَ أَجِيرًا فَاسْتَوْفَى مِنْهُ وَلَمْ يُعْطِ أَجْرَهُ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 2227)۔

ابن ماجہ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: أَعْطُوا الْأَجِيرَ أَجْرَهُ، قَبْلَ أَنْ يَجِفَّ عَرَقُهُ (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 2443)۔ یعنی، مزدور کو اس کی مزدوری دو، اس سے پہلے کہ اس کا پسینہ خشک ہو موجودہ دنیا

میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی دوسرے آدمی سے کام لیتا ہے۔ ایسے ہر معاملہ میں اسلام کا حکم یہ ہے کہ پوری اجرت دو، اور کام ختم ہونے کے بعد فوراً اسے ادا کرو۔ کام کروانے کے بعد مزدور سے یہ کہنا کہ اگلے دن آکر اجرت لے لینا، انتہائی غیر انسانی فعل ہے۔ اور ایسے پست فعل سے اسلام میں نہایت شدت کے ساتھ منع کیا گیا ہے۔

کام کروانے والے کی ضرورت اگر یہ ہے کہ اس کا کام ہو جائے تو کام کرنے والے کی ضرورت یہ ہے کہ اس کی محنت کا معاوضہ اسے بروقت مل جائے۔ یہ ایک دوطرفہ تقاضا ہے۔ اور کام کرنے والے نے جب کام انجام دے دیا تو اب دوسرے شخص پر لازم ہو گیا کہ وہ اس کا مقرر معاوضہ ادا کرنے میں کسی قسم کی کوئی قابل شکایت بات نہ کرے۔

جہاں طے شدہ مزدوری کا معاملہ نہ ہو وہاں بھی اسلام کا تقاضا ہے کہ کسی نہ کسی صورت میں اس کا بدلہ پورا کیا جائے۔ اگر مادی بدلہ کا موقع نہ ہو تو اس کا شکریہ ادا کیا جائے۔ کھلے دل سے اس کی کارگزاری کا اعتراف کیا جائے۔ اچھے الفاظ کے ساتھ لوگوں کے سامنے اس کا ذکر کیا جائے۔ اس کے حق میں اللہ تعالیٰ سے نیک دعا کی جائے۔

محنت کا فوراً معاوضہ ادا کرنے سے سماج میں باہمی اعتماد بڑھتا ہے، اور اگر اس کے برعکس عمل کیا جائے تو پورا سماج بے اعتمادی اور بدگمانی کا شکار ہو کر رہ جائے گا۔

تیسیر پسندی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی زندگی کا ایک واقعہ ہے۔ ایک دن آپ مدینہ کی مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے، کچھ اور صحابہ بھی وہاں موجود تھے۔ اسی دوران ایک اعرابی آیا۔ وہ مسجد کے اندر پیشاب کرنے لگا۔ لوگ اس کو مارنے کے لیے دوڑے۔ رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم نے لوگوں کو منع کر دیا۔ آپ نے فرمایا کہ اس کو چھوڑ دو۔ پھر جب وہ پیشاب کر چکا تو آپ نے فرمایا کہ ایک ڈول پانی لاؤ اور وہاں پانی بہا کر اسے صاف کرو۔

آخر میں اس کی وجہ بتاتے ہوئے آپ نے فرمایا: فَإِنَّمَا بُعِثْتُمْ مُيَسِّرِينَ وَلَمْ تُبْعَثُوا مُعَسِّرِينَ ۔یعنی، تم آسانی پیدا کرنے والے بنا کر بھیجے گئے ہو، تم مشکل پیدا کرنے والے بنا کر نہیں بھیجے گئے (صحیح البخاری، حدیث نمبر 6128)۔

اس سے اسلام کا ایک مستقل اصول معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ اجتماعی زندگی میں جب کسی کی طرف سے کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش آئے تو اہل ایمان کی ساری توجہ پیدا شدہ مسئلہ کو حل کرنے پر لگنا چاہیے نہ کہ مسئلہ پیدا کرنے والے کو سزا دینے پر۔ ایسے موقع پر اہل ایمان کے اندر اصلاح کا جذبہ ابھرنا چاہیے نہ کہ انتقام لینے کا جذبہ۔ ایسی صورت حال میں وہ طریقہ اختیار کرنا چاہیے جو مسئلہ کو گھٹانے والا ہو نہ کہ مسئلہ کو اور زیادہ بڑھا دینے والا۔ ٹھیک ویسے ہی جیسے کہیں آگ لگ جائے تو فطرت کا تقاضا ہے کہ اس کو فوراً بجھایا جائے نہ کہ اس کو اور زیادہ بھڑکانے کی کوشش کی جائے۔

ہر نزاعی معاملہ میں ایک تیسیر کی صورت ہوتی ہے اور دوسری تعسیر کی صورت۔ ایک صورت اختیار کرنے میں پیش آمدہ مسئلہ دبتا ہے۔ اور دوسری صورت اختیار کرنے میں پیش آمدہ مسئلہ اور زیادہ شدت کے ساتھ ابھر آتا ہے۔ پہلی صورت تیسیر کی ہے، اور دوسری صورت تعسیر کی۔ اسلام ہمیشہ تیسیر کی صورت کو پسند کرتا ہے۔ تعسیر کی صورت کسی بھی حال میں اسلام میں پسندیدہ نہیں۔

یہ اسلام کا ایک مستقل اصول ہے۔ اس کا تعلق ذاتی زندگی سے بھی ہے اور اجتماعی زندگی سے بھی۔ اس کو گھر کے اندر کے معاملات میں بھی اختیار کرنا ہے اور گھر کے باہر کے معاملات میں بھی۔ وہ ایک مکمل اصول ہے اور ایک مکمل نظام حیات۔

مشرک کا حکم

قرآن میں ہے کہ خنزیر کا گوشت ناپاک ہے : أَوْ لَحْمَ خِنزِيرٍ فَإِنَّهُ رِجْسٌ (6:145)۔ اسی طرح قرآن میں ہے کہ مشرک ناپاک ہیں (انما المشرکون نجس) اس لفظی اشتراک کی بنا پر کچھ لوگوں نے سمجھ لیا کہ جس طرح خنزیر باعتبار جسم ناپاک ہے، اسی طرح مشرک بھی باعتبار جسم ناپاک ہے۔ چنانچہ مشرک کا برتن، کھانا، کپڑا اور اس کی تمام چھوٹی ہوئی چیزوں کو ناپاک سمجھ لیا گیا۔ حتی کہ کہا گیا کہ کوئی مسلمان اگر مشرک سے مصافحہ کر لے تو اس کے بعد وہ اپنے ہاتھ کو دھوئے اور وضو کر کے اپنے کو پاک کرے: قَالَ أَشْعَثُ عَنِ الْحَسَنِ: مَنْ صَافَحَهُمْ فَلْيَتَوَضَّأْ (تفسیر ابن کثیر، جلد 4، صفحہ 272)۔

یہ صحیح نہیں۔ اگرچہ مذکورہ دونوں آیتوں میں بظاہر یکساں لفظ ہے، مگر دونوں کا مطلب یکساں نہیں۔ "خنزیر نجس ہے" کا مطلب یہ ہے کہ خنزیر کا جسم نجس ہے۔ اس کے برعکس "مشرک نجس ہے" کا مطلب یہ ہے کہ مشرک کا عقیدہ نجس ہے۔ جہاں تک مشرک کے بدن کی نجاست کا تعلق ہے، جمہور کی رائے یہ ہے کہ مشرک کا بدن اور اس کا وجود نجس نہیں۔ اسی بنا پر اہل کتاب کے کھانے کو جائز ٹھہرایا گیا ہے: وَأَمَّا نَجَاسَةُ بَدَنِهِ فَالْجُمْهُورُ عَلَى أَنَّهُ لَيْسَ بِنَجِسِ الْبَدَنِ وَالذَّاتِ، لِأَنَّ اللّٰهَ تَعَالَى أَحَلَّ طَعَامَ أَهْلِ الْكِتَابِ (تفسیر ابن کثیر، جلد 4، صفحہ 271)۔ عبدالرحمن الجزیری لکھتے ہیں: اما قولہ تعالیٰ: إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ (9:28)۔ فَالْمُرَادُ بِهِ النَّجَاسَةُ الْمَعْنَوِيَّةُ الَّتِي حَكَمَ بِهَا الشَّارِعُ، وَلَيْسَ الْمُرَادُ أَنَّ ذَاتَ الْمُشْرِكِ نَجِسَةٌ كَنَجَاسَةِ الْخِنزِيرِ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ، جلد 1، صفحہ 9)۔

اللہ تعالیٰ کا قول کہ مشرکین نجس ہیں، اس سے مراد معنوی نجاست ہے جس کا حکم شارع نے بیان کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ مشرک کا وجود ناپاک ہے جس طرح خنزیر کا وجود ناپاک ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے تمام مسائل مسلمانوں میں دعوتی ذہن ختم ہونے کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ دوسری قوموں کو مدعو سمجھنا انھیں قابلِ التفات بناتا ہے۔ مگر جب دوسری قومیں مدعو نہ سمجھی جائیں تو وہ قابلِ اجتناب بن کر رہ جائیں گی۔

مجرم کے ساتھ بھی

یروی ابوداؤد عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صلی اللّٰه علیہ وسلم أُتِيَ بِرَجُلٍ قَدْ شَرِبَ، فَقَالَ: اضْرِبُوهُ، قَالَ أَبُو هُرَيْرَةَ: فَمِنَّا الضَّارِبُ بِيَدِهِ، وَالضَّارِبُ بِنَعْلِهِ، وَالضَّارِبُ بِثَوْبِهِ، فَلَمَّا انْصَرَفَ، قَالَ بَعْضُ الْقَوْمِ: أَخْزَاكَ اللّٰهُ، فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صلی اللّٰه علیہ وسلم: لَا تَقُولُوا هَكَذَا، لَا تُعِينُوا عَلَيْهِ الشَّيْطَانَ۔ یعنی، حضرت ابوہرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک آدمی لایا گیا جس نے شراب پی تھی۔ آپ نے فرمایا کہ اس کو مارو ابوہریرہ کہتے ہیں کہ ہم میں سے کسی نے اپنے ہاتھ سے مارنا شروع کیا، کسی نے اپنے جوتے سے اور کسی نے اپنے کپڑے سے۔ جب مار چکے تو لوگوں میں سے کسی شخص نے کہا کہ خدا تجھے رسوا کرے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ایسا مت کہو۔ اور اس کے اوپر شیطان کی مدد نہ کرو (سنن ابوداؤد، حدیث نمبر 6128)۔

اسلام میں مجرم کو جو سزا دی جاتی ہے وہ نفرت کے جذبہ کے تحت نہیں دی جاتی بلکہ صرف حدود اللہ کی ادائیگی کے لیے دی جاتی ہے۔ سزا دینے والے کے اندر اگر مجرم کے مقابلہ میں اپنی بڑائی کا احساس پیدا ہو جائے تو یہ بھی اس کے لیے ایک جرم ہوگا۔ کسی کو سزا دینے کا اختیار صرف اس شخص کو ہے جو نفرت کے جذبات سے بلند ہو کر اسے سزا دے۔

مجرم پر حد جاری کرنے کے بعد اسے برا بھلا کہنا خدا کی سزا پر انسانی سزا کا اضافہ ہے جس کا حق کسی کو بھی نہیں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے مذکورہ ارشاد سے معلوم ہوتا ہے کہ حد جاری کرتے ہوئے بھی آپ کو مجرم کے ساتھ بے پناہ ہمدردی تھی۔ آپ نے یہ نہیں چاہا کہ لوگوں کے برا بھلا کہنے سے مجرم کے اندر ردعمل پیدا ہو اور وہ ندامت اور اصلاح کی طرف رغبت کرنے کے بجائے سرکشی اور بغاوت کی طرف مائل ہو جائے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کون لوگ ہیں جن کو خدا کی طرف سے یہ اجازت نامہ حاصل ہوتا ہے کہ وہ خدا کے بندوں کے اوپر داروغہ بن کر کھڑے ہوں اور ان کے اوپر خدا کی مقرر کی ہوئی سزائیں نافذ کریں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی انسانوں سے محبت اتنی زیادہ بڑھی ہوئی ہو کہ وہ مجرم کے لیے بھی باقی رہے۔ وہ جرم کے ارتکاب کے باوجود ایک شخص سے نفرت نہ کرسکیں۔ وہ خیر خواہی کی حد تک ہر انسان سے دلچسپی رکھنے والے ہوں۔

دو طریقے

ایک دیہاتی آدمی مدینہ آیا۔ وہ مسجد نبوی میں داخل ہوا جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کے ساتھ موجود تھے۔ وہ مسجد کے اندر کھڑا ہو کر پیشاب کرنے لگا۔ لوگوں نے اس کو تنبیہہ کرنا چاہا مگر آپ نے منع فرما دیا۔ آپ نے کہا کہ دیہاتی کو چھوڑ دو اور ایک ڈول پانی لا کر وہاں بہا دو۔ چنانچہ لوگوں نے ایسا ہی کیا۔ (بخاری، مسلم، نسائی، ترمذی، ابوداؤد، مؤطا)۔

(Sahih al-Bukhari: 220, Sunan al-Nasai: 56, Sunan al-Tirmidhi: 147, Sunan Abi Dawud: 380)

دیہاتی پر اس واقعہ کا بہت اثر پڑا۔ اپنے قبیلہ میں واپس جا کر اس نے لوگوں سے پورا قصہ بیان کیا۔ اس نے کہا کہ میں نے یہ حرکت کی کہ عبادت خانہ میں پیشاب کر دیا۔ مگر خدا کی قسم، محمد نے مجھ پر غصہ نہیں کیا۔ انھوں نے مجھے نہیں جھڑکا (مسند احمد، حدیث نمبر 10533)۔ قبیلہ کے لوگ یہ بات سن کر بہت متاثر ہوئے۔ حتی کہ سارا قبیلہ دین اسلام میں داخل ہو گیا۔

اب موجودہ زمانہ کا واقعہ لیجیے۔ ہولی کا دن تھا۔ ہندو نوجوانوں کی ایک پارٹی ہولی کھیلتی ہوئی شہر کی ایک سڑک سے گزر رہی تھی۔ راستہ میں ایک مسجد آ گئی۔ ایک نوجوان نے جوش میں آ کر مسجد کی طرف پچکاری ماری۔ مسجد کی ایک دیوار پر ہولی کے رنگ کے چھینٹے پڑ گیے۔ مسجد کی دیوار پر ہولی کا رنگ دیکھ کر وہاں کے مسلمانوں کو غصہ آ گیا۔ وہ ہندو نوجوانوں سے لڑ گیے۔ مار پیٹ کی یہ خبر پورے شہر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ ہر طرف فساد بھڑک اٹھا۔ مسلمانوں نے دیوار پر رنگ کو برداشت نہیں کیا تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہر کی سڑکیں ان کے خون سے رنگین کر دی گئیں۔ اور ان کے گھروں اور دکانوں کو نذر آتش کر دیا گیا۔

دو واقعہ میں یہ فرق کیوں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدائی دین پر تھے۔ اور موجودہ زمانہ کے مسلمان قومی دین پر ہیں۔ جو لوگ خدائی دین پر چلیں، ان کو فرشتوں کی مدد حاصل ہوتی ہے۔ ان کے لیے دلوں کے بند دروازے کھولے جاتے ہیں۔ اس کے برعکس معاملہ ان لوگوں کا ہے جو قومی دین پر چلیں۔ ایسے لوگوں کا ساتھی صرف ان کا نفس ہوتا ہے۔ ان کا عمل ضد اور نفسانیت کی آگ بھڑکاتا ہے۔ وہ دوسروں کو نفرت کا تحفہ دیتے ہیں، اس لیے دوسروں کی طرف سے بھی انھیں نفرت اور انتقام کا تحفہ دیا جاتا ہے۔

دعوہ کلچر

اسلامی کلچر حقیقتۃً دعوہ کلچر ہے۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے اسلام کو گن کلچر کے ہم معنی بنا دیا ہے۔ یہ بلا شبہ سب سے بڑا جرم ہے جو موجودہ زمانہ کے کچھ نام نہاد انقلابی مفکرین کی رہنمائی میں مسلمانوں کا ایک طبقہ انجام دے رہا ہے۔ اللہ چاہتا ہے کہ مسلمان اقوام عالم کے اوپر رحمت کی بارش برسائیں۔ مگر وہ اقوام عالم کے اوپر آگ کی بارش برسانے والے بنے ہوئے ہیں۔ اس قسم کا عمل خواہ کتنا ہی زیادہ اسلام کے نام پر کیا جائے وہ بلا شبہ باطل ہے، وہ خدا کے منصوبہ کے سراسر خلاف ہے۔

یہ دنیا کیا ہے۔ دنیا جنتی انسانوں کی انتخاب گاہ ہے۔ قیامت سے پہلے کے مرحلہ میں جنتی انسانوں کا انتخاب کیا جا رہا ہے، قیامت کے بعد کے مرحلہ میں جنتی انسانوں کو جنت کی ابدی آرامگاہوں میں بسایا جائے گا۔ یہ حقیقت قرآن میں آخری حد تک واضح ہے، بشرطیکہ آدمی سنجیدگی کے ساتھ قرآن پر غور کرے۔

قرآن بتاتا ہے کہ زمین وآسمان اس لیے بنائے گئے ہیں تاکہ اولوالباب اس کو دیکھ کر آیاتِ خداوندی کا ادراک کرسکیں (آل عمران، 3:190-191) انسان کو اس لیے تخلیق کیا گیا ہے تاکہ امتحانی حالات میں ڈال کر یہ دیکھا جائے کہ ان میں سے کون ہے جو جنت کی نفیس فضاؤں میں بسائے جانے کے لائق ہے (الملک، 67:2) اللہ کے پیغمبر اس لیے بھیجے گئے تاکہ وہ انسانوں کو ہدایت کا وہ راستہ بتائیں جو انھیں جنت میں لے جانے والا ہے (ابراہیم، 14:4)

زمین وآسمان کی کائنات اس لیے پھیلائی گئی ہے کہ انسان اس کو دیکھ کر خدا کی بے پناہ کبریائی کو محسوس کرے، وہ خدا کے عظمت وجلال کے احساس سے کانپ اٹھے۔ دنیا میں رنگ اور خوشبو اور راحت اور معنویت کا سیلاب اس لیے بہایا گیا ہے کہ آدمی ان کے اندر خدا

کی عنایتوں کو دیکھے، وہ ہمہ تن خدا کی رحمتوں کا طلب گار بن جائے۔ حق کے داعی اس لیے کھڑے کیے گئے ہیں تاکہ ان کا اعتراف کرکے آدمی صاحب معرفت ہونے کا ثبوت دے، وہ حق کی حمایت کرکے خدا کے خصوصی بندوں میں شامل ہوجائے۔ اس مزاج کے تحت جو کلچر بنتا ہے وہ دعوہ کلچر ہوتا ہے نہ کہ گن کلچر۔

ایک دُعا

یہ دنیا حادثات کی دنیا ہے۔ یہاں یکساں حالات کا برقرار رہنا ممکن نہیں۔ یہاں عین فطرت کے قانون اور عین تخلیقی نظام کے تحت ایسا ہوتا ہے کہ بار بار حالات میں تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ بار بار نقصان سے سابقہ پیش آتا ہے۔ قرآن کے الفاظ میں، یہ نقصان کبھی خوف کی صورت میں پیش آئے گا، کبھی بھوک کی صورت میں، اور کبھی مال اور جان اور فائدہ میں کمی کی صورت میں (البقرہ، 2:155)۔

ایسی حالت میں ایک انسان وہ ہے جو فریاد و ماتم کرنے لگتا ہے۔ وہ شکایت اور احتجاج کی نفسیات میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ وہ مایوسی کا شکار ہوکر رہ جاتا ہے۔ مگر یہ سچے انسانوں کا طریقہ نہیں۔ یہ ان لوگوں کا طریقہ ہے جو سیدھے راستہ سے بھٹک جاتے ہیں۔

ایسے مواقع پر کسی انسان کے لیے صحیح اور سچا طریقہ صرف ایک ہے۔ وہ یہ کہ وہ سارے معاملہ کو مالکِ کائنات کے اوپر ڈال دے۔ وہ مصیبت کو صبر کا معاملہ بنائے نہ کہ بے صبری کا۔ وہ اس کو وقتی تاثر کے خانہ میں ڈالے نہ کہ مستقل تاثر کے خانہ میں۔

جن لوگوں کے اندر یہ ربانی شخصیت ہو۔ جو سچائی کے راستہ کو پائے ہوئے ہوں۔ ان پر جب ایسی کوئی آفت آتی کی زبان سے نکل پڑتا ہے کہ ہم اللہ کے لیے ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ خدایا، تو ہماری مصیبت میں ہم کو اجر دے۔ تو اس کے بعد ہمارے

لیے خیر کی صورت پیدا فرما دے: إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ، اللهُمَّ أْجُرْنِي فِي مُصِيبَتِي، وَأَخْلِفْ لِي خَيْرًا مِنْهَا (صحیح مسلم، حدیث نمبر 918)۔

جو بندہ شخصی یا قومی مصیبت پیش آنے کے بعد یہ کہہ پڑے۔ اس کو فوراً ایک نیا سنبھالا مل جائے گا۔ جھٹکا لگنے کے بعد وہ دوبارہ اٹھ کھڑا ہوگا۔ ناامیدی کے تجربہ سے دوچار ہونے کے بعد وہ جلد ہی امید کا نیا تحفہ اپنے لیے پالے گا۔

ایسے لوگ ماضی کو کھو کر دوبارہ اپنے مستقبل کو پالیتے ہیں، وہ محرومی میں بھی یافت کا سرمایہ حاصل کر لیتے ہیں۔ جہاں بظاہر کہانی ختم ہوتی ہوئی نظر آتی ہو وہاں بھی وہ ایک نیا پیراگراف معلوم کر لیتے ہیں جس کے ذریعہ وہ اپنی زندگی کی کہانی کو از سرنو شروع کر سکیں۔

محنت کی کمائی

قرآن میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں سے فرمایا کہ تم لوگ پاک اور طیّب چیزوں سے کھاؤ (23:51) پاکیزہ روزی سے پاکیزہ روح پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے اسلام میں پاکیزہ روزی پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے۔

البخاری کی ایک روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَا أَكَلَ أَحَدٌ طَعَامًا قَطُّ، خَيْرًا مِنْ أَنْ يَأْكُلَ مِنْ عَمَلِ يَدِهِ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 2072)۔ یعنی، کسی آدمی کی سب سے زیادہ بہتر روزی یہ ہے کہ وہ اپنے ہاتھ کی محنت کا کھانا کھائے۔

مسند احمد کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ سب سے زیادہ پاکیزہ کمائی کون سی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ: قِيلَ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ، أَيُّ الْكَسْبِ أَطْيَبُ؟ قَالَ: عَمَلُ الرَّجُلِ بِيَدِهِ (مسند احمد، حدیث نمبر 17265)۔ یعنی، وہ جو آدمی نے اپنے ہاتھ سے محنت کر کے کمایا ہو۔

محنت کی کمائی ہی دراصل کمائی ہے۔ اس کے بغیر جو حاصل کیا جائے وہ لوٹ ہے۔ محنت کرنے والا اپنی محنت سے جو کچھ حاصل کرتا ہے وہ اس کا جائز حق ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ غلط تدبیروں سے جو کچھ حاصل کیا جائے وہ دراصل دوسروں کا حصہ تھا جس کو ایک شخص نے کسی حق کے بغیر ناجائز طور پر اپنے لیے حاصل کرلیا۔

مذکورہ حدیث میں "ہاتھ" کا لفظ علامتی طور پر آیا ہے۔ اس میں جسم اور دماغ دونوں قسم کی محنت شامل ہے۔ سماجی سرگرمیوں میں دونوں قسم کی محنت کی ضرورت ہوتی ہے، اور دونوں طرح کی محنت جائز محنت ہے۔ آدمی خواہ جسمانی محنت سے حاصل کرے یا دماغی محنت سے، دونوں ہی یکساں طور پر اس حدیث کا مصداق ہوں گے۔ البتہ اس کو واقعی محنت ہونا چاہیے۔

محنت کی کمائی سے فرد کے اندر پاکیزہ شخصیت بنتی ہے اور سماج کے اندر پاکیزہ ماحول۔ اس طرح محنت کی کمائی سے انفرادی زندگی اور اجتمائی زندگی دونوں ہی درست ہوتی چلی جاتی ہیں۔

جس سماج میں لوگ محنت کر کے کمائیں وہاں منصفانہ ماحول بنے گا۔ اور جہاں لوگ بلامحنت حاصل کرنا چاہیں وہاں مجرمانہ ماحول۔

مالی تعاون

زندگی کی دوڑ میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کوئی آگے چلا جاتا ہے اور کوئی پیچھے رہ جاتا ہے۔ کسی کے پاس ضرورت سے زیادہ مال آجاتا ہے اور کسی کو ضرورت سے کم ملتا ہے۔ ایسے حالات میں اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ لوگ ایک دوسرے کا مالی تعاون کریں۔ انسانی

تقاضے کے تحت لوگ ایک دوسرے کے کام آئیں۔

اس سلسلہ میں قرآن میں بہت سی آیتیں آئی ہیں۔ مثلاً فرمایا: لِيُنْفِقْ ذُو سَعَةٍ مِنْ سَعَتِهِ۔ یعنی، وسعت والے کو چاہیے کہ وہ اپنی وسعت کے مطابق خرچ کرے (65:7) اسی طرح فرمایا: وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ (51:19)۔ یعنی محسن اور متقی وہ لوگ ہیں جن کے مالوں میں سائل اور محروم کا حصہ ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کا پسندیدہ انسان وہ ہے جس کو مالی فراخی ملے تو اپنے مال میں سے وہ دوسروں کے لیے خرچ کرے۔ اس کی کمائی میں صرف انھیں کا حصہ نہ ہو جو ضرورت کے تقاضے کے تحت سوال کرتے ہیں۔ بلکہ اپنے مال میں وہ ان کا حصہ بھی سمجھے جو کسی وجہ سے محروم ہو گئے ہیں۔ جو مانگتے نہیں ہیں یا مانگنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ وہ خود ایسے لوگوں کو جانے اور ان کے یہاں پہنچ کر ان کی مدد کرے۔

حدیث کی کتابوں میں کثرت سے ایسی روایتیں ہیں جن میں مال خرچ کرنے پر ابھارا گیا ہے۔ مثال کے طور پر، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن چند لوگوں کے بارے میں جنت کی خوش خبری دی ہے، ان میں سے ایک وہ انسان ہے جس کو اللہ نے مال دیا پھر اس نے اپنے مال کو دوسروں کی مدد میں خرچ کیا: وَرَجُلٌ أَعْطَاهُ اللَّهُ مَالًا، فَهُوَ يُنْفِقُ (مسند احمد، حدیث نمبر 16966)۔

اپنی کمائی کو دوسرں کی ضرورت پر خرچ کرنا اعلیٰ ترین انسانی صفت ہے، اور اسلام میں آخری حد تک اس کی تاکید کی گئی ہے۔ جس آدمی کو بھی مال کا کوئی حصہ ملتا ہے وہ اس کے لیے خدا کا ایک عطیہ ہوتا ہے۔ خدا اگر ضروری اسباب مہیا نہ کرے تو کوئی بھی شخص مال کمانے پر قادر نہیں ہو سکتا۔ اس لیے جب بھی کسی کو مال ملے تو اس پر لازم ہو جاتا ہے کہ خدا کی شکر گزاری کے طور پر وہ اس کا ایک حصہ نکالے اور اس کو خدا کے بندوں پر خرچ کرے۔

انسانیت عامہ

اسلام کے مطابق، پوری انسانیت خدا کا ایک کنبہ ہے۔ بیہقی کی ایک روایت ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمام انسان خدا کی عیال کی مانند ہیں۔ اور اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ انسان وہ ہے جو اس خدائی عیال کے ساتھ بہترین سلوک کرے :الْخَلْقُ عِيَالُ اللّٰهِ، فَأَحَبُّ الْخَلْقِ إِلَى اللّٰهِ مَنْ أَحْسَنَ إِلَى عِيَالِهِ (مسند البزر، حدیث نمبر 6947)۔ اس بات کو مولانا الطاف حسین حالی نے ایک شعر میں اس طرح کہا ہے:

یہ پہلا سبق تھا کتابِ ہدیٰ کا　　　　کہ ہے ساری مخلوق کنبہ خدا کا

ید بن ارقم سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب رات کے آخری پہر میں اٹھتے تو تہجد کی نماز سے فارغ ہو کر ذکر اور دعا میں مشغول ہو جاتے۔ اس دوران آپ کی زبان سے یہ الفاظ نکلتے کہ: أَنَا شَهِيدٌ أَنَّ الْعِبَادَ كُلَّهُمْ إِخْوَةٌ (سنن ابی داوٗد، حدیث نمبر 1508)۔ یعنی، اے اللہ، میں گواہی دیتا ہوں کہ سارے بندے آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

تہجد کی نماز کا حکم مکہ میں اترا تھا۔ اس طرح آپ کا یہ معمول مکی دور ہی میں شروع ہو گیا تھا۔ حدیث کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تہجد کے بعد آپ مختلف دعائیں پڑھتے تھے۔ تاہم مذکورہ دعا جس میں اخوت انسانی کی شہادت دی گئی ہے، وہ خاص طور پر مکی دور سے تعلق رکھتی ہے۔

جیسا کہ معلوم ہے، مکہ کے مشرکین اس زمانہ میں آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو سخت ایذائیں دے رہے تھے۔ اس کے باوجود رات کی تنہائیوں میں آپ ان کو برادرانہ احساسات کے ساتھ یاد فرماتے تھے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اسلام جو معیاری انسان دیکھنا چاہتا ہے وہ انسان وہ ہے جس کا

حال یہ ہو کہ لوگ اگر اس کے دشمن بن جائیں، حتی کہ وہ اس کو مٹانے کے درپے ہوجائیں۔ تب بھی اس کے دل میں لوگوں کے لیے برادرانہ احساسات ہی امنڈ رہے ہوں۔ حتی کہ وہ اپنی تنہائیوں میں خدا کو گواہ بنا کر اس کا اعلان کر رہا ہو۔

اسلام آدمی کے اندر شفقت کا جذبہ ابھارتا ہے۔ جو آدمی اسلام کو اختیار کرتا ہے وہ عین اسی کے ساتھ سارے انسانوں کے لیے شفیق اور مہربان بن جاتا ہے۔

عالمی اخوت

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ نے تمام انسانوں کو ایک ہی جوڑے سے پیدا کیا ہے۔ یہ دراصل ایک ہی ماں اور باپ کی نسل ہے جو سارے کرۂ ارض پر پھیلی ہوئی ہے (النساء، 4:1) اس سے معلوم ہوا کہ تمام انسان، ظاہری اختلافات کے باوجود، باعتبار پیدائش ایک ہیں۔ دوسرے لفظ میں یہ کہ سب کے سب آپس میں خونی بھائی (blood brothers) ہیں۔

یہ اخوت ایک عالمی اخوت ہے۔ چنانچہ قرآن میں ایک طرف کہا گیا ہے کہ: إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ (49:10) ۔یعنی، اہل ایمان سب آپس میں بھائی بھائی ہیں دوسری طرف غیر مسلموں کو بھی مسلمانوں کا بھائی بتایا گیا ہے۔ اہل ایمان اگر دینی اعتبار سے ہمارے بھائی ہیں تو غیر مسلم حیاتیاتی اعتبار سے تمام مسلمانوں کے لیے بھائی اور بہن کی حیثیت رکھتے ہیں۔

چنانچہ قرآن میں جن پیغمبروں کا نام آیا ہے، ان کی گمراہ قوموں کا ذکر ان کے بھائی کی حیثیت سے کیا گیا ہے۔ مثلاً: ثَمُودَ أَخَاهُمْ صَالِحاً (7:73) ۔وَإِلَى مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْباً (7:85)۔ إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ نُوحٌ (26:106)۔ إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ هُودٌ (26:124)۔ إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ لُوطٌ (26:161)۔

حدیث میں کثرت سے ایسی تعلیمات ہیں جن میں تلقین کی گئی ہے کہ تم لوگ ایک دوسرے کے ساتھ بھائی اور بہن جیسا سلوک کرو۔ یہ بات کہیں عام الفاظ میں ہے اور کہیں مومن اور مسلم کے الفاظ میں۔ تاہم اس کا خطاب عمومی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ عام انسانوں کے لیے اس کی حیثیت گویا نصیحت کی ہے اور اہل ایمان کے لیے اس کی حیثیت فریضہ اور حکم کی۔

اسلام کے مطابق، خدا کے تمام بندے آپس میں بھائی بھائی ہیں (صحیح البخاری، حدیث نمبر 2442)۔ پوری انسانیت ایک وسیع تر خاندان کی حیثیت رکھتی ہے۔ ایک گھر کے اندر دو بھائیوں میں جو برادرانہ تعلق ہوتا ہے، وہی برادرانہ تعلق وسیع تر دائرہ میں تمام انسانوں سے مطلوب ہے۔ حدیث میں اگر کہیں المسلم اخو المسلم کا لفظ ہے تو وہ بھی گروہی معنی میں نہیں ہے بلکہ اصولی معنی میں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سچے انسان ہمیشہ بھائی بھائی کی طرح رہتے ہیں۔

وسیع تر آدمیت

صحیح البخاری میں حدیث کے ایک مجموعہ کا باب یہ ہے: باب رحمۃِ الناس والبھائم یعنی انسانوں اور حیوانات کے ساتھ رحمت کا باب۔ اس کی تشریح میں ابن حجر العسقلانی نے لکھا ہے: ای صدور الرحمۃ من الشخص لغیرہ۔ یعنی کسی شخص کی طرف سے اس کے غیر کے لیے مہربانی کا عمل۔ اسلام آدمی کے اندر رحمت وشفقت کا جو جذبہ پیدا کرتا ہے وہ اتنا زیادہ آفاقی ہے کہ اس کا اثر حیوانات اور نباتات کی دنیا تک پہنچتا ہے۔ ایسا انسان ہر ایک کے لیے شفیق بن جاتا ہے، حتی کہ جانوروں اور درختوں کے لیے بھی۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک شخص کسی راستہ پر چل رہا تھا۔ اس کو سخت پیاس لگی۔ پھر اس کو راستہ میں ایک کنواں نظر آیا۔ اس نے اس کنویں سے پانی حاصل کیا۔ جب وہ باہر آیا تو اس نے ایک کتّے کو دیکھا جو ہانپ رہا تھا۔ پیاس سے اس کا برا حال تھا۔ آدمی نے اپنے دل میں کہا کہ اس کتّے کا بھی پیاس سے وہی حال ہو رہا ہے جو میرا حال ہوا تھا۔ وہ دوبارہ کنویں کے پاس گیا اور اپنے جوتے میں پانی نکال کر کتّے کو پلایا۔ پھر اس آدمی نے اللہ کا شکر ادا کیا تو اللہ نے اس کو بخش دیا۔ لوگوں نے پوچھا کہ اے خدا کے رسولؐ، کیا ہمارے لیے حیوانات میں بھی اجر ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ہر نرم و نازک جگر میں تمہارے لیے اجر ہے (صحیح البخاری، حدیث نمبر 2363)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر احساس والی مخلوق کے ساتھ تمہیں شفقت کا معاملہ کرنا ہے اور ہر ایسے معاملہ پر اللہ کی طرف سے تمہیں انعام دیا جائے گا۔

اسی طرح درخت کو اسلام میں اتنی زیادہ اہمیت دی گئی کہ قرآن میں فرمایا کہ خدا کو ماننے والا انسان ایسا ہی ہوتا ہے جیسے کہ ایک درخت۔ وہ درخت کی مانند نفع بخش بن کر دینا میں زندگی گزارتا ہے (ابراہیم 24)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی مسلم جب ایک پودا لگاتا ہے۔ پھر وہ بڑا ہوتا ہے اور کوئی انسان یا کوئی جانور اس کا پھل کھاتا ہے تو یہ پودا لگانے والے کے لیے ایک صدقہ ہوتا ہے (صحیح البخاری، حدیث نمبر 2320)۔ خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق نے اسلامی فوج روانہ کرتے ہوئے حکم دیا کہ تم لوگ کوئی درخت نہ کاٹنا: لا تَقْطَعُوا شَجَرَةً (تاریخ دمشق لابن عساکر، جلد 2، صفحہ 50)۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اسلام میں درخت کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ کوئی درخت دشمن کا درخت ہو تب بھی اس کو نہ کاٹا جائے۔ اسلام کی آدمیت وسیع تر آدمیت ہے، نہ کہ محدود آدمیت۔

عمومی عزت

جابر بن عبداللہ ایک صحابی ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ مدینہ کے راستہ میں ایک جنازہ گزرا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو دیکھ کر کھڑے ہو گئے اور ہم بھی آپ کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔ پھر ہم نے کہا کہ اے خدا کے رسول، یہ تو ایک یہودی کا جنازہ تھا۔ آپ نے فرمایا کہ جب تم جنازہ کو دیکھو تو کھڑے ہو جاؤ: إِذا رَأَيْتُمُ الجِنازَةَ فَقُومُوا (صحیح البخاری، حدیث نمبر 1311)۔

ایک اور روایت میں ہے کہ سَہل بن حُنَیف اور قَیس بن سَعد قادسیہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے سے ایک جنازہ گزرا۔ اس کو دیکھ کر دونوں کھڑے ہو گئے۔ ان سے کہا گیا کہ یہ تو ایک ذمی (غیر مسلم) کا جنازہ تھا۔ دونوں نے جواب دیا کہ مدینہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سے ایک جنازہ گزرا تو آپ کھڑے ہو گئے۔ آپ سے کہا گیا کہ یہ تو ایک یہودی کا جنازہ تھا، آپ نے فرمایا کہ کیا وہ انسان نہ تھا: أَلَيْسَتْ نَفْسًا (صحیح البخاری، حدیث نمبر 1312)۔

اس سے اسلام کا ایک نہایت اہم اصول معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ انسان ہر حال میں قابل احترام ہے، حتی کہ اگر وہ غیر مسلم ہو یا دشمن گروہ سے تعلق رکھتا ہو، تب بھی دوسرے پہلوؤں کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کو بحیثیت انسان دیکھا جائے گا، اور انسان ہونے کے اعتبار سے ہر حال میں اس کو عزت اور احترام دیا جائے گا۔

انسان خدا کی ایک ممتاز مخلوق ہے۔ قرآن کے لفظوں میں اس کو احسنِ تقویم (بہترین ساخت) کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے۔ انسان اپنی بناوٹ کے اعتبار سے تخلیق کا شاہکار ہے۔ کوئی انسان، اپنا ہو یا غیر، ہر حال میں وہ خدا کی مخلوق ہے۔ ہر حال میں وہ خالق کے کمالات کا

ایک نمونہ ہے۔ اس لیے اختلاف کے باوجود قابل احترام ہے۔ اجنبیت کے باوجود اپنی انسانی حیثیت میں وہ اس قابل ہے کہ اس کو عزت دی جائے۔

مومن ہر چیز میں خدا کا جلوہ دیکھتا ہے۔ ہر مخلوق میں اس کو خالق کا کرشمہ نظر آتا ہے۔ مومن کی یہ نفسیات مجبور کرتی ہے کہ وہ ہر انسان کو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے۔ ہر انسان کے لیے اس کے دل میں قدردانی کا جذبہ موجود ہو۔

آفاقی انسان

قرآن ایک عالمی کتاب ہے۔ اس کی تمام تعلیمات آفاقیت پر مبنی ہیں، قرآن میں جس خدا کا تصور دیا گیا ہے وہ رب العالمین ہے (الفاتحہ، 1:2)۔ قرآن کا پیغمبر نذیر للعالمین ہے (الفرقان، 21:107)۔ قرآن کے ذریعہ جو دین بھیجا گیا ہے وہ ایک کائناتی دین ہے (آل عمران، 3:83)۔

قرآن کا پیغام پوری انسانیت کے لیے ہے نہ کہ کسی مخصوص گروہ کے لیے۔ قرآن عالمی قدروں کو زندہ کرنا چاہتا ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قَالَ: لَنْ تُؤْمِنُوا حَتَّى تَرْحَمُوا، قَالُوا: كُلُّنَا رَحِيمٌ يَا رَسُولَ اللّٰهِ، قَالَ: إِنَّهُ لَيْسَ بِرَحْمَةِ أَحَدِكُمْ صَاحِبَهُ، وَلَكِنَّهَا رَحْمَةُ النَّاسِ، رَحْمَةُ الْعَامَّةِ (مسند ابی یعلیٰ، حدیث نمبر 4258)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم ہرگز مومن نہیں ہو سکتے جب تک تم رحم نہ کرو۔ لوگوں نے کہا کہ اے خدا کے رسول، ہم میں سے ہر شخص رحم کرنے والا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم اپنے ساتھی پر مہربانی کرو۔ بلکہ اس سے مراد تمام لوگوں اور تمام انسانوں کے ساتھ رحم کرنا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جب ایک شخص خدائے رب العالمین پر ایمان لاتا ہے تو عین اس کا ایمان ہی اس کے اندر آفاقی ذہن پیدا کر دیتا ہے۔ وہ فطرت سے جڑ جاتا ہے جو عین اپنی نوعیت کے اعتبار سے کائناتی ہے۔ وہ دریافت کرتا ہے کہ وہ وسیع تر انسانی برادری کا ایک جزء ہے کیونکہ ساری انسانی برادری ایک ہی خدا کی مخلوق اور اس کی عیال ہے۔

یہ آفاقی ذہن اس کے اندر آفاقی محبت کی پرورش کرتا ہے۔ سارے انسان اس کو اپنے دکھائی دینے لگتے ہیں۔ اس کے سینہ میں سارے انسانوں کی محبت کا چشمہ ابل پڑتا ہے۔ وہ سب کو اپنا سمجھنے لگتا ہے اور اپنے آپ کو سب کا۔

اسلام کی بنیاد پر بننے والے انسان کا مزاج اپنے آپ اس کو تمام انسانوں کا خیر خواہ بنا دیتا ہے۔ وہ تمام انسانوں سے محبت کرنے والا ہو جاتا ہے۔ تمام انسانوں کی خدمت کرنے کا جذبہ اس کے اندر امنڈ پڑتا ہے۔ وہ ہر اعتبار سے ایک آفاقی انسان بن جاتا ہے۔

احترام انسانیت

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے یہ اعلان فرمایا کہ: ہم نے آدم کی اولاد کو عزت دی اور ہم نے ان کو خشکی اور تری میں سوار کیا۔ اور ان کو پاکیزہ چیزوں کا رزق دیا اور ہم نے ان کو بہت سی مخلوقات پر فوقیت دی (17:70)۔ اس سے معلوم ہوا کہ انسان عین اپنی پیدائش کے اعتبار سے عزت و تکریم کا مستحق ہے۔ یہ تکریم ہر انسان کو فطری طور پر حاصل ہے، خواہ وہ ایک گروہ سے تعلق رکھتا ہو یا دوسرے گروہ سے۔

حدیث میں ہے کہ: لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَمْ يَرْحَمْ صَغِيرَنَا وَيُوَقِّرْ كَبِيرَنَا (سنن الترمذی، حدیث نمبر 1919)۔ یعنی، وہ شخص ہم میں سے نہیں ہے جو ہمارے چھوٹے پر رحم نہ کرے اور ہمارے بڑے کی عزت نہ کرے۔ اسی طرح حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اس کو چاہیے کہ وہ اپنے پڑوسی کی عزت کرے، جو شخص اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اس کو چاہیے کہ وہ اپنے مہمان کی عزت کرے: مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيُكْرِمْ جَارَهُ، وَمَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيُكْرِمْ ضَيْفَهُ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 6019)۔

قرآن و حدیث میں کثرت سے ایسے احکام ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ جو شخص خدا کے دین پر ایمان لائے اس پر لازم ہے کہ وہ خدا کے بندوں کا احترام کرے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی آدمی کی خدا پرستی کا اصل امتحان جہاں لیا جا رہا ہے وہ یہی لوگ ہیں۔ خدا سے تعلق کا اظہار اس دنیا میں دوسرے انسانوں سے تعلق کی شکل میں ہوتا ہے۔ خدا سے محبت کرنے والا، عین اپنے اندرونی جذبہ کے تحت خدا کے بندوں سے محبت کرنے لگتا ہے۔

انسان کا یا انسانیت کا احترام کرنا یہ اسلام کی ایک بنیادی تعلیم ہے۔ کوئی آدمی اپنے مذہب کا ہو یا دوسرے مذہب کا۔ اپنی قوم سے تعلق رکھتا ہو یا غیر قوم سے۔ اپنے ملک کا آدمی ہو یا کسی اور ملک کا باشندہ ہو، حتی کہ وہ دوست فرقہ سے تعلق رکھتا ہو یا دشمن فرقہ سے، ہر حال میں وہ قابل احترام ہے۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ اختلاف کے باوجود انسان کا احترام کیا جائے۔ اس کا رویہ اگر مخالفانہ ہو تب بھی اس کے رویہ کو نظر انداز کر کے اس کے ساتھ عزت کا سلوک جاری رکھا جائے۔ اسلام کی نظر میں ہر انسان انسان ہے، ہر انسان اس قابل ہے کہ اس کا احترام کیا جائے۔

سب پر سلامتی

اسلام میں زندگی کے جو آداب بتائے گیے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ جب دو آدمی آپس میں ملیں تو وہ ایک دوسرے کو سلام کریں۔ یعنی ایک شخص کہے کہ السلام علیکم

(تمہارے اوپر سلامتی ہو) اس کے بعد دوسرا شخص جواب میں کہے: وعلیکم السلام (تمہارے اوپر بھی سلامتی ہو)۔

سلام کا یہ کلمہ ایک قسم کی دعا ہے۔ ایک مومن کے دل میں دوسرے مومن کے لیے خیر خواہی کا جذبہ ہوتا ہے۔ یہ جذبہ مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ ان میں سے ایک مذکورہ سلام کا طریقہ ہے۔ سلام کی بہترین تشریح وہ ہے جو ابن عُیینہ (وفات 198ھ) سے نقل کی گئی ہے۔ انھوں نے کہا: کیا تم جانتے ہو کہ سلام کیا ہے۔ سلام کرنے والا دوسرے شخص سے کہتا ہے کہ تم مجھ سے محفوظ ہو: هَلْ تَدْرِي مَا السَّلَامُ يَقُولُ: أَنْتَ آمِنٌ مِنِّي (برالوالدین للبخاری، اثر نمبر 45)۔

سلام کی یہ تشریح بہت بامعنی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ میں ہر اعتبار سے تمہارا خیر خواہ ہوں۔ میری طرف سے تمہیں کوئی خطرہ نہیں۔ میں تمہارے لیے کوئی مسئلہ پیدا کرنے والا نہیں۔

تم سے میری گفتگو ہو تو میں ہرگز ایسا نہیں کروں گا کہ میں تم سے بدکلامی کرنے لگوں۔ تمہارے ساتھ میرا کوئی لین دین ہو تو میں تمہارے ساتھ غصب اور خیانت کا معاملہ نہیں کروں گا۔ بلکہ تمہارا جو حق ہے، اس کو انصاف اور دیانت کے ساتھ پورا پورا ادا کروں گا۔ تمہارے خلاف اگر مجھے کوئی شکایت ہو جائے تب بھی ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں عدل کے راستہ سے ہٹ جاؤں اور تمہارا دشمن بن کر تمہاری جڑ کاٹنے لگوں۔ تم سے اگر مجھے کوئی اختلاف ہو تو میں اس اختلاف کو جائز تنقید کے دائرہ میں رکھوں گا، میں اس کو عیب جوئی، الزام تراشی اور کردار کشی کی حد تک ہرگز نہیں لے جاؤں گا۔

السلام علیکم کوئی رسمی کلمہ نہیں، وہ بااصول زندگی گزارنے کا ایک عہد ہے۔ السلام علیکم

کہنے والا گویا اس بات کا اعلان کر رہا ہوتا ہے کہ روز مرّہ کی زندگی میں اس کا سلوک دوسروں کے ساتھ کیسا ہوگا۔ وہ سلامتی اور خیر خواہی کا ہوگا نہ کہ بے امنی اور بد خواہی کا۔

خدمت عام

قرآن میں اعلیٰ انسان کی جو صفات بتائی گئی ہیں، ان میں سے ایک صفت یہ ہے کہ — وہ لوگ جن کے مالوں میں مقرر حصہ ہے، سوال کرنے والے کے لیے بھی اور محروم کے لیے بھی: وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَعْلُومٌ ـ لِلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ (70:24-25)۔

یہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ دوسروں کے کام آئے۔ وہ دوسروں کی خدمت کر سکے۔ اسلام آدمی کے اس جذبہ کو آخری حد تک جگا دیتا ہے۔ جو آدمی مومنانہ اور مسلمانہ جذبات میں جی رہا ہو، وہ سمجھنے لگتا ہے کہ میرا مال یا میری چیزیں صرف میری نہیں ہیں۔ اس میں دوسروں کا بھی حق ہے۔ وہ نہ صرف ان لوگوں کی مدد کرتا ہے جو اس سے سوال کریں۔ بلکہ وہ ان کا بھی مددگار بن جاتا ہے جو ضرورت مند ہیں، اگرچہ انھوں نے کسی وجہ سے سوال نہیں کیا۔

قرآن میں محروم کا جو لفظ آیا ہے، اس کی تشریح امام مالک نے یہ کی ہے کہ اس سے مراد وہ ہے جو رزق سے محروم رہا (أَنَّهُ الَّذِي يُحْرَمُ الرِّزْقَ)۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ایک جانور کو دیکھا جو بھوکا تھا اور بظاہر اس کے کھانے کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ انھوں نے کہا کہ یہ بھی انھیں میں سے ہے جس کو قرآن میں محروم کہا گیا ہے۔ (تفسیر القرطبی، جلد 17، صفحہ 39) مفسر الرازی نے مزید توسیع دی ہے اور لکھا ہے کہ اس میں درخت بھی شامل ہیں۔ اگر کوئی درخت پانی نہ ملنے کی وجہ سے سوکھ رہا ہو تو وہ بھی محروم ہے، اور اس کو پانی پہنچانا اہل ایمان کی ذمہ داری ہے۔

ایمان جب کسی آدمی کے دل میں جگہ پاتا ہے تو اس کے اندر خدمتِ عام کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ نہ صرف سائل کی ضرورت پوری کرنے کو اپنی ذمہ داری سمجھتا ہے، بلکہ اس کا احساس یہ ہو جاتا ہے کہ ہر محروم کا اس کے اوپر حق ہے، خواہ وہ انسان ہو یا جانور یا کوئی درخت۔

اسلام آدمی کو انتہائی سنجیدہ اور انتہائی حساس بنا دیتا ہے۔ ایسا آدمی سارے لوگوں کو اپنا سمجھنے لگتا ہے، وہ جان لیتا ہے کہ اس کا مال خدا کا عطیہ ہے۔ اس کا یہ احساس اسے مجبور کرتا ہے کہ وہ اس کو خدا کی راہ میں خرچ کرے۔

رحمت، سیف

قرآن میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو رحمۃ للعالمین (21:107) کہا گیا ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ انا محمد... ونبی الرحمۃ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 2355)

ایک طرف پیغمبر اسلام کی حیثیت کے بارے میں اس قسم کے کھلے بیانات ہیں۔ دوسری طرف حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میرا رزق میرے نیزہ کے سایہ کے نیچے رکھا گیا ہے: جُعِلَ رِزْقِي تَحْتَ ظِلِّ رُمْحِي (صحیح البخاری، حدیث نمبر 2913)۔

ایک اور روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا: بُعِثْتُ بَيْنَ يَدَيِ السَّاعَةِ بِالسَّيْفِ (مسند احمد، حدیث نمبر 5115)۔ یعنی، میں قیامت سے پہلے تلوار کے ساتھ بھیجا گیا ہوں۔

یہ دونوں باتیں ایک دوسرے سے مختلف نظر آتی ہیں۔ مگر ان میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ یہ درحقیقت دو الگ الگ پہلو ہیں۔ رحمت کی بات ایک پہلو سے کہی ہے اور سیف کی بات دوسرے پہلو سے۔

اصل یہ ہے کہ صرف پیغمبر اسلام ہی رحمت کے پیغمبر نہ تھے۔ بلکہ خدا نے جتنے پیغمبر بھیجے وہ سب پیغمبر رحمت ہی تھے۔ سب کے سب دینِ رحمت ہی لے کر آئے۔ مثال کے طور پر قرآن میں حضرت موسیٰؑ کی کتاب کو رحمت فرمایا گیا ہے (11:17)۔ مگر فرق یہ ہے کہ پچھلے پیغمبروں کے ساتھ کوئی طاقت ور ٹیم تیار نہ ہو سکی جو پیغمبروں کے مشن کے حق میں موثر طور پر حمایت اور دفاع کا کام کر سکے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پچھلے پیغمبروں کے مشن کو مخالفین نے عملی طور پر آگے بڑھنے نہیں دیا۔ پچھلے پیغمبروں کے زمانہ میں خدا کا دین صرف فکری تحریک کے مرحلہ میں رہا، وہ فکری انقلاب کے مرحلہ تک نہیں پہنچا۔

اس کے برعکس پیغمبر اسلام کو خدا کی مدد سے ”اصحاب سیف“ بالفاظ دیگر، طاقت ور حمایت گروہ حاصل ہو گیا۔ چنانچہ مخالفین نے جب جارحیت کر کے آپ کے پر امن مشن کو دبانا اور مٹانا چاہا تو آپ بھی اپنے ساتھیوں کی مدد سے اس پوزیشن میں تھے کہ ان کی جارحیت کا موثر جواب دے کر ان کے مخالفانہ عزائم کو ناکام بنا دیں۔

مذکورہ قسم کی احادیث میں نیزہ اور تلوار کا لفظ آپ کی دفاعی طاقت کو بتانے کے لیے ہے نہ کہ آپ کی اصل پیغمبرانہ حیثیت کو بتانے کے لیے۔

جنگ کا حکم

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ (2:190)۔ یعنی، اور اللہ کے راستہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں اور زیادتی نہ کرو۔ بے شک اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

اعتداء کے معنی ہیں زیادتی کرنا، تجاوز کرنا۔ یہاں یہ لفظ جارحیت (aggression) کے معنی میں ہے۔ الراغب الاصفہانی نے یہاں اس کو جارحیت کے آغاز (الِاعْتِدَاءُ عَلَی سَبِیلِ الِابْتِدَاءِ) کے معنی میں لیا ہے (المفردات فی غریب القرآن، صفحہ 327)۔

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: أَیُّهَا النَّاسُ لَا تَتَمَنَّوْا لِقَاءَ الْعَدُوِّ وَسَلُوا اللّٰہَ الْعَافِیَةَ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 2966)۔ یعنی، تم لوگ دشمن سے مڈبھیڑ کی تمنا نہ کرو۔ اور اللہ سے عافیت مانگو۔

اس سے معلوم ہوا کہ اسلام مکمل طور پر امن کا مذہب ہے۔ اسلام میں امن کی حیثیت حکم عام کی ہے اور جنگ کی حیثیت صرف استثناء کی۔ یہ استثنائی حکم اس وقت کے لیے ہے جب کہ کسی نے یک طرفہ طور پر جنگ کا آغاز کر دیا ہو۔ اس وقت دفاع کے طور پر جنگ کی جائے۔ مگر خود سے جنگ چھیڑنے کی اجازت اسلام میں نہیں۔

تاہم یہ دفاع بھی ایک ضروری شرط کے ساتھ مشروط ہے، اور وہ اعراض ہے۔ سنت رسولؐ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ فریق ثانی اگر جنگ کے حالات پیدا کرے تب بھی ابتدائی کوشش اسی کی ہوگی کہ عملی طور پر جنگ کی نوبت نہ آئے۔ لیکن اگر ایسا ہو کہ جنگ سے بچنے کی ہر کوشش ناکام ہو جائے اور فریق ثانی کی طرف سے جنگ کا عملی آغاز کر دیا جائے تو اس وقت آخری چارۂ کار کے طور پر جنگ کی جائے گی۔

اسلام ملک گیری کا مذہب نہیں۔ وہ مکمل طور پر ایک دعوتی مذہب ہے۔ اور دعوت کا کام ہمیشہ امن چاہتا ہے، جنگ کا ماحول دعوتی کام کے لیے ہرگز مناسب نہیں۔ امن میں دعوت کو فروغ حاصل ہوتا ہے اور جنگ میں دعوت کا کام معطل ہو جاتا ہے۔

بین اقوامی رواج

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری زمانہ میں عرب کے دو آدمیوں نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ ایک یمامہ کا مسیلمہ بن حبیب، اور دوسرا صنعاء کا اسود بن کعب عنسی۔ مسیلمہ نے 10 ھ میں ایک خط رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا۔ اس خط کا مضمون یہ تھا: اللہ کے رسول مسیلمہ کی جانب سے اللہ کے رسول محمد کے نام، سلام علیک، اما بعد، بے شک میں نبوت کے معاملہ میں آپ کے ساتھ شریک کیا گیا ہوں، اس لیے نصف زمین ہمارے لیے اور نصف زمین قریش کے لیے۔ مسیلمہ کی طرف سے دو قاصد اس کا یہ خط لے کر مدینہ آئے۔ ان کا نام ابن النواحہ اور ابن اُثال تھا۔ اس کے بعد روایت میں آتا ہے:

قال سمعت رسول اللّٰہ صلے اللّٰہ علیه وسلم حین جاء ہ رسولا مسیلمة الکذاب بکتابه یقول لهما: وانتما تقولان مثل مایقول۔ قالا نعم۔ فقال اَما واللّٰہ لولا اَن الرُسل لا تُقتل لضربتُ اعناقکما۔

قال: سَمِعتُ رسولَ اللّٰهِ صلی اللّٰه علیه وسلم حینَ جاءَہ رسولا مُسَیلِمَةَ الکَذّابِ بکِتابِه، ورسولُ اللّٰهِ صلی اللّٰه علیه وسلم یقولُ لَهُما: ”وأَنتُما تَقولانِ مِثلَما یقولُ“ فقالا: نعَم. فقالَ: أما واللّٰهِ لَولا أن الرُّسُلَ لا تُقتَلُ لَضَرَبتُ أعناقَکُما (البدایة والنہایہ، جلد 5، صفحہ نمبر 52-51)۔ یعنی، راوی کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا جب کہ مسیلمہ کذاب کے دونوں قاصد اس کا خط لے کر آئے، کیا تم دونوں بھی وہی کہتے ہو جو وہ کہتا ہے۔ دونوں نے کہا کہ ہاں۔ آپ نے فرمایا کہ خدا کی قسم، اگر یہ بات نہ ہوتی کہ قاصدوں کو قتل نہیں کیا جاتا تو میں تم دونوں کی گردنیں کٹوا دیتا۔

راوی حضرت عبداللہ بن مسعود کہتے ہیں کہ: فَمَضَتِ السُّنَّةُ بِأَنَّ الرُّسُلَ لَا تُقْتَلُ (البدایہ والنہایہ، جلد 7، صفحہ 260)۔ یعنی، پھر یہ سنت جاری ہوگئی کہ قاصدں کو قتل نہ کیا جائے۔

اس سنت نبوی سے اسلام کا ایک نہایت اہم اصول معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ بین اقوامی معاملات میں بین اقوامی رواج پر عمل کیا جائے گا۔ ہر زمانہ میں بین اقوامی تعلقات کے لیے کچھ رواج ہوتے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں بھی اس قسم کے بہت سے رواج ہیں۔ اب اقوام متحدہ نے ان کو زیادہ منظم صورت دے دی ہے۔ اس قسم کے تمام رواج مسلم ملکوں میں بھی اسی طرح قابل احترام ہوں گے جس طرح غیر مسلم ملکوں میں ان کو قابل احترام سمجھا جاتا ہے۔ البتہ اگر اس قسم کے معاملات میں کوئی ایسی چیز رواج پا جائے جو صراحتہً حرام ہو۔ مثلاً بین اقوامی میٹنگوں میں شراب پیش کرنا، تو اس مخصوص جزء کی حد تک اس کی پیروی نہیں کی جائے گی۔

فرشتہ کی مدد

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ: أَنَّ رَجُلًا شَتَمَ أَبَا بَكْرٍ وَالنَّبِيُّ صلى الله عليه وسلم جَالِسٌ، فَجَعَلَ النَّبِيُّ صلى الله عليه وسلم يَعْجَبُ وَيَتَبَسَّمُ، فَلَمَّا أَكْثَرَ رَدَّ عَلَيْهِ بَعْضَ قَوْلِهِ، فَغَضِبَ النَّبِيُّ صلى الله عليه وسلم وَقَامَ، فَلَحِقَهُ أَبُو بَكْرٍ، فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ كَانَ يَشْتُمُنِي وَأَنْتَ جَالِسٌ، فَلَمَّا رَدَدْتُ عَلَيْهِ بَعْضَ قَوْلِهِ غَضِبْتَ وَقُمْتَ! قَالَ: إِنَّهُ كَانَ مَعَكَ مَلَكٌ يَرُدُّ عَنْكَ، فَلَمَّا رَدَدْتَ عَلَيْهِ بَعْضَ قَوْلِهِ، وَقَعَ الشَّيْطَانُ (مسند احمد، حدیث نمبر 9624)۔

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک آدمی نے حضرت ابوبکر کو برا کہا (حضرت ابوبکر چپ رہے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں بیٹھے ہوئے تھے، آپ تعجب کر رہے تھے اور مسکرا رہے تھے۔ پھر جب اس شخص نے بہت زیادہ کہا تو حضرت ابوبکر نے اس کی بعض

باتوں کا جواب دیا۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو غصہ آ گیا۔ آپ وہاں سے اٹھ گئے۔ حضرت ابوبکر چل کر آپ سے ملے اور کہا کہ اے خدا کے رسول وہ آدمی مجھ کو برا کہہ رہا تھا اور آپ وہاں بیٹھے ہوئے تھے (اور خوش تھے) لیکن جب میں نے اس کی بعض بات کا جواب دیا تو آپ غصہ ہو گئے اور وہاں سے اٹھ گئے۔ آپ نے فرمایا کہ (جب تم چپ تھے) تو تمہارے ساتھ ایک فرشتہ تھا جو اس کا جواب دے رہا تھا۔ مگر جب تم نے خود اس کی بات کا جواب دیا تو فرشتہ چلا گیا اور شیطان آ گیا۔

ایک آدمی آپ کو برا کہے۔ اس کے جواب میں آپ بھی اس کو برا کہیں تو بات بڑھتی ہے۔ جس آدمی نے پہلے صرف ایک سخت لفظ کہا تھا۔ اس کے بعد وہ سبّ وشتم پر اتر آتا ہے۔ وہ اپنے ہاتھ پاؤں سے آپ کو تکلیف پہنچانا چاہتا ہے۔ یہاں تک کہ آخر میں پتھر اٹھا لیتا ہے۔ آپ کا جواب نہ دینا اس کو ابتدائی حد پر روک دیتا ہے، اور آپ کا جواب دینا اس کو اس کی آخری حد پر پہنچا دیتا ہے۔

اس کے بجائے اگر ایسا ہو کہ ایک شخص آپ کو برا کہے یا گالی دے مگر آپ خاموش ہو جائیں۔ آپ اشتعال انگیز کلام کے باوجود مشتعل نہ ہوں، تو آپ دیکھیں گے کہ اس کا لہجہ آہستہ آہستہ دھیما ہو رہا ہے۔ اس کے غبارے کی ہوا نکلنا شروع ہو جائے گی۔ یہاں تک کہ دھیرے دھیرے وہ اپنے آپ چپ ہو جائے گا۔ آپ کا بولنا دوسرے کو مزید بولنے پر آمادہ کرتا ہے، اور اگر آپ چپ ہو جائیں تو آپ کا چپ ہونا آخر کار دوسرے شخص کو بھی چپ ہونے پر مجبور کر دے گا۔

دونوں صورتوں میں یہ فرق کیوں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب برا کرنے والے کا جواب برائی سے دیا جائے تو اس کے اندر ردعمل کی نفسیات پیدا ہوتی ہے۔ اب شیطان کو موقع مل جاتا ہے کہ وہ اس کی انا کو جگائے۔ وہ اس کے غصہ کو بڑھا کر اس کو آخری درجہ

تک پہنچا دے۔ وہ برائی جو اس کے اندر سوئی ہوئی تھی، وہ پوری طرح جاگ کر آپ کے بالمقابل کھڑی ہوجاتی ہے

اس کے برعکس جب برا کرنے والے کے ساتھ اعراض کا معاملہ کیا جائے تو اس کے اندر خود احتسابی کی نفسیات جاگتی ہے۔ اب فرشتہ کو موقع ملتا ہے کہ وہ آدمی کی فطرت کو بیدار کرے۔ وہ اس کے ضمیر کو متحرک کرنے کی کوشش کرے۔ وہ اس کے اندر شرمندگی کا جذبہ پیدا کرے۔ وہ اس کو اپنی اصلاح پر ابھارے۔

پہلی صورت میں آدمی شیطان کے زیر اثر چلا جاتا ہے اور دوسری صورت میں فرشتہ کے زیر اثر۔ ایک واقعہ کی صورت میں دوسرے کو ملزم ٹھہرا کر اس سے انتقام لینے کے جذبات بھڑکتے ہیں اور دوسرے واقعہ کی صورت میں اپنے کو ذمہ دار ٹھہرا کر اپنی اصلاح کرنے کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔

ہر آدمی کے سینہ میں دو طاقتیں چھپی ہوئی ہیں۔ ایک طاقت آپ کی موافق ہے جس کی نمائندہ آدمی کا ضمیر ہے۔ دوسری طاقت آپ کی مخالف ہے۔ اس کی نمائندہ آدمی کی انا ہے۔ اب یہ آپ کے اپنے اوپر ہے کہ آپ دونوں میں سے کس طاقت کو جگاتے ہیں۔ آپ اپنے قول و عمل سے جس طاقت کو جگائیں گے وہی آپ کے حصہ میں آئے گی۔

ایک طاقت کو جگانے کی صورت میں فریق ثانی آپ کا دشمن بن جائے گا۔ اور اگر آپ نے دوسری طاقت کو جگایا تو خود فریق ثانی کے اندر ایک ایسا عنصر نکل آئے گا جو آپ کی طرف سے عمل کر کے اس کو آپ کے مقابلہ میں مغلوب و مفتوح بنا دے۔

مذکورہ واقعہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس آدمی پر غصہ نہیں ہوئے جو بدکلامی کر رہا تھا۔ مگر حضرت ابوبکر صدیق کی زبان سے برا کلمہ نکلا تو آپ غصہ ہو گئے۔ گدھے کے لیے شریعت میں اعراض کا اصول ہے اور انسان کے لیے امر بالمعروف کا اصول۔

عام طور پر لوگ جواب دینے کو دفاع سمجھتے ہیں۔ اگر کسی شخص سے کوئی تکلیف پہنچے تو فوراً اس سے مقابلہ کرنے کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور ان کا خیال یہ ہوتا ہے کہ وہ دفاع کر رہے ہیں، مگر اس سے بھی زیادہ بڑا دفاع یہ ہے کہ زیادتی کے جواب میں آدمی خاموش ہو جائے۔ مقابلہ کے بجائے وہ اعراض کا طریقہ اختیار کرے۔

خاموشی بے عملی نہیں ہے بلکہ وہ سب سے بڑا عمل ہے۔ آدمی جب جوابی ٹکراؤ کرتا ہے تو وہ صرف اپنی ذات پر بھروسہ کر رہا ہوتا ہے۔ مگر جب وہ زیادتی کے بعد چپ ہو جاتا ہے تو وہ پورے نظام فطرت کو اپنی طرف سے مقابلہ کرنے کے لیے کھڑا کر دیتا ہے۔ ذاتی دفاع ایک کمزور دفاع ہے۔ اور فطرت کا دفاع زیادہ طاقت ور دفاع۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی دنیا میں یہ نظام قائم کیا ہے کہ جب بھی کہیں کوئی گندگی پیدا ہوتی ہے تو فوراً بے شمار بیکٹیریا وہاں جمع ہو کر اس مادہ کو (decompose) کرنا شروع کر دیتے ہیں تاکہ گندگی کا خاتمہ کر سکیں۔ اسی طرح یہ بھی اللہ تعالیٰ کا قائم ہوا نظام ہے کہ جب کوئی انسان کسی کے اوپر زیادتی کرے تو پورا نظام فطرت اس کی اصلاح کے لیے حرکت میں آ جائے۔

اس اعتبار سے خاموشی گویا ایک قسم کا انتظار ہے۔ جب آدمی زیادتی پر خاموش ہو جاتا ہے تو گویا وہ اپنے آپ کو حالتِ انتظار کی طرف لے جاتا ہے۔ وہ عالمی ضمیر کو کام کرنے کا موقع دے کر اس کے نتیجہ کا منتظر ہو جاتا ہے۔

ایسی حالت میں آدمی کو چاہیے کہ وہ خود اقدام کر کے فطرت کے عمل میں بگاڑ نہ پیدا کرے۔ بلکہ انتظار کی پالیسی اختیار کر کے فطرت میں ہونے والے عمل کے ساتھ تعاون کرے۔

اِذن اللہ

قرآن میں ہے: كَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللهِ (کتنی ہی چھوٹی جماعتیں اللہ کے حکم سے بڑی جماعتوں پر غالب آتی ہیں (2:249)۔ یہ موجودہ دنیا کے لیے اللہ کا قانون ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں عزّت اور برتری صرف انھیں لوگوں کا مقدر نہیں ہے جو تعداد اور وسائل میں زیادہ ہوں۔ یہاں کم تعداد اور کم وسائل والا گروہ بھی عزت اور سربلندی حاصل کرسکتا ہے، بشرطیکہ وہ اذن اللہ کی پیروی کرے۔

یہ اذن اللہ یا خدائی قانون کیا ہے، وہ الرعد (13:17) کے مطابق یہ ہے کہ جو چیز لوگوں کو نفع پہنچانے والی ہے، وہ زمین میں ٹھہراؤ اور استحکام حاصل کرتی ہے: وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ۔ یہی بات حدیث میں اس طرح بیان کی گئی ہے کہ اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے: اَلْيَدُ اَلْعُلْيَا خَيْرٌ مِنَ اَلْيَدِ اَلسُّفْلَى (صحیح البخاری، حدیث نمبر 1427)۔ یعنی، جو ہاتھ دوسروں کو دیتا ہے، وہ اس سے بہتر ہے جو دوسرں سے لینے والا ہے۔ اس کو ایک لفظ میں اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ سماج میں ہمیشہ دو قسم کے گروہ ہوتے ہیں۔ ایک دینے والا گروہ (giver group) اور دوسرا لینے والا گروہ (Taker group) زندگی کا یہ ابدی قانون ہے کہ جو گروہ لینے والا ہو اُس کو اِس دنیا میں پستی اور مغلوبیت کی سطح پر جگہ ملے۔ اور جو گروہ دینے والا گروہ بنے، اس کو دوسروں کے اوپر عزّت اور برتری کا مقام حاصل ہو۔

موجودہ زمانہ میں مسلم رہنماؤں نے احیاءِ ملّت کے نام سے جو تحریکیں اٹھائیں، وہ زندگی کے اس شعور سے یکسر خالی تھیں۔ یہ لوگ اس بات کو نہ جان سکے کہ مسلمانوں کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ انھیں تخلیقی گروہ کی حیثیت سے اٹھایا جائے۔ اس کے بجائے انھوں نے

مسلمانوں کوعلٰحدگی پسند گروہ (Separatist group) کے طور پر اٹھانے کی کوشش کی۔ 1947ء سے پہلے اس علٰحدگی پسندی کا اظہار جغرافیائی تقسیم کی شکل میں ہوا، اور 1947ء کے بعد ملّی تشخص کی حفاظت کی صورت میں ہورہا ہے۔

مسلمانوں کی ترقی کا راز علٰحدگی پسندی میں نہیں بلکہ آفاقیت پسندی میں ہے۔ انھیں تخلیقی گروہ بننا ہے نہ کہ جامد گروہ۔ انھیں اپنا امتیاز خارجی مظاہر میں نہیں بلکہ معنوی حقیقتوں میں قائم کرنا ہے۔ وہ نفع بخشی کی زمین پر کھڑے ہوسکتے ہیں نہ کہ حقوق طلبی کی زمین پر۔

دعا بھی عمل

ابن اسحاق نے روایت کیا ہے کہ کہ مکی دور میں قبیلہ دوس کے ایک شخص طفیل بن عَمر والدوسی آپ کے پاس آئے۔ انھوں نے آپ سے قرآن کو سنا اور پھر اسلام قبول کرلیا۔ اس کے بعد آپ کی اجازت سے وہ اپنے قبیلہ میں واپس گئے اور ان کو اسلام کی طرف بلانا شروع کیا مگر قبیلہ کے لوگوں نے انکار اور سرکشی کا رویہ اختیار کیا۔ طفیل بن عمرو دوبارہ آپ کے پاس آئے اور کہا کہ قبیلہ دوس کے لوگ حق کے معاملہ میں سرکشی کررہے ہیں۔ آپ ان کے خلاف بددعا کیجیے۔ آپ نے اس کے برعکس ہاتھ اٹھایا اور ان کے حق میں دعا کرنا شروع کیا: اے اللہ، تو قبیلہ دوس کو ہدایت دے، اے اللہ تو قبیلہ دوس کو ہدایت دے۔ پھر آپ نے طفیل بن عمرو سے کہا کہ اپنے قبیلہ کی طرف واپس جاؤ اور اس کو دوبارہ دعوت دو۔ اور اس کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرو (سیرت ابن ہشام، جلد 1، صفحہ 384-382)

یہ دعا اور یہ نصیحت کوئی سادہ سی بات نہیں تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ آپ نے طفیل بن عمرو کو منفی نفسیات سے نکال کر مثبت نفسیات کی طرف موڑ دیا۔ جن لوگوں کے بارے میں ان کے اندر بیزاری کا جذبہ پیدا ہوگیا تھا ان کے لیے ان کے اندر خیر خواہی کا جذبہ بیدار کردیا۔

جس معاملہ میں طفیل بن عمرو صرف حال کو دیکھ رہے تھے اس معاملہ میں آپ نے ان کے اندر مستقبل کو دیکھنے کی نظر پیدا کر دی۔

دعا ایک اعتبار سے خدا سے مانگنا ہے۔ اور دوسرے اعتبار سے وہ اپنی نفسیات کی صالح تربیت ہے۔ وہ اپنے اندر ربانی طاقت کو بیدار کرنا ہے۔ طفیل بن عمرو جب اس نئی نفسیات کے ساتھ دوبارہ اپنے قبیلہ میں گئے تو وہ گویا ایک نئے انسان بن چکے تھے۔ اب وہ اس قابل تھے کہ زیادہ موثر انداز میں حق کی دعوت ان لوگوں کے سامنے پیش کر سکیں۔ اس کے بعد نتیجہ ظاہر تھا۔ پورے قبیلہ نے اسلام قبول کر لیا۔

جس سوسائٹی میں لوگ ایک دوسرے کے اتنے خیر خواہ بن جائیں کہ وہ ایک دوسرے کے لیے خدا سے دعا کرنے لگیں وہاں اس کا لازمی فائدہ یہ ہوگا کہ پوری سوسائٹی میں مثبت نفسیات کو فروغ حاصل ہوگا، اور بلاشبہہ سوسائٹی بنانے کے لیے سب سے زیادہ ضروری جو چیز مطلوب ہے وہ یہی مثبت نفسیات ہے۔

رحمت کلچر

اسلام رحم اور مواسات کا دین

رحمت کلچر

اسلامی کلچر رحمت کلچر ہے۔ اسلام میں رحمت کا پہلو اتنا زیادہ نمایاں ہے کہ وہ ان لوگوں کی پوری زندگی پر چھا جاتا ہے جو اسلام کے اصولوں کو پوری طرح اختیار کرلیں۔

اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ ایک آدمی دوسرے آدمی سے ملے تو وہ کہے السلام علیکم ورحمۃ اللہ (تمہارے اوپر اللہ کی سلامتی ہو اور اللہ کی رحمت ہو) ایک شخص کو چھینک آئے تو وہ کہے: الحمدللہ۔ اور سننے والا کہے: یرحمک اللہ (اللہ تمہارے اوپر رحمت کرے) نماز کے لیے مسجد میں داخل ہو تو کہے: اللّٰھم افتح لی ابواب رحمتک (اے اللہ، مجھ پر رحمت کے دروازے کھول دے) اسی طرح نمازی لوگ جب نماز کو ختم کرتے ہیں تو وہ اپنے دائیں اور بائیں منہ پھیر کر کہتے ہیں: السلام علیکم ورحمۃ اللہ (تم لوگوں کے اوپر اللہ کی سلامتی اور اللہ کی رحمت ہو)۔

اس طرح ہر موقع پر اور ہر مرحلہ میں سلامتی اور رحمت کے کلمات لوگوں کے منہ سے نکلتے ہیں۔ رحمت کے انداز میں سوچنا اور رحمت کے انداز میں بولنا یہ اہل ایمان کی امتیازی صفت بن جاتی ہے۔ ان کی پوری زندگی رحمت والفت کے تقاضوں میں ڈھل جاتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کثرت سے ایسے کلمات منقول ہیں جن کا آغاز اس طرح کے الفاظ سے ہوتا ہے: رَحِمَ اللّٰہُ امْرَأً (سنن الترمذی، حدیث نمبر 430) رَحِمَ اللّٰہُ رَجُلًا (صحیح البخاری، حدیث نمبر 2076) رَحِمَكَ اللّٰہُ (سنن الترمذی، حدیث نمبر 1057) رَحِمَ اللّٰہُ امْرَأَةً (سنن ابو داؤد، حدیث نمبر 1308) یَرْحَمُ اللّٰہُ نِسَاءَ الْمُھَاجِرَاتِ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 4758) یَرْحَمُكَ اللّٰہُ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 6226)، وغیرہ۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام لوگوں کے اندر کس قسم کا مزاج بنانا چاہتا ہے۔ وہ دراصل رحمت ومحبت کا مزاج ہے۔ اسلام کا تقاضا یہ ہے کہ ہر موقع پر ایک آدمی کے اندر

دوسرے آدمی کے لیے رحمت کے جذبات ابھریں۔ ہر موقع پر ایک آدمی دوسرے آدمی کو رحمت والفت کا تحفہ پیش کرے۔حتی کہ اظہار اختلاف کا موقع ہو تب بھی مومن کی زبان سے ایسے الفاظ نکلتے ہیں کہ: خدا تمہارے اوپر رحم کرے، تم نے ایسا کیوں کر کہا۔

خدا رحیم ہے، وہ چاہتا ہے کہ اس کے بندے بھی رحیم بن کر دنیا میں رہیں۔

آفاقیت نہ کہ محدودیت

قرآن میں رب العالمین ہے (1:2)، رب القوم نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام آفاقیت کو پسند کرتا ہے نہ کہ محدودیت کو۔ قرآن میں پیغمبرؐ کو رحمت (21:107) عالم کہا گیا ہے، آپ کو زحمت عالم نہیں کہا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام محبت کا مذہب ہے، وہ نفرت کا مذہب نہیں۔ قرآن میں الصلح خیر (4:128) ہے، قرآن میں الحرب خیر نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام صلح کا ماحول لانا چاہتا ہے نہ کہ جنگ اور ٹکراؤ کا ماحول۔

قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ پڑھو (العلق، 96:1)۔ یہ نہیں فرمایا کہ گولی مارو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام علم کلچر کا نام ہے نہ کہ گن کلچر کا۔ قرآن میں صبر (39:10) پر زور دیا گیا ہے، قرآن میں بے صبری کی تعلیم نہیں دی گئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام یہ چاہتا ہے کہ لوگوں کی ایذاؤں پر تحمل سے کام لیا جائے، نہ یہ کہ کسی سے ایذا پہنچے تو مشتعل ہو کر اس سے لڑائی شروع کر دی جائے۔ قرآن میں بلند اخلاقی (خلق عظیم) (68:4) کی تعریف کی گئی ہے نہ کہ برابری کے اخلاق کی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کے نزدیک صحیح طریقہ یہ ہے کہ دوسروں کے سلوک کو نظر انداز کر کے ان کے ساتھ اعلیٰ اخلاق کا معاملہ کیا جائے۔

ان چند حوالوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام کیا ہے۔ اور اسلامی کلچر حقیقۃً کسے کہتے ہیں۔ اسلام خداوند عالم کی حیثیت خداوندی کا ظہور ہے۔ اسلام ساری کائنات کا دین ہے۔ اسلام وسیع تر انسانیت کا نمائندہ ہے۔ ایسی حالت میں اسلام کی وہی تشریح درست ہوگی جو اس کی ان حیثیتوں سے مطابقت رکھتی ہو۔ جو تشریح اسلام کے ان اعلیٰ تقاضوں کے مطابق نہ ہو وہ صحیح اسلامی تشریح بھی نہیں۔

سچا اسلام وہ ہے جو لوگوں کے اندر خدا کا خوف پیدا کرے۔ جو لوگوں میں دنیا پرستی کے مقابلہ میں آخرت پسندی کا ذہن بنائے۔ جو لوگوں کے دلوں میں انسان کی محبت پیدا کرے۔ جو لوگوں کو اپنے اور غیر کا فرق کیے بغیر سب کا خیر خواہ بنائے۔ جس کا نتیجہ یہ ہو کہ آدمی اپنے حقوق سے زیادہ اپنی ذمہ داریوں پر نظر رکھنے لگے۔

اسلام جن لوگوں کے دلوں میں اترتا ہے وہ انھیں رحمت اور سلامتی کا پیکر بنا دیتا ہے۔ اسلام اور نفرت وعداوت دونوں ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔

حقیقتِ اسلام

جہاد کے لفظی معنی جدوجہد کے ہیں۔ اسلام میں با مقصد کوشش ہے، اسلام میں لڑ کر مر جانا نہیں۔ اسلام آدمی کو ایک تعمیری مشن دیتا ہے۔ اور مشن کا تقاضا ہے کہ آدمی اس کو برروئے کار لانے کے لیے اپنی خداداد صلاحیتوں کا نتیجہ خیز استعمال کرے نہ کہ بے فائدہ طور پر لڑ کر اپنا خاتمہ کر لے۔ مکہ میں پیغمبر اسلامؐ اپنے دشمنوں سے لڑ کر شہید نہیں ہو گئے بلکہ آپ مکہ چھوڑ کر مدینہ چلے گئے تاکہ اپنے ربانی مشن کو جاری رکھنے کا موقع پا سکیں۔

قرآن میں کہیں بھی مطلق طور پر یہ بات نہیں کہی گئی ہے کہ اللہ کے لیے لڑ کر مر جاؤ۔ اس

کے برعکس یہ فرمایا کہ اللہ کے لیے صبر کرو (ولربک فاصبر 92:07) قرآن میں پیغمبر اسلامؐ کو رحمۃ للعالمین (21:107) کہا گیا ہے، قرآن میں کہیں بھی آپ کو سیف اللہ علی العالمین (دنیا والوں کے اوپر اللہ کی تلوار) نہیں فرمایا گیا۔ قرآن میں الصلح خیر (4:128) کی آیت نازل ہوئی ہے مگر قرآن میں الحرب خیر کے مضمون کی کوئی آیت موجود نہیں۔ قرآن میں ہے کہ: إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسابٍ (39:10)۔ یعنی، صبر کرنے والے بے حساب اجر پائیں گے۔ مگر قرآن میں کہیں یہ نہیں فرمایا کہ: إِنَّمَا يُوَفَّى الْمُقَاتِلُونَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ۔ یعنی، جنگ کرنے والے بے حساب اجر پائیں گے۔

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: أَيُّهَا النَّاسُ لَا تَتَمَنَّوْا لِقَاءَ الْعَدُوِّ وَسَلُوا اللَّهَ الْعَافِيَةَ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 2966)۔ یعنی، دشمن سے جنگی مڈبھیڑ کی تمنا نہ کرو، تم اللہ سے عافیت مانگو۔ حدیث کے ذخیرہ میں آپ کا کوئی قول اس مضمون کا نہیں کہ: عَلَيْكُمْ أَنْ لَا تُحِبُّوا لِقَاءَ الْعَدُوِّ، وَاسْأَلُوا اللَّهَ الْعَافِيَةَ۔ یعنی، تم کو چاہیے کہ دشمن سے مڈبھیڑ چاہو اور اللہ سے جنگ کی دعا کرو۔ مکہ کی مہم میں ایک مسلمان نے کہا کہ: الْيَوْمَ يَوْمُ الْمَلْحَمَةِ۔ یعنی، آج گھمسان کا دن ہے۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں، الْيَوْمَ يَوْمُ الْمَرحَمَةِ (تاریخ دمشق لابن عساکر، جلد 23، صفحہ 454)۔ یعنی، آج رحمت کا دن ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی کلچر رحمت کلچر ہے، وہ گن کلچر نہیں۔ اسلام انسانوں کے درمیان ہر حال میں معتدل اور پُر امن تعلقات قائم کرنا چاہتا ہے، خواہ اس کے لیے فریق ثانی کی یک طرفہ شرطوں پر صلح کر لینا پڑے، جیسا کہ حدیبیہ کے موقع پر کیا گیا۔ اہل ایمان کا کام نہ سر کاٹنا ہے اور نہ سر کٹوانا۔ اہل ایمان کا کام یہ ہے کہ وہ دنیا میں خدا کے متواضع بندے بن کر رہیں۔ وہ برے سلوک کے جواب میں اچھا سلوک کریں۔ وہ اعلیٰ اخلاق کے ذریعہ

لوگوں کے دلوں میں معرفتِ حق کے چشمے جاری کریں۔ وہ خود بھی ربانی انسان بنیں اور دوسروں کو بھی ربانی انسان بنانے میں اپنی ساری طاقت لگا دیں۔

پیغمبرؐ کا طریقہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں جو غزوات ہوئے ان میں سے ایک غزوۂ بنی المُصطلِق ہے۔ یہ غزوہ 5ھ میں پیش آیا۔ اس سے واپسی میں آپ مُریسیع کے چشمہ پر ٹھہرے۔ یہاں پانی کے سوال پر دو آدمیوں میں جھگڑا ہو گیا۔ ایک کا تعلق مہاجرین سے تھا اور دوسرے کا تعلق انصار سے۔ انصاری نے انصار کے گروہ کو پکارتے ہوئے کہا: يَا مَعْشَرَ الْأَنْصَارِ۔ مہاجر نے مہاجرین کے گروہ کو پکارتے ہوئے کہا: يَا مَعْشَرَ الْمُهَاجِرِينَ۔

یہ دو آدمیوں کے ذاتی جھگڑے کو دو گروہ کا قومی جھگڑا بنانا تھا۔ اسی کو عصبیت جاہلیت کہا جاتا ہے۔ اور اسلام میں عصبیت جاہلیت کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔

مدینہ کا عبداللہ بن ابی جو پہلے سے مہاجرین کے خلاف بغض اپنے دل میں لیے ہوئے تھا، اس نے فوراً اس موقع کو استعمال کیا۔ اس نے کہا کہ اچھا، ان مہاجرین کے حوصلے اتنے بڑھ گئے ہیں۔ وہ مکہ سے ہمارے شہر میں آئے اور اب وہ ہمارے ہی اوپر غالب ہونا چاہتے ہیں۔ یہ تو وہی مثل ہے کہ اپنے کتّے کو موٹا کر کہ وہ تجھ کو ہی کھا جائے۔ خدا کی قسم، ہم جب سفر سے واپس لوٹ کر مدینہ پہنچیں گے تو ہم میں سے جو طاقتور ہے وہ کمزور کو وہاں سے نکال باہر کرے گا۔

عبداللہ بن ابی اس طرح وطنی اور قبائلی عصبیت جگا کر مدینہ والوں کو مکہ والوں کے خلاف بھڑکانے لگا۔ حضرت عمرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ آپ ہم میں سے کسی

کوحکم دیجئے کہ وہ جا کرعبداللہ بن ابی کوقتل کردے۔اس کے بعد اُسید بن حُضیر آپ سے ملے اور کہا کہ اے خدا کے رسولؐ، آپ عبداللہ بن ابی کے ساتھ نرمی کا معاملہ کیجئے۔ وہ مدینہ کا سردار تھا، آپ کے آنے کے بعد اس کی حیثیت ختم ہوگئی۔ وہ سمجھتا ہے کہ آپ نے اس کی حکومت اس سے چھین لی ہے۔

اس معاملہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دومشورہ آیا۔ایک تشدد کا اور دوسرا نرمی اور درگزر کا۔آپ نے پہلے طریقہ کوچھوڑ دیا اور دوسرے طریقہ کو اختیار فرمایا۔ چنانچہ آپ نے عبداللہ بن ابی کے خلاف کارروائی کیے بغیر فوری طور پر مریسیع سے کوچ کا حکم دے دیا اور اس وقت تک نہیں رکے جب تک مدینہ پہنچ نہیں گئے۔(سیرت ابن ہشام، جلد 3، صفحہ 334-335)

صبر وتوکل

وَالَّذِينَ هاجَرُوافِي اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مَا ظُلِمُوا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيا حَسَنَةً وَلَأَجْرُ الْآخِرَةِ أَكْبَرُ لَوْ كانُوا يَعْلَمُونَ. الَّذِينَ صَبَرُوا وَعَلى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ (16:41-42)۔یعنی، اور جن لوگوں نے اللہ کے لیے اپنا وطن چھوڑا، بعد اس کے کہ ان پر ظلم کیا گیا، ہم ان کو دنیا میں ضرور اچھا ٹھکانہ دیں گے اور آخرت کا ثواب تو بہت بڑا ہے، کاش وہ جانتے۔ وہ ایسے ہیں جو صبر کرتے ہیں اور اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں۔

قرآن کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ صبر کے ساتھ توکل کا نہایت گہرا تعلق ہے۔ صبر ایک عظیم دینی عمل ہے۔مگر دنیا میں صبر کی روش پر وہی لوگ قائم رہ سکتے ہیں جو اللہ رب العلمین کی ذات پر بے پناہ بھروسہ رکھتے ہوں۔

اس آیت میں جن اہل ایمان کا ذکر ہے، یہ وہ لوگ تھے جن پر ان کے مخالفوں نے ظلم کیا۔ مگر وہ منفی ردعمل میں مبتلا نہیں ہوئے۔ ان کے اندر یہ جذبہ نہیں بھڑکا کہ وہ ظالموں کو سبق سکھائیں۔ یا ان سے ان کے ظلم کا انتقام لیں۔ اس کے بجائے انھوں نے یہ کیا کہ خاموشی کے ساتھ اس مقام سے ہٹ گئے جہاں ان کے اوپر ظلم ہو رہا تھا۔ وہ انسانوں سے الجھنے کے بجائے خدا کی طرف متوجہ ہو گئے۔

ان کے اس عمل ہجرت کو قرآن میں صبر کہا گیا۔ اور پھر فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو خدا پر توکل کرنے والے ہیں۔ صبر کے ساتھ توکل کا ذکر نہایت اہم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی آدمی صبر کے طریقہ پر قائم نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کے اندر توکل علی اللہ کی صفت نہ ہو۔

ناموافق صورتحال پیش آنے کے بعد جو آدمی بے برداشت ہو کر لڑنے لگے، وہ اپنی اس روش سے ثابت کرتا ہے کہ وہ صرف اپنی ذات کو جانتا تھا۔ وہ خدا کی برتر طاقتوں سے واقف نہ تھا۔ اگر وہ خدا کی خدائی کو اور اس کے وعدوں کو جانتا تو وہ صبر کرتا۔ کیوں کہ اس کو یقین ہوتا کہ صبر کر کے میں زیادہ بڑی طاقت کو اپنے مخالف کے مقابلہ میں کھڑا کر رہا ہوں۔ یہ طاقت خود مالک کائنات کی ہے جس کی پکڑ سے بچنا کسی کے لیے بھی ممکن نہیں۔

حُسن اخلاق

مُوَطَّأُ الْإِمَامِ مَالِكٍ (کتاب الجامع، ماجاء فی حسن الخلق) میں ایک روایت ہے۔ اس کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں اس لیے بھیجا گیا ہوں تا کہ حسن اخلاق کو مکمل کروں — بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ حُسْنَ الْأَخْلَاقِ (موطاً مالک، حدیث نمبر 1885)۔

روایات میں آیا ہے کہ جنگ حنین کے بعد جب قبیلہ طیٔ کے گرفتار مرد وعورت آپ کے سامنے لائے گئے تو ان میں سے ایک عورت کھڑی ہوئی اور کہا کہ اے محمدؐ، اگر آپ کا خیال ہو کہ آپ مجھ کو چھوڑ دیں اور عرب قبائل کو مجھ پر ہنسنے کا موقع نہ دیں کیوں کہ میں اپنی قوم کے سردار کی بیٹی ہوں۔ اور میرا باپ ضرورت مندوں کی حمایت کرتا تھا۔ اور مجبوروں کو رہائی دلاتا تھا۔ اور بھوکے کو سیر کرتا تھا اور لوگوں کو کھانا کھلاتا تھا۔ اور سلام کو پھیلاتا تھا اور اس نے کسی حاجت مند طالب کو کبھی نہیں لوٹایا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر فرمایا کہ اے خاتون، یہ بلاشبہ اہل ایمان کی صفتیں ہیں۔ اور اگر تمہارا باپ مسلم ہوتا تو ہم ضرور اس کے لیے رحمت کی دعا کرتے۔ پھر آپ نے حکم دیا کہ حاتم طائی کی بیٹی کو چھوڑ دیا جائے کیوں کہ اس کا باپ اچھے اخلاق کو پسند کرتا تھا۔ ابو بردہ یہ سن کر کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے کہا کہ اے خدا کے رسولؐ، کیا اللہ مکارم اخلاق کو پسند کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اس کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، جنت میں صرف وہی شخص جائے گا جو اچھے اخلاق والا ہو۔ لَا یَدْخُلُ الْجَنَّةَ أَحَدٌ إِلَّا بحسن الخلق (دلائل النبوۃ للبیہقی، جلد 5، صفحہ 341)۔

جنت میں داخلہ کے لیے حسن اخلاق کی اہمیت کیوں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حسن اخلاق ہی کسی آدمی کو جنت میں رہائش کا مستحق بناتا ہے۔ جنت ایک انتہائی لطیف رہائش گاہ ہے وہاں ہر چیز اپنے آخری معیار پر ہوگی۔ اس لیے صرف وہی لوگ وہاں بسائے جانے کے لائق ٹھہریں گے جنہوں نے دنیا کی زندگی میں اعلیٰ نفسیات اور اعلیٰ انسانی کردار کا ثبوت دیا ہو۔ جنت موت کے بعد والی دنیا میں ہے، مگر اس کا انتخاب موت سے پہلے والی دنیا میں کیا جاتا ہے، اور حدیث کے مطابق، اس انتخاب کا معیار حسن اخلاق ہے۔

حسن اخلاق جنّت کا سرٹیفکیٹ ہے، بشرطیکہ آدمی مومن ہو۔

اسلامی طریقہ

قرآن میں جن گھریلو مسائل کا ذکر ہے، ان میں سے ایک نشوز ہے۔ نشوز کا لفظی مطلب ہے سر اٹھانا۔ نشوز کا اظہار مرد اور عورت دونوں کی طرف سے ہوسکتا ہے۔ اس فعل کا ظہور مرد کے مقابلہ میں عورت کی طرف سے ہو تو اس کا مطلب شوہر کی نافرمانی ہوتا ہے۔ اور اگر وہ عورت کے مقابلہ میں مرد کی طرف سے ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ شوہر اپنی بیوی کا حق ادا نہیں کر رہا ہے۔

نشوز کی صورت پیش آنے کے بعد عورت اور مرد کے باہمی تعلقات بگڑ جاتے ہیں۔ جب ایسا ہو جائے تو کیا کیا جائے۔ اس سلسلہ میں قرآن میں ہدایت دی گئی کہ: سب سے پہلے دونوں آپس میں بات چیت کے ذریعہ اصلاح کی کوشش کریں (النساء، 4:128)

اگر آپس کی بات چیت سے تعلقات درست نہ ہوں تو دوسرے مرحلہ میں یہ کرنا چاہیے کہ دونوں خاندانوں سے ایک ایک شخص کو بطور حکم مقرر کیا جائے۔ دونوں خیر خواہی کے انداز میں کوشش کر کے معاملہ کو داخلی سطح پر طے کرنے کی کوشش کریں (النساء، 4:35) اگر یہ دوسری کوشش بھی ناکام ہو جائے تو تیسر مرحلہ میں معاملہ کو بیرونی عدالتی ادارہ (قضا) کے سپرد کر دیا جائے۔

اس تعلیم کا براہ راست تعلق شوہر اور بیوی کے نزاع سے ہے۔ مگر اس سے شریعت کا مزاج معلوم ہوتا ہے۔ اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جب دو انسان یا دو گروہ کے درمیان کوئی جھگڑے کی صورت پیدا ہو تو اس وقت جھگڑے کو حل کرنے کے لیے کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔

اس طریق عمل کا بنیادی اصول یہ ہے کہ معاملہ کو محدود دائرہ میں رکھ کر اسے حل کرنے

کی کوشش کی جائے۔ اولاً یہ کوشش ہونی چاہیے کہ جن چند آدمیوں کے درمیان مسئلہ پیدا ہوا ہے، انھیں کے درمیان اس کو باقی رکھا جائے اور اس کے دائرہ کو آخری حد تک محدود رکھتے ہوئے اس کو حل کرنے کی کوشش کی جائے۔

اگر بالفرض ساری تدبیروں کے باوجود یہ ابتدائی کوشش ناکام ہوجائے تب بھی معاملہ کو پھیلایا نہ جائے۔ اس کے بعد بھی صرف قریبی افراد کو شریک کرکے اس کو حل کرنے کی کوشش کی جائے۔ اگر قریبی اور متعلق افراد کی کوشش بھی اس کو حل کرنے میں ناکام ثابت ہو تو اس وقت جائز ہے کہ اس کو عدالت یا اور کسی خارجی ادارہ کے سپرد کیا جائے۔

رسول خدا کا اسوہ

قدیم عرب میں کعب بن زُہیر ایک شاعر تھے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ظہور ہوا تو کعب آپ کے مخالف ہو گئے۔ وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے خلاف اشعار لکھتے اور لوگوں کے درمیان ان کو پھیلاتے۔ ان اشعار میں نہایت برے انداز میں آپ کی ہجو اور تنقید ہوتی۔

جب مکہ فتح ہو گیا تو کعب بن زہیر کو اپنے لیے زمین تنگ دکھائی دینے لگی۔ ان کے بھائی بُجیر اسلام قبول کر چکے تھے۔ انھوں نے کعب سے کہا کہ مدینہ جاؤ اور اسلام قبول کر لو۔ اب اسی میں تمہارے لیے بھلائی ہے۔ کعب بن مالک کے خط کا ایک فقرہ یہ تھا کہ اگر تم اپنی جان بچانا چاہتے ہو تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے یہاں حاضر ہو جاؤ۔ کیوں کہ وہ کسی ایسے شخص کو قتل نہیں کرتے جو ان کے پاس تائب ہو کر آئے۔ فَإِنْ كَانَتْ لَكَ فِي نَفْسِكَ حَاجَةٌ، فَطِرْ إِلَى رَسُولِ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم، فَإِنَّهُ لَا يَقْتُلُ أَحَدًا جَاءَهُ تَائِبًا۔

چنانچہ کعب بن زہیر مدینہ آئے۔ اگلے دن صبح سویرے وہ مسجد نبوی پہنچے اور جب

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز ختم کی تو انھوں نے آگے بڑھ کر آپ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو پہچانتے نہ تھے۔ کعب نے آپ سے کہا کہ میں کعب بن زہیر ہوں۔ میں تائب ہو کر اور مسلمان ہو کر آیا ہوں۔ آپ سے امان مانگتا ہوں۔ کیا اس کو آپ میری طرف سے قبول کریں گے اور امان دے دیں گے۔

یہ سن کر مدینہ کا ایک مسلمان صف سے اٹھا اور جھپٹ کر کعب تک پہنچا۔ اور کہا کہ اے خدا کے رسول اس دشمن خدا کو میرے حوالے کیجیے تا کہ میں تلوار سے اس کی گردن مار دوں۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کہا: اس کو چھوڑ دو۔ کیونکہ وہ توبہ کر کے اور اپنی حرکت سے باز ہو کر آیا ہے۔ دَعْهُ عَنْكَ، فَإِنَّهُ قَدْ جَاءَ تَائِبًا، نَازِعًا —— عَمَّا كَانَ عَلَيْهِ(سیرت ابن ہشام، جلد 2، صفحہ 503-501)۔

یہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا اسوہ ہے۔ اس سے ناقدین اور مخالفین کے بارے میں اسلام کا طریقہ معلوم ہوتا ہے۔ وہ طریقہ یہ ہے کہ کوئی شخص کتنا ہی تخریبی ہو اور وہ کتنا ہی تنقیدیں کرتا رہا ہو۔ اگر وہ اپنے فعل کو چھوڑ دے اور تائب ہو کر امن کی درخواست کرے تو اس کو ضرور امن دیا جائے گا۔ ماضی کے تخریبی عمل کی بنیاد پر اس کو سزا نہیں دی جائے گی۔ اس کی توبہ ہی اس کے لیے سزا کا بدل بن جائے گی۔

عافیت کی زندگی

لَمَّا قَدِمَ حَاتِمُ الأَصَمُّ إِلَى الإِمَامِ أَحْمَدَ، قَالَ لَهُ الإِمَامُ: أَخْبِرْنِي كَيْفَ السَّلَامَةُ مِنَ النَّاسِ؟فَقَالَ حَاتِمٌ: بِثَلَاثَةِ أَشْيَاءَ: تُعْطِيَهُمْ مِنْ مَالِكَ وَلَا

تَأْخُذْ مِنْ مَالِهِمْ، وَتَقْضِي لَهُمْ حُقُوقَهُمْ وَلَا تُطَالِبْهُمْ بِحُقُوقِكَ، وَتَصْبِرَ عَلَى أَذَاهُمْ وَلَا تُؤْذِيهِمْ. (سیر اعلام النبلا للذہبی، جلد 11، صفحہ 487)۔ حاتم اصم جب امام احمد کے پاس آئے تو امام احمد نے ان سے کہا کہ مجھے بتائیے کہ لوگوں سے محفوظ کیسے رہا جائے۔ حاتم اصم نے کہا کہ تین چیزوں کے ذریعہ سے۔ ان کو اپنا مال دیں مگر خود ان کا مال نہ لیں۔ لوگوں کے حقوق ادا کریں مگر اپنے حقوق ان سے نہ مانگیں۔ لوگوں کی ایذاؤں پر صبر کریں اور خود ان کو ایذا نہ پہنچائیں۔

ان تینوں باتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ یک طرفہ طور پر لوگوں کو یہ احساس دلا دیں کہ وہ آپ سے پوری طرح محفوظ ہیں۔ اس کے بعد آپ بھی ان سے پوری طرح محفوظ ہو جائیں گے۔ لوگوں کو یہ احساس تین تدبیروں کے ذریعہ دلایا جاسکتا ہے۔

لوگوں کے پاس جو کچھ ہے، اس سے اپنے آپ کو مستغنی بنالیں۔ مگر آپ کے پاس جو کچھ ہے اس میں سے آپ لوگوں کو حسب توفیق ان کا حصہ پہنچاتے رہیں۔ آپ لوگوں سے لینے والے نہ بنیں، اس کے بجائے آپ لوگوں کو دینے والے بن جائیں۔

لوگوں کا جو حق آپ کے اوپر ہو اس کی ادائیگی میں آپ کوئی کوتاہی نہ کریں۔ مگر دوسروں کے اوپر آپ کا جو حق آتا ہو، اس کو دوسروں سے وصول کرنے کی کبھی کوئی مہم نہ چلائیں۔

معاشرتی زندگی میں بار بار ایسا ہوگا کہ دوسروں کی طرف سے آپ کو تکلیف پہنچے گی۔ اس طرح کے مواقع پر آپ یک طرفہ صبر و تحمل کی پالیسی کو اختیار کرلیں، آپ صرف اتنا ہی نہ کریں کہ دوسروں کو آپ ایذا نہ پہنچائیں، بلکہ اس سے بڑھ کر آپ کا رویہ یہ بن جائے کہ دوسروں کی ایذاؤں پر آپ صبر کرلیں، آپ لوگوں سے بدلہ لیے بغیر انھیں معاف کردیں۔

دنیا میں عافیت کی زندگی حاصل کرنے کا یہی واحد یقینی نسخہ ہے۔ اس کے سوا جو تدبیر اختیار کی جائے گی وہ امن و عافیت دینے والی نہیں بن سکتی۔

غیر اثر پذیر

قرآن کی سورہ نمبر 48 میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کی صفات بیان کی گئی ہیں۔ ابتدائی مفہوم کے اعتبار سے یہ اصحاب رسول کی صفات ہیں۔ مگر وہ ایسی صفات ہیں جو آپ کے بعد بھی تبعاً تمام مسلمانوں سے مطلوب ہیں۔

ان صفات میں سے ایک صفت یہ ہے کہ وہ منکروں کے اوپر سخت ہیں اور آپس میں ایک دوسرے کے لیے رحم دل ہیں: أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ (48:29)۔ اس آیت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مسلمان اپنے باہمی تعلقات میں تو ایک دوسرے کے ساتھ مہربانی کا سلوک کریں لیکن جب غیر قوموں کے ساتھ معاملہ پیش آئے تو وہ کڑے بن جائیں۔ ان کے معاملہ میں وہ متشددانہ سلوک اختیار کریں۔

اس آیت میں اشداء علی الکفار اسی معنی میں ہے جس کے لیے دوسری جگہ قرآن میں أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ (8:54)۔ کے الفاظ آئے ہیں۔ عربی میں کہتے ہیں: ھو عزیز" علیّ۔ یعنی وہ شخص ایسا مضبوط ہے کہ اس پر قابو پانا میرے لیے مشکل ہے۔ شدید کا مفہوم بھی یہی ہے۔ ابن منظور کی لسان العرب (3/232-235) میں ہے کہ شدت کے اصل معنی صلابت کے ہیں۔ کوئی پتھریلی زمین جو پانی کا اثر قبول نہ کرے اس کو صلب کہا جاتا ہے۔ اسی طرح مذکورہ آیت میں شدید کا لفظ غیر اثر پذیری کے معنی میں ہے۔ ابن منظور نے "شدید" کی تشریح کے تحت جاہلی دور کے شاعر کا یہ شعر نقل کیا ہے کہ میں کسی کی سخت بات کے مقابلہ میں

نرم نہیں پڑتا، خواہ اس کی بات لوہے سے زیادہ سخت کیوں نہ ہو:

فإنّي لَا أَلِينُ لِقَوْلِ شُدَّی
وَلَو كانَتْ أشَدَّ من الحَدِيدِ

(لسان العرب، جلد 3، صفحہ 235)

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ مذکورہ آیت میں اشداء کا لفظ داخلی معنی میں ہے نہ کہ خارجی معنی میں۔ یعنی اس میں اہل ایمان کی یہ داخلی صفت بتائی گئی ہے کہ وہ اپنے گہرے یقین کی بنا پر ایسے ہو جاتے ہیں کہ وہ خارجی ترغیبات کا اثر قبول نہ کر سکیں۔ غیر خدا پرست اشخاص یا غیر خدا پرستانہ تہذیب کا سیلاب بھی اگر ان کے اوپر سے گزر جائے تو وہ پتھر اور لوہے کی طرح اس کا اثر قبول کرنے سے محفوظ رہیں گے — حق سے متاثر ہونے میں وہ انتہائی نرم ہوتے ہیں اور ناحق سے متاثر ہونے میں انتہائی سخت۔

صبر کی اہمیت

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ صبر پر اللہ تعالیٰ نے بے حساب اجر رکھا ہے (39:10)۔ صبر اولوالعزم پیغمبروں کا طریقہ ہے (46:35)۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی شخص کو صبر سے بہتر اور واسع عطیہ نہیں دیا گیا (مَا أُعْطِيَ أَحَدٌ عَطَاءً خَيْرًا وَأَوْسَعَ مِنَ الصَّبْرِ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 1469؛ صحیح مسلم، حدیث نمبر 1053)۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا اور آخرت کی تمام کامیابیاں صبر کے اوپر رکھ دی ہیں۔ اس سلسلہ میں یہاں صرف چند آیتوں کا حوالہ دیا جاتا ہے:

صبر پر جنت (الدھر، 76:12)

صبر پر فوز و فلاح (المومنون، 23:111)

صبر پر غلبہ (الانفال، 8:65)

صبر پر امامت (السجدہ، 32:24)

صبر پر حفاظت (آل عمران، 3:120)

صبر کی اتنی زیادہ اہمیت کیوں ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ صبر ہی وہ زمین ہے جس پر اعلیٰ انسانی اخلاقیات پرورش پاتی ہیں۔ صبر سے اخلاقی اوصاف پیدا ہوتے ہیں، اور اخلاقی اوصاف تمام انسانی ترقیوں کا واحد زینہ ہیں۔ صبر نہیں تو اخلاقیات نہیں، اخلاقیات نہیں تو کوئی کامیابی نہیں۔

انسان فطری طور پر بہتر اخلاق کو پسند کرتا ہے۔ مگر دو چیزیں بار بار آدمی کو اخلاق کے راستہ سے ہٹا دیتی ہیں۔ ایک داخلی خواہشات، اور دوسرے خارجی اشتعال۔ کبھی انسان کا اندرونی نفس اسے بہکاتا ہے، اور کبھی کوئی خارجی واقعہ اس کو مشتعل کرکے بے اخلاق بنا دیتا ہے۔ صبر ان دونوں کمزوریوں کے خلاف چیک ہے۔ صبر و تحمل کی صفت آدمی کو اخلاقی حد کے اندر رکھتی ہے، وہ اس کو اخلاق کی حد سے باہر جانے نہیں دیتی۔

صبر انسانیت کی تکمیل ہے۔ صبر کسی انسان کو مکمل انسان بناتا ہے۔ جس آدمی کے اندر صبر کی صفت ہو اس کے اندر تمام صفات ہوں گی، اور جس آدمی کے اندر صبر کی صفت نہ ہو وہ آخر کار تمام صفات کمال سے محروم ہو جائے گا۔

ایک آیت

قرآن میں نکاح و طلاق کے احکام بیان کرتے ہوئے ایک بنیادی بات یہ بتائی گئی ہے کہ جو شخص اللہ سے ڈرے گا اللہ اس کے لیے اس کے کام میں آسانی پیدا کر دے گا (65:4)۔

مشہور مفسر ضحاک (م 105ھ) نے اس کی تشریح کرتے ہوئے کہا کہ یعنی جو شخص طلاق سنت میں اللہ سے ڈرے گا تو اللہ اس کے لیے رجعت میں آسانی پیدا کردے گا: أَيْ مَنْ يَتَّقِهِ فِي طَلَاقِ السُّنَّةِ يَجْعَلْ لَهُ مِنْ أَمْرِهِ يُسْرًا فِي الرَّجْعَةِ (تفسیر القرطبی، جلد 18، صفحہ 165)۔

زیادہ تر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی فوری غصہ کے تحت مستقبل کو سوچے بغیر اپنی بیوی کو طلاق دے دیتا ہے۔ اب اگر وہ شریعت کے مقرر طریقہ سے انحراف کرکے ایک ہی مجلس میں تین طلاق دیدے تو اس کے لیے سخت مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ اس کے برعکس اگر آدمی اللہ سے ڈرے تو وہ غیر سنجیدہ فعل سے بچے گا۔ ایسا آدمی شریعت کے مقرر طریقہ پر پہلی بار صرف ایک طلاق دے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اگلے مہینہ تک جب اس کا غصہ اتر جائے گا اور وہ دور تک نتائج پر غور کرلے گا تو اس کو محسوس ہوگا کہ طلاق دے کر میں نے غلطی کی ہے۔ اس طرح اس کو موقع مل جائے گا کہ شریعت کے مطابق وہ دوبارہ رجوع کرلے۔

اس اصول کا تعلق پوری زندگی سے ہے۔ زندگی کے معاملات اگر فطرت کے مقرر راستہ پر چلتے رہیں تو زندگی میں کبھی بگاڑ نہیں آئے گا۔ زندگی میں بگاڑ صرف اس وقت آتا ہے جب کہ فطرت کی شاہراہ سے انحراف کیا جائے۔

تقویٰ اس بات کی ضمانت ہے کہ آدمی فطرت کی شاہراہ سے نہیں ہٹے گا۔ تقویٰ آدمی کو محتاط اور سنجیدہ بناتا ہے۔ اور جو آدمی محتاط اور سنجیدہ ہو جائے وہ کبھی جذباتی طور پر یا منفی سوچ کے تحت کوئی قدم نہیں اٹھائے گا۔ وہ ہر موقع پر اپنے کو تھام کر غور کرے گا۔ وہ جذبات کی راہ میں بہنے کے بجائے عقل کے فیصلہ کے تحت کام کرے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ غیر ضروری مشکلات سے بچ جائے گا اور یُسر والے راستہ کو پا کر اس پر چلتا رہے گا، یہاں تک کہ آخری منزل پر پہنچ جائے۔

غلط فہمی

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: فَقَدْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم ذَاتَ لَيْلَةٍ، فَظَنَنْتُ أَنَّهُ ذَهَبَ إِلَى بَعْضِ نِسَائِهِ، فَتَحَسَّسْتُهُ، فَإِذَا هُوَ رَاكِعٌ أَوْ سَاجِدٌ يَقُولُ: سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ وَبِحَمْدِكَ، لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ، فَقَالَتْ: بِأَبِي أَنْتَ وَأُمِّي إِنِّي لَفِي شَأْنٍ، وَإِنَّكَ لَفِي آخَرَ (**مسند احمد، حدیث نمبر** 25178؛ **صحیح مسلم، حدیث نمبر** 485؛ **سنن النسائی، حدیث نمبر** 1131)۔

عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ ایک رات کو میں نے رسول اللہ صلّے اللہ علیہ وسلم کو گھر کے اندر نہیں پایا۔ انھوں نے گمان کیا کہ آپ اپنی کسی بیوی کے پاس چلے گیے ہیں۔ انھوں نے آپ کو تلاش کیا تو انھوں نے پایا کہ آپ مسجد میں رکوع (یا سجدہ) کی حالت میں ہیں اور یہ کہہ رہے ہیں کہ اے اللہ، تو پاک ہے اور ساری تعریف تیرے ہی لیے ہے۔ تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ میرے باپ اور ماں آپ پر قربان ہوں، میں کسی اور حال میں ہوں اور آپ کسی دوسرے حال میں ہیں۔

حضرت عائشہ نے آپ کو نہ پاکر گمان کیا کہ آپ اپنی کسی بیوی کے گھر گئے ہیں، حالاں کہ آپ خدا کے گھر گیے تھے۔ انھوں نے سمجھا کہ آپ کو کسی بیوی کی یاد آ گئی، حالاں کہ آپ کو خدائے ذوالجلال کی یاد آئی تھی۔ اسی طرح انسان ظاہر حالات کے اعتبار سے دوسرے شخص کے بارے میں ایک گمان کرلیتا ہے۔ ابتدائی معلومات کے مطابق وہ اپنے آپ کو درست سمجھتا ہے۔ مگر تحقیق کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اس کا خیال محض ذاتی گمان کی بنیاد پر تھا، حقیقت واقعہ سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔

غلط فہمی ایک ایسی چیز ہے جس میں صحابی کے درجہ کا ایک انسان بھی مبتلا ہوسکتا ہے۔ پھر عام انسان کے لیے تو اس کا امکان اور بھی زیادہ ہے۔ اس لیے ہر انسان پر یہ لازم ہے کہ

اگر کسی کے بارے میں اس کو غلط فہمی ہو جائے تو وہ اس کی تحقیق کرے۔ تحقیق کے بغیر ہرگز اپنی رائے پر اعتماد نہ کرے۔

تحقیق نہ کرنے والا بلاشبہ گنہ گار ہے۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں ایسے آدمی کا کوئی عذر ہرگز سُنا نہ جائے گا۔ وہ اپنے اس جرم میں پکڑا جائے گا کہ جب تم کو معاملہ کا پورا علم حاصل نہ تھا تو تم نے کسی بندۂ خدا کے بارے میں ایک بُرا خیال کیسے قائم کرلیا۔

مطلوب عمل

عَنْ كَعْبِ بْنِ عُجْرَةَ قَالَ: مَرَّ عَلَى النَّبِيِّ صلى الله عليه وسلم رَجُلٌ، فَرَأَى أَصْحَابُ النَّبِيِّ صلى الله عليه وسلم مِنْ جَلَدِهِ ونَشَاطِهِ مَا أَعْجَبَهُمْ، فَقَالُوا: يَا رَسُولَ اللَّهِ، لَوْ كَانَ هَذَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صلى الله عليه وسلم: إِنْ كَانَ خَرَجَ يَسْعَى عَلَى وَلَدِهِ صِغَارًا فَهُوَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ، وَإِنْ خَرَجَ يَسْعَى عَلَى أَبَوَيْنِ شَيْخَيْنِ كَبِيرَيْنِ فَهُوَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ، وَإِنْ كَانَ يَسْعَى عَلَى نَفْسِهِ يَعِفُّهَا فَهُوَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ، وَإِنْ كَانَ خَرَجَ رِيَاءً وتَفَاخُرًا فَهُوَ فِي سَبِيلِ الشَّيْطَانِ (المعجم الأوسط للطبرانی، حدیث نمبر 6835)۔ یعنی، کعب بن عُجرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے گزرا۔ آپ کے اصحاب نے اس کی محنت کو اور اس کی سرگرمی کو دیکھا۔ انھوں نے کہا کہ اے خدا کے رسولؐ، کاش اس کی یہ محنت اور سرگرمی اللہ کے راستہ میں ہوتی۔ آپ نے فرمایا کہ اگر وہ اپنے چھوٹے بچوں کے لیے دوڑ دھوپ کر رہا ہے تو اس کا عمل اللہ کے راستہ میں ہے۔ اور اگر وہ اپنے ماں

باپ کے لیے دوڑ دھوپ کر رہا ہے تو اس کا عمل اللہ کے راستہ میں ہے۔ اور اگر وہ اپنی باعزت روزی کے لیے دوڑ دھوپ کر رہا ہے تو اس کا یہ عمل بھی اللہ کے راستہ میں ہے۔ اس کے برعکس، اگر اس کی دوڑ دھوپ دکھادے کے لیے اور فخر کے لیے ہوتو اس کا سارا عمل شیطان کے راستہ میں ہے۔

''اللہ کے راستہ میں عمل'' کسی خاص شکل والے عمل کا نام نہیں، وہ نیت یا قلبی محرک کا نام ہے۔ جو شخص خدائی نیت کے تحت عمل کرے، اس کا عمل خدا کے راستہ میں ہے۔ جو شخص کسی اور نیت کے تحت عمل کرے، تو اس کا عمل اسی راستہ میں ہے جس کی اس نے نیت کی تھی۔

ایک آدمی کے یہاں چھوٹے بچے ہیں۔ اس نے سوچا کہ یہ بچے میرے لیے خدا کی ذمہ داری کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ سوچ کر وہ ان کی ضروریات فراہم کرتا ہے تو وہ خدا کی راہ میں عمل کرتا ہے۔ ایک آدمی کے یہاں بوڑھے والدین ہیں۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ والدین کی خدمت میرے اوپر خدائی فریضہ ہے۔ اس احساس کے تحت وہ اپنے والدین کی خدمت کرتا ہے تو وہ خدا کی راہ میں عمل کر رہا ہے۔ ایک شخص کے سامنے اپنے فطری تقاضے ہیں۔ وہ شریعت الٰہی کے دائرہ میں اپنی فطری حاجتوں کو پورا کرنے کے لیے سرگرم ہوتا ہے تو وہ خدا کی راہ میں عمل کرتا ہے۔

کلام کی شرط

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم: مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيَقُلْ خَيْرًا أَوْ لِيَصْمُتْ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 6018؛ صحیح مسلم، حدیث نمبر 47)۔ یعنی، ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جو شخص

اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اس کو چاہیے کہ وہ بہتر بات بولے ورنہ چپ رہے۔

جو شخص اللہ کو اس کے عظمت وجلال کے ساتھ مانے، جس کو یہ یقین ہو کہ قیامت کے دن اللہ اس کے ہر بول پر اس سے باز پرس کرنے والا ہے، وہ اپنی زبان کے بارے میں آخری حد تک محتاط ہو جاتا ہے۔ وہ بولنے سے پہلے سوچتا ہے۔ وہ خدا کے یہاں جائزہ لیے جانے سے پہلے خود اپنا جائزہ لینے لگتا ہے۔

یہ مزاج اس کو اپنا نگراں آپ بنا دیتا ہے۔ اس کی زبان پر خاموشی کا تالا لگ جاتا ہے۔ وہ صرف اس اس وقت بولتا ہے جب کہ بولنا فی الواقع ضروری ہو گیا ہو، اور جہاں حقیقی ضرورت نہ ہو وہاں وہ چپ رہنا پسند کرتا ہے۔

جو شخص اپنی نفسیات کے اعتبار سے ایسا بن جائے، اس کی زبان جب کھلے گی تو بھلی بات ہی کے لیے کھلے گی۔ لغو یا بے ہودہ بات کے لیے اس کی زبان اس طرح بند ہو جائے گی جیسے اس کے پاس بولنے کے لیے الفاظ ہی نہیں۔

بہتر بات سے مراد وہ بات ہے جس سے کسی خدائی سچائی کا اعلان ہوتا ہو۔ جس میں کسی مظلوم کی حمایت کی گئی ہو۔ جس سے انسانی بھلائی قائم کرنا مقصود ہو۔ جو خیر خواہی اور اصلاح کے جذبہ کے تحت ظاہر ہوئی ہو۔

اس کے برعکس غیر بہتر بات وہ ہے جس کا مقصد اپنے آپ کو نمایاں کرنا ہو۔ جس کے ذریعہ ظالم کی تائید چاہی گئی ہو۔ جو بد خواہی اور ظلم کے جذبہ کے تحت نکلی ہو۔ جس کا نتیجہ یہ ہو کہ سویا ہوا فتنہ جاگ اٹھے اور خدا کی زمین میں فساد پھیل جائے۔

اللہ پر اور آخرت پر ایمان آدمی کو سنجیدہ اور ذمہ دار بناتا ہے۔ اور جو شخص حقیقی معنوں میں سنجیدہ اور ذمہ دار ہو جائے اس کا کلام ویسا ہی ہو جائے گا جس کا حدیث میں ذکر ہوا۔

بلند کرداری

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم تمام لوگوں کے لیے اسوہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ کا اخلاق تمام امت کے لیے نمونہ ہے۔ آپ کا اخلاق کیا تھا، اس کی بابت قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ بیشک تم ایک اعلیٰ اخلاق پر ہو: وَإِنَّكَ لَعَلى خُلُقٍ عَظِيمٍ (68:4)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام امت کو اسی بلند اخلاق کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا: لَا تَكُونُوا إِمَّعَةً، تَقُولُونَ: إِنْ أَحْسَنَ النَّاسُ أَحْسَنَّا، وَإِنْ ظَلَمُوا ظَلَمْنَا، وَلَكِنْ وَطِّنُوا أَنْفُسَكُمْ، إِنْ أَحْسَنَ النَّاسُ أَنْ تُحْسِنُوا، وَإِنْ أَسَاءُوا فَلَا تَظْلِمُوا۔ (سنن الترمذی، حدیث نمبر 2007) تم لوگ امعہ نہ بنو کہ یہ کہنے لگو کہ اگر لوگ ہمارے ساتھ اچھا کریں تو ہم بھی اچھا کریں گے اور لوگ ہمارے اوپر ظلم کریں تو ہم بھی ظلم کریں گے۔ آپ کو اس کے لیے آمادہ کرو کہ لوگ اچھا سلوک کریں تو تم بھی اچھا سلوک کرو اور اگر وہ برا سلوک کریں تو تم ان کے ساتھ ظلم نہ کرو۔

اچھے کے ساتھ اچھا اور برے کے ساتھ برا — یہ لین دین والا اخلاق ہے۔ اس قسم کے اخلاق کی اللہ کے نزدیک کوئی وقعت نہیں۔ جو آدمی اپنے عمل کی قیمت دنیا ہی میں لے لے اس نے گویا دنیا ہی میں اپنا معاملہ برابر کرلیا۔ اس کے عمل کی آخرت میں کیا قیمت ہوسکتی ہے۔ حقیقی اخلاق وہ ہے جو اعلیٰ اخلاق ہو، جو اصول کی پابندی میں برتا گیا ہو نہ کہ مفاد اور مصلحت کی پابندی میں۔

اعلیٰ اخلاق سے مراد وہ اخلاق ہے جب کہ آدمی دوسروں کے رویہ سے بلند ہو کر عمل کرے۔ اس کا طریقہ یہ نہ ہو کہ برائی کرنے والوں کے ساتھ برائی اور بھلائی کرنے والوں کے ساتھ بھلائی۔ بلکہ اخلاق اس کے لیے ناقابل تغیر اصول کی حیثیت رکھتا ہو۔ وہ دوسروں

کے رویہ سے بے پروا ہو کر خود اپنے اصول کے تحت اپنی روش کا تعین کرے۔ وہ ہر ایک کے ساتھ بھلائی کرے، خواہ دوسرے لوگ اس کے ساتھ برا سلوک ہی کیوں نہ کر رہے ہوں۔

یہی سچا اسلامی اخلاق ہے۔ اس قسم کا اخلاق ثابت کرتا ہے کہ آپ ایک بااصول انسان ہیں۔ حالات آپ کے کردار کا تعین نہیں کرتے بلکہ خود آپ کا سوچا سمجھا اصول آپ کے کردار کا تعین کرتا ہے۔

قرآنی اصول

قرآن میں ازدواجی زندگی کے احکام کے ذیل میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ تم لوگ اپنی بیویوں کے ساتھ خوش اسلوبی کے ساتھ زندگی گزارو۔ اگر وہ تم کو ناپسند ہوں تو ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تم کو پسند نہ ہو مگر اللہ نے اس میں تمہارے لیے بہت بڑی بھلائی رکھ دی ہو وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَى أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئاً وَيَجْعَلَ اللهُ فِيهِ خَيْراً كَثِيراً (4:19)۔

اس قرآنی تعلیم کا تعلق صرف میاں اور بیوی سے نہیں ہے۔ وہ تمام انسانی تعلقات کے لیے عام ہے۔ خدا کی اس دنیا میں کامیاب اجتماعی زندگی گزارنے کا واحد اہم اصول یہ ہے کہ ہر عورت اور مرد شعوری طور پر اس کو یاد رکھیں کہ کسی کی کوئی روش اگر ان کی پسند کے خلاف ہے تو خود اسی کے اندر کوئی اور صفت ہوگی جو ان کی پسند کے مطابق اور مفید ہوگی۔ اس لیے ہر ایک کو یہ کرنا چاہئے کہ وہ متعلق مرد یا عورت کی ناپسندیدہ صفت کو نظر انداز کر کے اس کی پسندیدہ صفت کی بنیاد پر اس کو اپنا لے۔

اصل یہ ہے کہ اس دنیا میں کوئی بھی کامل نہیں۔ ہر ایک کے اندر کوئی نہ کوئی کمی پیدائشی طور پر موجود ہوتی ہے۔ اب ہوتا یہ ہے کہ جس مرد یا عورت کا ہم تجربہ کر رہے ہوتے

ہیں، اس کی کمی ہمارے علم میں آجاتی ہے۔ اور جس مرد یا عورت کا ہمیں عملی تجربہ نہیں ہوا اس کی کمی ہمارے علم میں نہیں آتی۔ اس لیے ہم غیر شعوری طور پر یہ سمجھ لیتے ہیں کہ باقی لوگ تو اچھے ہیں، صرف یہ شخص بُرا ہے۔ حالاں کہ ایک کو چھوڑ کر جب ہم دوسرے سے معاملہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ دوسرا آدمی بھی ویسا ہی تھا جیسا کہ پہلا آدمی۔

اس لیے یہ ذہن درست نہیں کہ اس کو چھوڑ کر فلاں کو پکڑو۔ اس کے بجائے صحیح بات یہ ہے کہ نباہ کا ذہن پیدا کیا جائے۔ کامل کی تلاش آدمی کو کہیں نہیں پہنچاتی۔ اور نباہ کی روش آدمی کو اس قابل بنا دیتی ہے کہ وہ ہر ایک کے ساتھ زندگی گزارے، وہ ہر ایک کے ساتھ مل کر اپنے لیے کامیاب زندگی کی تعمیر کر سکے۔

بے حساب اجر

قُلْ يَا عِبَادِ الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا رَبَّكُمْ لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا فِي هَٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ وَأَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةٌ إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ (39:10)۔ یعنی، کہو کہ اے بندو جو ایمان لائے ہو، اپنے رب سے ڈرو۔ جو لوگ اس دنیا میں نیکی کریں گے ان کے لیے نیک صلہ ہے۔ اور اللہ کی زمین وسیع ہے۔ بے شک صبر کرنے والوں کو ان کا اجر بے حساب دیا جائے گا۔

یہ ایک انتہائی غیر معمولی بات ہے کہ کسی عمل پر بے حساب اجر دینے کا اعلان کیا جائے۔ قرآن میں اس قسم کا غیر معمولی اعلان صرف ایک عمل کے لیے کیا گیا ہے، اور وہ صبر کا عمل ہے۔

صبر کی اصل حبس ہے، یعنی روکنا۔ عربی میں کہا جاتا ہے: صبرتُ عن کذا (میں نے اپنے نفس کو فلاں چیز سے روک دیا)۔ یا صبرتُ عما احبّ (جس چیز کو میں پسند کرتا ہوں اس سے میں نے اپنے آپ کو روکا)۔

عمل کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ہے حد پر عمل کرنا۔ دوسرا ہے حد کے باہر جا کر عمل کرنا۔ ایک شخص آپ کے ساتھ حسن کرے اور آپ بھی اس کے ساتھ حسن سلوک کریں۔ یہ معمول کا کردار ہے۔ اس میں صبر وبرداشت کا مرحلہ پیش نہیں آتا۔ یا آپ نے ایسے دین کو اختیار کر رکھا ہے جس میں آپ کے سب معاملات درست رہیں تو یہ گویا ایک حد پر رہ کر دین دار بننا ہے۔

عمل کی دوسری قسم یہ ہے کہ آدمی ہر حال میں مطلوب دینی رویہ پر قائم رہے، خواہ صورت حال اس کے موافق ہو یا اس کے خلاف۔ یہ صابرانہ عمل ہے۔

یعنی دوسرا آدمی آپ کے ساتھ برا سلوک کرے تب بھی آپ اس کے ساتھ اچھا سلوک کریں۔ دوسرا آپ کو اشتعال دلائے تب بھی آپ اس سے معتدل انداز میں کلام کریں۔ حق پر قائم رہنے میں بظاہر آپ کا معاملہ بگڑتا ہو تب بھی آپ حق اور انصاف سے نہ ہٹیں، بظاہر بے اصولی اختیار کرنے میں فائدہ نظر آتا ہو تب بھی آپ پوری طرح با اصول بنے رہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کو آخرت میں بے حساب انعام دیا جائے گا۔ کیوں کہ انھوں نے صبر کی قیمت پر دینی عمل کیا۔

قلبی عمل

غزوۂ تبوک میں کچھ لوگ عذر کی بنا پر شریک نہ ہو سکے تھے۔ ان کی بابت قرآن میں آیا ہے کہ — ضعیفوں پر اور مریضوں پر اور محتاجوں پر کچھ گناہ نہیں جب کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی خیر خواہی کریں۔ نیکی والوں پر کوئی الزام نہیں۔ اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے (9:91)۔ اور نہ ان پر کوئی گناہ ہے کہ جب وہ تمہارے پاس آئے تا کہ تم ان کو سواری دو، تم نے کہا کہ میرے پاس کوئی چیز نہیں کہ میں تم کو سواری کے لیے دوں، وہ واپس

ہوئے اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے، اس غم میں کہ ان کے پاس کوئی چیز نہیں جس کو وہ خرچ کریں۔ (التوبہ) محمد بن اسحاق کی روایت ہے کہ یہ سات افراد تھے جو انصار کے گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اس سلسلہ میں ایک روایت ان الفاظ میں آئی ہے: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ”لَقَدْ خَلَّفْتُمْ بِالْمَدِينَةِ أَقْوَامًا، مَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ نَفَقَةٍ، وَلَا قَطَعْتُمْ وَادِيًا، وَلَا نِلْتُمْ مِنْ عَدُوٍّ نَيْلًا، إِلَّا وَقَدْ شَرَكُوكُمْ فِي الْأَجْرِ قَالُوا: وَهُمْ بِالْمَدِينَةِ قَالَ: نَعَمْ، حَبَسَهُمُ الْعُذْرُ (تفسیر ابن کثیر، جلد 4، صفحہ 336)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تم نے مدینہ میں ایسے لوگ چھوڑے ہیں کہ تم نے جو بھی خرچ کیا تم نے جو وادی بھی طے کی، اور تم نے دشمن پر جو کامیابی بھی حاصل کی، ان سب کے اجر میں وہ شریک تھے صحابہ نے کہا کہ اگرچہ وہ مدینہ میں تھے۔ آپ نے فرمایا ہاں، ان کو عذر نے روک دیا۔

آدمی نہ کر کے بھی کرنے والوں کے اجر میں شریک ہوسکتا ہے۔ بظاہر کچھ نہ پا کر بھی اس کا شمار ان لوگوں میں کیا جا سکتا ہے جنھوں نے بہت کچھ پایا۔ ایسا کیوں کر ہوتا ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ جس کام میں ہم عملاً شریک نہ ہو سکے اس میں ہم جذبہ کے اعتبار سے شریک ہو جائیں۔ کسی کو اپنے سے بڑا دیکھیں تو اس پر حسد کرنے کے بجائے اس کی بڑائی کا اعتراف کر لیں۔ کسی کے پاس ہم سے زیادہ مال ہو تو ہم دل سے یہ چاہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کے اندر شکر کا جذبہ پیدا کرے اور اس کو حقوق کی ادائیگی کی توفیق دے۔ کسی کو ”مقرر“ کے اسٹیج پر جگہ مل جائے اور ہم صرف ”سامع“ بنے ہوئے ہوں تو ہم اس کے لیے دعا کریں کہ خدایا تو اس کو توفیق دے کہ اس کی زبان سے جو کچھ نکلے حق نکلے اس کی زبان ناحق بولنے سے محفوظ رہے۔

اعتماد و توکل

قرآن میں ہے کہ جب تم معاملہ کا فیصلہ کرلو تو اللہ پر بھروسہ رکھو: فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ (3:159)۔ گویا عمل کا پختہ ارادہ انسان کو کرنا ہے اور نتیجہ کے معاملہ کو اللہ کے سپرد کردینا ہے۔

الترمذی کی روایت ہے کہ حضرت عمر فاروق نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ اگر تم اللہ پر اس طرح بھروسہ کرو جس طرح بھروسہ کرنے کا حق ہے تو ضرور وہ تم کو اسی طرح روزی دے گا جس طرح وہ چڑیا کو روزی دیتا ہے۔ چڑیا صبح کو خالی پیٹ نکلتی ہے اور شام کو بھرے پیٹ کے ساتھ واپس آتی ہے — لَوْ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَوَكَّلُونَ عَلَى اللّٰهِ حَقَّ تَوَكُّلِهِ لَرُزِقْتُمْ كَمَا يُرْزَقُ الطَّيْرُ تَغْدُو خِمَاصًا وَتَرُوحُ بِطَانًا (سنن الترمذی، حدیث نمبر 2344)۔ چڑیا اپنے بسیرے کے مقام سے نکل کر روزی کی تلاش میں جاتی ہے۔ یہ نکلنا اس کا اپنا فعل ہوتا ہے۔ اس کے بعد جو رزق اسے ملتا ہے وہ اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔ رزق کی تلاش چڑیا کا کام ہے اور تلاش کے نتیجہ کا تعلق خدا سے۔

الترمذی (کتاب القیامۃ) میں ہے کہ ایک شخص نے پوچھا کہ اے خدا کے رسول، میں اپنے اونٹ کو باندھوں اور پھر توکل کروں یا اس کو چھوڑ دوں اور پھر توکل کروں، آپ نے فرمایا تم اپنے اونٹ کو باندھو اور پھر توکل کرو: يَا رَسُولَ اللّٰهِ أَعْقِلُهَا وَأَتَوَكَّلُ، أَوْ أُطْلِقُهَا وَأَتَوَكَّلُ؟ قَالَ: اعْقِلْهَا وَتَوَكَّلْ (سنن الترمذی، حدیث نمبر 2517)۔ گویا اپنے جانور کو باندھنے کا کام خود آدمی کو انجام دینا ہے۔ باندھنے کے بعد جانور ٹھہرے گا یا رسی توڑ کر بھاگ جائے گا، اس معاملہ میں خدا کی کارسازی پر اعتماد کرنا ہے۔ اسی کو کہا گیا ہے کہ کوشش میری طرف سے اور اس کی تکمیل اللہ کی طرف سے (السعی منی والاتمام من اللہ)۔

ہر کام میں ایک چیز ہوتی ہے محنت، اور دوسری چیز ہے نتیجۂ محنت۔ توکل کا تعلق محنت سے نہیں ہے بلکہ نتیجۂ محنت سے ہے۔ مومن وہ ہے کہ جب وہ کوئی کام کرنے کے لیے اٹھے تو پورے عزم کے ساتھ اس کو انجام دے۔ وہ اپنی پوری طاقت اس میں لگا دے۔ مگر نتیجہ کے معاملہ کو وہ اللہ کے اوپر چھوڑ دے۔ آدمی اگر محنت کو خدا پر چھوڑے گا تو اس سے کاہلی اور بے عملی پیدا ہوگی۔ اور اگر وہ نتیجہ میں توکل کا طریقہ اختیار نہ کرے گا تو وہ مایوسی اور دل شکستگی کا شکار ہو کر رہ جائے گا۔

برتر روش

قرآن کی تقریباً دو سو آیتیں براہ راست طور پر صبر سے متعلق ہیں۔ اور بقیہ آیتیں بالواسطہ طور پر صبر سے متعلق۔ گویا قرآن کی تمام تعلیمات صبر پر مبنی ہیں۔ یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ قرآن صبر کی کتاب ہے۔

صبر کی براہ راست آیتوں کا معاملہ واضح ہے۔ مثلاً: وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ (2:45) وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا أَصَابَكَ (31:17) وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ (103:3) وَدَعْ أَذَاهُمْ (33:48)۔ یہ آیتیں وہ ہیں جن میں براہ راست الفاظ میں صبر کا حکم دیا گیا ہے۔

مگر دوسری بیشتر آیتوں کا بھی صبر سے نہایت گہرا تعلق ہے۔ مثلاً قرآن کی پہلی آیت ہے: الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ (1:2)۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو یہ مطلوب ہے کہ اس کے بندے اس کا شکر اور تعریف کریں۔ یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ موجودہ دنیا میں کوئی بھی آدمی ناخوشگوار تجربات سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ قرآن کے مطابق انسان کو کبد (90:4) (مشقت) میں پیدا کیا گیا ہے۔ ایسی حالت میں کسی کے لیے بھی یہ ممکن نہیں کہ وہ یہاں خوشیوں اور مسرتوں کی زندگی بنا سکے۔

پھر حقیقی معنوں میں کوئی آدمی شکر کرنے والا کیسے بن سکتا ہے۔ اس کا واحد راز صبر ہے۔ یعنی آدمی جب دنیا میں پیش آنے والی مصیبتوں پر صبر کرے گا، اسی وقت اس کے لیے ممکن ہوگا کہ سچا کلمۂ شکر اس کی زبان پر جاری ہو سکے۔ اسی لیے قرآن میں شکر کے ساتھ صبر کو وابستہ کیا گیا ہے (لقمان، 31:31)۔

صبر آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ مسائل کے مقابلہ میں تسخیری انداز کا برتر حل دریافت کر سکے۔ آدمی جب فریق ثانی کے مقابلہ میں بھڑک جائے تو وہ اس پوزیشن میں نہیں ہوتا کہ وہ سوچ کر کوئی گہرا جواب دے یا کوئی دوررس منصوبہ بنا سکے۔ مگر جب وہ صبر و تحمل سے کام لیتا ہے تو وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ فوری اقدام کے بجائے سوچا سمجھا ہوا اقدام کرے۔ اور یہ تاریخ کا تجربہ ہے کہ فوری اقدام کرنے والا ہمیشہ ناکام ہوتا ہے اور سوچ سمجھ کر اقدام کرنے والا ہمیشہ کامیاب۔

صبر ہر قسم کے مسائل کا برتر حل (سپیریر سولیوشن) ہے۔

اعتدال کا طریقہ

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بہتر عمل بیچ کا عمل ہے — خَيْرُ الْأُمُورِ أَوْسَطُهَا (شعب الایمان للبیہقی، حدیث نمبر 6229)۔ حضرت علیؓ کا ایک قول ان الفاظ میں نقل کیا گیا ہے کہ تم درمیانی طریقہ اختیار کرو — عَلَيْكُمْ بِالنَّمَطِ الْأَوْسَطِ (تفسیر قرطبی، جلد 2، صفحہ 154)۔

بیچ کے عمل سے مراد اعتدال کا عمل ہے۔ اس کی ایک مثال قرآن کی اس آیت میں ہے: کہ خرچ کرنے کے معاملہ میں تم نہ تو اپنا ہاتھ گردن سے باندھ لو اور نہ اس کو بالکل کھلا

چھوڑ دو کہ تم ملامت زدہ اور عاجز بن کر رہ جاؤ (17:29) ۔ اسی بات کو دوسری جگہ اس طرح فرمایا کہ اور وہ لوگ کہ جب وہ خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ تنگی کرتے ہیں، اور ان کا خرچ اس کے درمیان اعتدال پر ہوتا ہے (25:67) ۔

اس آیت کے مطابق، انفاق اوسط یہ ہے کہ نہ بہت زیادہ نہ بہت کم۔ بلکہ درمیانی مقدار جس کو آسانی کے ساتھ آدمی اختیار کر سکا — اسی طرح نفل روزے، نفل نمازوں وغیرہ میں بھی یہ مطلوب ہے کہ آدمی بیچ کا راستہ اختیار کرے جس کو وہ دیر تک نباہ سکتا ہو۔

اس معتدل انداز کا تعلق زندگی کے تمام معاملات سے ہے۔ ہر معاملہ میں آدمی کو افراط اور تفریط سے بچنا ہے۔ ہر معاملہ میں دو انتہاؤں کے درمیان بین بین والی صورت اختیار کرنا ہے۔ یہی طریقہ دینی مزاج کے مطابق ہے اور اسی میں کامیابی ہے۔

یہ درمیانی طریقہ دوسرے لفظوں میں غیر جذباتی طریقہ ہے۔ کوئی صورت حال پیش آنے پر جب آدمی بے قابو ہو جائے تو وہ اعتدال پر نہیں رہتا، بلکہ ایک انتہا یا دوسری انتہا کی طرف چلا جاتا ہے۔ لیکن جب آدمی اپنے جذبات کو قابو میں رکھے تو وہ سوچ کر اپنی کارروائی کا رخ متعین کرے گا۔ اور سوچ سمجھ کر کیا ہوا عمل معتدل عمل ہی ہوتا ہے۔ غیر معتدل آدمی دوستی میں بھی حد سے گزر جائے گا اور دشمنی میں بھی حد سے باہر چلا جائے گا۔ وہ کبھی ضرورت سے زیادہ پر امید ہو جائے گا اور کبھی ضرورت سے زیادہ مایوس۔ وہ غیر ضروری طور پر کسی کو بہت اچھا سمجھ لے گا اور کسی کو بہت زیادہ برا — لیکن قدرت کا فیصلہ ہے کہ اس دنیا میں معتدل آدمی کامیاب ہو اور غیر معتدل آدمی ہمیشہ ناکام۔

بہتر انسان

عَنْ أَبِيهِ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صلى الله عليه وسلم وَقَفَ عَلَى نَاسٍ جُلُوسٍ، فَقَالَ: أَلَا أُخْبِرُكُمْ بِخَيْرِكُمْ مِنْ شَرِّكُمْ؟ قَالَ: فَسَكَتُوا، فَقَالَ ذَلِكَ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ، فَقَالَ رَجُلٌ: بَلَى يَا رَسُولَ اللَّهِ، أَخْبِرْنَا بِخَيْرِنَا مِنْ شَرِّنَا، قَالَ: خَيْرُكُمْ مَنْ يُرْجَى خَيْرُهُ وَيُؤْمَنُ شَرُّهُ۔ (سنن الترمذی، حدیث نمبر 2263)۔ ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کی ایک مجلس کے پاس کھڑے ہوئے اور فرمایا: کیا میں تم کو تمہارے اندر اچھے اور برے شخص کے بارے میں نہ بتاؤں۔ راوی کہتے ہیں کہ لوگ چپ رہے۔ تب آپ نے تین بار یہی بات کہی۔ پھر ایک شخص نے کہا کہ ہاں اے خدا کے رسول، آپ ہم کو ہمارے اچھے اور برے کے بارے میں بتائیے۔ آپ نے فرمایا: تم میں اچھا وہ شخص ہے جس سے اس کے خیر کی امید کی جائے اور جس کے شر سے لوگ سلامت ہوں۔

یہ حدیث نہایت واضح طور پر بتاتی ہے کہ اچھا آدمی کون ہے اور برا آدمی کون ہے۔ اچھا آدمی وہ ہے جس کے بارے میں پیشگی طور پر یقین کیا جا سکے کہ جب بھی اس سے کسی کا سابقہ پیش آئے گا تو اس کو اس آدمی سے خیر ہی کا تحفہ ملے گا۔ اس سے جن لوگوں کو بھی تجربہ ہو گا درست قول اور نیک عمل ہی کا تجربہ ہوگا۔ کوئی بھی چیز اس کو اس پر آمادہ نہیں کرے گی کہ وہ لوگوں کے ساتھ خیر کے بجائے شر کا معاملہ کرنے لگے۔

ایسے آدمی کے اندر بلاشبہ شر بھی چھپا ہوتا ہے۔ کیوں کہ اس کو بھی دوسروں کی طرح

خلاف مزاج بات ناپسند ہوتی ہے۔ اشتعال انگیز بات پر اس کو بھی غصہ آتا ہے۔ اس کے اندر بھی نفرت اور عداوت کا طوفان جاگتا ہے۔ اس کو بھی نقصان اور زیادتی کے مواقع پر تکلیف ہوتی ہے۔ مگر ان سب کے باوجود وہ اپنی اصولی حیثیت پر قائم رہتا ہے۔

وہ نفسیاتی جھٹکوں کو اپنے اوپر سہتا ہے۔ وہ خود کڑوا گھونٹ پی کر دوسروں کو میٹھا گھونٹ پلاتا ہے۔ وہ زیادتی کے واقعات کو اللہ کے خانہ میں ڈال دیتا ہے تاکہ اس کا ذہنی سکون بھنگ نہ ہو، وہ کامل یکسوئی کے ساتھ مقصدِ اعلیٰ کے لیے اپنی سرگرمی کو جاری رکھ سکے۔

ایک اسلامی حکم

قرآن میں اہل ایمان کو حکم دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ — اور کسی قوم کی دشمنی کہ اس نے تم کو مسجد حرام سے روکا، تم کو اس پر نہ ابھارے کہ تم زیادتی کرنے لگو۔ تم نیکی اور تقویٰ میں ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور زیادتی میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو۔ اللہ سے ڈرو، بے شک اللہ سخت عذاب دینے والا ہے (5:2)۔

6 ھ میں مکہ کے مشرکین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ کے اصحاب کو اس سے روک دیا تھا کہ وہ مکہ میں داخل ہوں اور عمرہ کی عبادت ادا کریں۔ اس موقع پر انھوں نے سخت قسم کی اشتعال انگیزی کا مظاہرہ کیا اور مسلمانوں کے اوپر زیادتیاں کیں۔ اس بنا پر مسلمانوں میں مشرکین کے خلاف غصہ تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ وہ بھی مشرک قبائل کے قافلوں کو روکیں اور ان کے خلاف انتقامی کارروائی کریں۔

مذکورہ آیت میں انھیں اس سے روک دیا گیا۔ اور حکم دیا گیا کہ دشمنی میں بے قابو نہ ہو اور ہر حال میں امن اور اعتدال کی روش پر قائم رہو۔

اس ذیل میں مزید یہ حکم دیا گیا کہ ”نیکی اور تقویٰ پر آپس میں تعاون کرو، گناہ اور

زیادتی پر ایک دوسرے کا تعاون نہ کرو" (5:2) اس موقع پر اس حکم کا مطلب کیا ہے، اس کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا شبیر احمد عثمانی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں: "اگر کوئی شخص بالفرض جوشِ انتقام میں زیادتی کر بیٹھے تو اس کے روکنے کی تدبیر یہ ہے کہ جماعت اسلام اس کے ظلم وعدوان کی اعانت نہ کرے بلکہ سب مل کر نیکی اور پرہیز گاری کا مظاہرہ کریں۔ اور اشخاص کی زیادتیوں اور بے اعتدالیوں کو روکیں (تفسیر عثمانی، صفحہ 137)

کسی گروہ میں ایک ایک آدمی سنجیدہ نہیں ہوتا۔ کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو جذباتی ہوتے ہیں اور وہ فریق مخالف کی اشتعال انگیزی پر بھڑک اٹھیں۔ ایسے موقع پر جماعت کے بقیہ، لوگوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے جذباتی لوگوں کو روکیں، وہ چپ رہنے کے بجائے بولیں، وہ ان کی حمایت کرنے کے بجائے ان کی مذمت کریں۔ اگر بقیہ لوگ ایسا نہ کریں گے تو قرآن کے الفاظ میں، وہ تعاون علی الاثم والعدوان کے مجرم قرار پائیں گے۔

شکایت کے باوجود

فتح مکہ کا واقعہ رمضان 8ھ میں پیش آیا۔ اس کے جلد ہی بعد شوال 8ھ میں غزوۂ حنین ہوا۔ مکہ کی طرف اقدام سے کچھ ہی پہلے خالد بن الولید نے مدینہ آ کر اسلام قبول کیا تھا۔ اس کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں مہموں میں حضرت خالد کو مسلم لشکر کا سردار بنا دیا۔

یہ بات انصار کے اوپر شاق تھی۔ کیوں کہ انصار کے لوگ بہت پہلے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر ایمان لا کر جاں نثاری کر رہے تھے۔ جب کہ حضرت خالد ابھی نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ آج کل کی زبان میں یہ گویا سینئر اور جونیئر کو ترجیح دینے کا معاملہ تھا۔ تاہم اس شکایت کے باوجود تمام انصار رسول اللہ کے ساتھ رہے، انھوں نے آپ کے ہر حکم کی اطاعت کی۔

خاتمۂ جنگ کے بعد عرب رواج کے مطابق شعراء نے اس کے بارے میں اشعار کہے۔ انصار کے ایک شاعر عباس بن مرداس نے بھی اس موقع پر کچھ اشعار کہے۔ اس میں ایک طرف اس شکایت کا بھی تذکرہ تھا کہ آپ نے ہمارے اوپر خالد کو ترجیح دی اور ان کو قوم کے اوپر امیر بنادیا — فإن تکُ قد امّرتَ فی القومِ خالداً مگر اسی کے ساتھ شاعر نے کہا:

وقالَ نبیُّ المؤمنین تقدّمُوا فحُبّبَ إلینا اَن نکونَ اْلمُقَدَّمَا

اور مسلمانوں کے نبی نے کہا کہ تم لوگ آگے بڑھو، تو ہمارے لیے یہ محبوب بن گیا کہ ہم آگے بڑھ کر مقابلہ کرنے والے ہوں (سیرت ابن ہشام، جلد 4، صفحہ 111)۔

انصار کو اگرچہ ظاہر حالات کے مطابق شکایت تھی۔ مگر اس شکایت کو انھوں نے اپنے عمل پر اثرانداز ہونے نہیں دیا۔ شکایت کے باوجود وہ تمام مسلمانوں کے ساتھ پوری طرح جڑے رہے۔ شکایت کے باوجود وہ اسلام کے محاذ پر متحدہ طاقت بن کر کھڑے ہو گئے۔

موجودہ دنیا میں یہ ناممکن ہے کہ باہم شکایتیں پیدا نہ ہوں۔ صحیح یا غلط اسباب کے تحت بہر حال ایک کو دوسرے سے شکایت پیدا ہوتی ہے، حتیٰ کہ رسول اور اصحاب رسول سے بھی۔ مگر مومن شکایتوں سے بلند ہوتا ہے، وہ شکایتوں سے اوپر اٹھ کر معاملہ کرتا ہے۔ اسی لیے مومنین کی جماعت میں کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ شکایت اور اختلاف ان کے اتحاد کو درہم وبرہم کر دے۔

عبادت اور اخلاق

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لَا یَشْکُرُ اللّٰہَ مَنْ لَا یَشْکُرُ النَّاسَ (سنن ابی داؤد، حدیث نمبر 4811) یعنی، وہ آدمی جو انسان کا شکر نہ کرے وہ اللہ کا شکر بھی نہیں کر سکتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام میں الٰہیات اور انسانیات دونوں ایک دوسرے سے الگ نہیں ہیں۔ اسلام میں الٰہی عبادت کا تعلق بھی انسانی اخلاق سے جڑا ہوا ہے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اس آدمی کی نماز اس کے لیے وبال ہے جس کا حال یہ ہو کہ وہ لوگوں کو چھوٹی چھوٹی چیزیں دینے میں بھی بخیل ہو (الماعون ،7-4:107) ۔حدیث میں ہے کہ اس آدمی کا روزہ روزہ نہیں جو بظاہر روزہ رکھے مگر وہ قولی اور عملی جھوٹ کو نہ چھوڑے (صحیح البخاری، حدیث نمبر 1903) ۔قرآن میں ہے کہ مومن اس طرح صدقہ دیتا ہے کہ وہ لینے والے سے کوئی بدلہ یا شکر گزاری نہیں چاہتا (الدھر ،76:9) حج کے بارے میں قرآن میں آیا ہے کہ حج میں نہ بیہودہ گوئی کرنا چاہیے اور نہ بے حکمی اور نہ لڑائی جھگڑا (البقرہ ،2:197) ۔

عبادت اور اخلاق کا ایک دوسرے سے جڑا ہونا فطرت کا عین تقاضا ہے۔ انسان کا ہر عمل اس کی نفسیات کے تحت ہوتا ہے۔ اور نفسیات میں تقسیم ممکن نہیں۔ آدمی کے اندر اگر صحیح معنوں میں عبادت کی نفسیات پیدا ہو جائے تو اس کے بعد اخلاق کی نفسیات بھی ضرور اس کے اندر پیدا ہو جائے گی۔ کسی کے اندر اگر خدا پرستی ہے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ اس کے اندر انسان دوستی بھی لازماً موجود ہوگی۔

عبادت کوئی رسمی اور وقتی چیز نہیں۔ عبادت ایک گہرا روحانی عمل ہے۔ جس آدمی کے اندر عبادت کی روح آجائے اس کی پوری شخصیت میں تواضع ، احتیاط، خیر خواہی اور فضولیات سے پرہیز کا مزاج پیدا ہو جائے گا۔ اور یہی کیفیات اخلاق کی اصل ہیں۔ یہ لطیف کیفیات جب سماجی تعلقات میں ظاہر ہوں تو اسی کا دوسرا نام انسانی اخلاق ہے۔

ایک عبادت گزار لازمی طور پر انسانی خدمت گار بھی ہوتا ہے۔ اس کے اخلاق و عادات اور گفتار و کردار میں شرافت اور انسانیت کی روح بسی ہوئی ہوتی ہے۔

اگر ایک آدمی سچا خدا پرست ہو تو لازماً وہ سچا انسان دوست بھی ہوگا۔ یہ دونوں صفتیں کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتیں۔

معیار کو بلند کرنا

قدیم عرب میں برابر کی اخلاقیات کا رواج تھا۔ ان کی زندگی کا اصول یہ تھا کہ جو شخص جیسا کرے، اس کے ساتھ ویسا ہی کیا جائے۔ یعنی اچھا سلوک کرنے والے کے ساتھ اچھا سلوک اور بُرا سلوک کرنے والے کے ساتھ برا سلوک۔ ایک جاہلی شاعر اپنے حریف قبیلہ کے بارے میں کہتا ہے کہ زیادتی کی کوئی قسم ہم نے باقی نہیں چھوڑی۔ انھوں نے ہمارے ساتھ جیسا کیا تھا، ویسا ہی ہم نے ان کو بدلہ دیا:

وَلَمْ يَبْقَ سوَى الْعُدْوَا نِ دِنَّاهُمْ كَمَا دَانوا

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو آپ نے ان کے اس تصور اخلاق کو بدلا۔ مساویانہ اخلاق کے بجائے آپ نے ان کو بلند اخلاق کی تعلیم دی۔ آپ نے فرمایا—
اَحِسنْ الیٰ من اساء الیک (المعجم ابن الاعرابی، حدیث نمبر 1507)۔ یعنی، جو شخص تمہارے ساتھ بُرا سلوک کرے، اس کے ساتھ تم اچھا سلوک کرو۔ ایک اور حدیث کے الفاظ یہ ہیں: لَا تَكُونُوا إِمَّعَةً، تَقُولُونَ: إِنْ أَحْسَنَ النَّاسُ أَحْسَنَّا، وَإِنْ ظَلَمُوا ظَلَمْنَا، وَلَكِنْ وَطِّنُوا أَنْفُسَكُمْ، إِنْ أَحْسَنَ النَّاسُ أَنْ تُحْسِنُوا، وَإِنْ أَسَاءُوا فَلَا تَظْلِمُوا (سنن الترمذی، حدیث نمبر 2007)۔ یعنی، تم لوگ اِمّعہ نہ بنو کہ یہ کہنے لگو، اگر لوگ ہمارے ساتھ اچھا کریں تو ہم بھی ان کے ساتھ اچھا کریں گے۔ اور اگر وہ زیادتی کریں تو ہم بھی زیادتی کریں گے۔ بلکہ اپنے آپ کو اس کے لیے تیار کرو کہ لوگ تمہارے ساتھ اچھا کریں تو تم ان کے ساتھ اچھا کروگے اور اگر لوگ تمہارے ساتھ برا کریں تب بھی تم ان کے ساتھ زیادتی نہیں کروگے۔

آپ کی ایک سنت یہ بھی ہے کہ لوگوں کے شعور کو بلند کیا جائے۔ ان کے اخلاق کو اونچا کیا جائے۔ ان کی حالت کو ہر اعتبار سے اوپر اٹھانے کی کوشش کی جائے۔

انسان کے انسانی معیار کو بلند کرنا، فکری، علمی، اخلاقی حیثیت سے اس کو اوپر اٹھانا، اہم ترین کام ہے۔ اسی میں فرد کی بھلائی ہے اور اسی میں پورے معاشرہ کی بھلائی بھی۔ یہ عین سنّت رسول ہے اور اس کو زندہ کرنا سنّت رسول کو زندہ کرنا ہے۔

ترک تعلق

قطع تعلق اور ترک کلام کو اسلام میں حرام قرار دیا گیا ہے۔ حدیث کی مختلف کتابوں میں اس سلسلہ میں بہت سی روایتیں آئی ہیں۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم دونوں میں یہ روایت ہے کہ: لَا يَحِلُّ لِرَجُلٍ أَنْ يَهْجُرَ أَخَاهُ فَوْقَ ثَلَاثِ لَيَالٍ، يَلْتَقِيَانِ فَيُعْرِضُ هَذَا وَيُعْرِضُ هَذَا، وَخَيْرُهُمَا الَّذِي يَبْدَأُ بِالسَّلَامِ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 6077)۔ کسی آدمی کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنے بھائی سے تین دن سے زیادہ ترک تعلق کرے۔ دونوں ملیں تو ایک اِدھر منہ پھیر لے اور دوسرا اُدھر منہ پھیر لے۔ اور دونوں میں بہتر وہ ہے جو سلام کرنے میں پہل کرے۔

ایک روایت میں ہے کہ ہر دوشنبہ اور جمعرات کو جنّت کے دروازے کھولے جاتے ہیں۔ پھر ہر اس بندہ کو بخش دیا جاتا ہے جس نے اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرایا ہو سوا اس آدمی کے جس کی اپنے بھائی کے ساتھ عداوت ہو۔ کہا جاتا ہے کہ ان دونوں کے بارے میں انتظار کرو، یہاں تک کہ وہ آپس میں اپنے تعلق کو درست کرلیں (صحیح مسلم، حدیث نمبر 2565)۔

ایک روایت کے مطابق ایک صحابی کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ جو شخص اپنے بھائی سے ایک سال تک تعلق توڑے رہے تو وہ اس کا خون بہانے کے برابر ہے (سنن ابی داؤد، حدیث نمبر 4915)۔ سنن ابو داؤد میں ایک اور

روایت اس طرح ہے: لَا یَحِلُّ لِمُسْلِمٍ أَنْ یَھْجُرَ أَخَاهُ فَوْقَ ثَلَاثٍ، فَمَنْ ھَجَرَ فَوْقَ ثَلَاثٍ فَمَاتَ دَخَلَ النَّارَ (سنن ابو داؤد، حدیث نمبر 4914)۔ کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنے بھائی سے تین دن سے زیادہ ترک تعلق کرے۔ پس جو شخص تین دن سے زیادہ ترک تعلق کرے اور اسی حال میں مر جائے تو وہ آگ میں داخل ہوگا۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی کسی سے غصہ ہو کر اس سے تعلق توڑ لیتا ہے اور اس سے بولنا بند کر دیتا ہے۔ یہ برائی مردوں میں بھی ہے اور عورتوں میں بھی۔ مگر یہ سخت گناہ ہے۔ وہ اتنا زیادہ سنگین ہے کہ آدمی اپنی اصلاح نہ کرے اور اسی حالت میں اس پر موت آجائے تو نماز روزہ کے باوجود سخت اندیشہ ہے کہ وہ خدا کی پکڑ میں آجائے گا۔

چپ رہنا

عبداللہ بن عمرو کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلّے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَنْ صَمَتَ نَجَا (سنن الترمذی، حدیث نمبر 2501)۔ یعنی، جو شخص چپ رہا اس نے نجات پائی۔ اسی طرح ایک اور روایت کے مطابق، آپ نے فرمایا: الصَّمْتُ حُکْمٌ وَقَلِیلٌ فَاعِلُهُ (مسند الشہاب للقضاعی، حدیث نمبر 240)۔ یعنی، خاموشی حکمت ہے۔ مگر بہت کم ہیں جو اس پر عمل کرتے ہوں۔

خاموشی بے عملی نہیں، خاموشی خود ایک اعلیٰ ترین عمل ہے۔ انسان کی سب سے بڑی خصوصیت اس کا صاحبِ دماغ ہونا ہے۔ اور خاموشی اس بات کی علامت ہے کہ آدمی واقعتہً دماغ والا انسان ہے۔ وہ اپنے اندر ذہنی عمل کی صلاحیت رکھتا ہے۔

چپ رہنا سوچنا ہے۔ جب آدمی چپ ہو تو وہ سادہ طور پر صرف چپ نہیں ہوتا، وہ اس

وقت غور وفکر میں مشغول ہوتا ہے۔ اور غور وفکر بلا شبہ سب سے بڑا عمل ہے۔ بولنا اگر اعضاء و جوارح کی حرکت کا نام ہے تو چپ رہنا دماغ کی حرکت کا نام۔ بولنا اگر آدھا عمل ہے تو چپ رہنا پورا عمل۔

چپ رہنا سنجیدگی کی علامت ہے۔ جب آدمی چپ ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ باتوں کو گہرائی کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ بولنے سے پہلے یہ سوچ رہا ہے کہ کیا بولے اور کیا نہ بولے۔ وہ دوسروں کو مخاطب بنانے سے پہلے خود اپنے آپ کو مخاطب بنا رہا ہے۔ وہ عاجلانہ اقدام کے بجائے سوچے سمجھے اقدام کا منصوبہ بنانے میں مشغول ہے۔

بولنا بے صبری ہے اور چپ رہنا صبر ہے۔ بولنا بے احتیاطی ہے اور چپ رہنا احتیاط ہے۔ بولنا غیر ذمہ دارانہ انداز ہے اور چپ رہنا ذمہ دارانہ انداز۔ بولنا محدودیت ہے۔ جو آدمی بول دے اس کی گویا حد آ گئی، مگر چپ رہنا لامحدودیت ہے۔ جو آدمی چپ ہو وہ اتھاہ آدمی ہے۔ وہ ایسا آدمی ہے جس کی ابھی حد نہیں آئی۔ بولنے والا آدمی فوراً بول پڑتا ہے، اور چپ رہنے والا آدمی اس وقت بولتا ہے جب کہ تمام لوگ اپنے الفاظ ختم کر چکے ہوں۔

اسلام آدمی کے اندر خود احتسابی اور غور فکر کا مزاج بناتا ہے۔ وہ ایسے افراد تیار کرتا ہے جو سوچنے والے ہوں، جو بولنے سے زیادہ چپ رہنے کو محبوب رکھتے ہوں۔

صبر ضروری

قدیم مصر میں بنی اسرائیل سے تعلق رکھنے والا ایک شخص قارون (korah) نام کا تھا۔ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہم عصر اور رشتہ دار تھا۔ اس نے دنیا داری اور مصلحت پرستی کے ذریعہ بہت زیادہ دولت اکٹھا کر لی تھی۔ قرآن میں اس کے قصہ کے ذیل میں بتایا گیا ہے

کہ ایک بار وہ پوری زینت اور نمائش کے ساتھ اپنی قوم کے سامنے نکلا۔ قوم (بنی اسرائیل) کے کچھ لوگوں کو اس پر رشک آیا۔ انھوں نے کہا کہ کاش ہم کو بھی وہی ملتا جو قارون کو دیا گیا ہے۔ بے شک وہ بڑی قسمت والا ہے (القصص، 28:79)۔

اس کے بعد قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ بنی اسرائیل میں جو علم والے لوگ تھے انھوں نے کہا کہ تمہارا برا ہو، اللہ کا انعام زیادہ بہتر ہے اس شخص کے لیے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرے۔ اور یہ انھیں کو ملتا ہے جو صبر کرنے والے ہیں : وَلا يُلَقَّاها إِلَّا الصَّابِرُونَ (28:80)۔

یہاں اس قرآنی لفظ (وَلا يُلَقَّاها إِلَّا الصَّابِرُونَ) سے کیا مراد ہے، اس سلسلہ میں تفسیروں میں حسب ذیل اقوال آئے ہیں — اس قول کی توفیق انھیں ملتی ہے جو صبر کرنے والے ہیں۔ اعمال صالحہ کو وہی پاتے ہیں جو صبر کرنے والے ہیں، جنت کو وہی پاتے ہیں جو صبر کرنے والے ہیں:

ای لَا يُؤْتَى هَذِهِ الْكَلِمَةُ إِلَّا الصَّابِرُونَ (تفسیر البغوی، جلد 3، صفحہ 454)۔

أَي لَا يُؤْتَى الْأَعْمَالُ الصَّالِحَةُ إِلَّا الصَّابِرُونَ (تفسیر الخازن، جلد 3، صفحہ 371)

لَا يُؤْتَى الْجَنَّةَ فِي الْآخِرَةِ إِلَّا الصَّابِرُونَ (تفسیر القرطبی، جلد 13، صفحہ 317)

ایمان اور عمل اور جنت کے ساتھ صبر کیوں اتنا زیادہ جڑا ہوا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ دنیا آزمائش کی دنیا ہے۔ اس بنا پر آدمی کو یہاں طرح طرح کی رکاوٹوں سے سابقہ پیش آتا ہے۔ کبھی کوئی مشتعل کرنے والا اس کو مشتعل کر دیتا ہے۔ کبھی کسی کی طرف سے ایسا سلوک سامنے آتا ہے کہ اس کی اَنا بھڑک اٹھتی ہے۔ کبھی کوئی مسئلہ اتنا بڑھتا ہے کہ وہ اس کے لیے عزت کا سوال بن جاتا ہے، ایسے تمام مواقع پر اپنے آپ کو راہ راست پر قائم

رکھنے کے لیے صبر کی طاقت درکار ہوتی ہے۔ صبر نہیں تو ایمان نہیں۔ صبر نہیں تو اعمال صالحہ نہیں، صبر نہیں تو جنت بھی نہیں۔

صبر دنیا و آخرت کی تمام کامیابیوں کی کنجی ہے۔

اجتماعی آداب

قرآن کی سورہ نمبر 58 میں مجلس کے آداب بتاتے ہوئے کہا گیا ہے کہ: اے ایمان والو، جب تم سے کہا جائے کہ مجلسوں میں کھل کر بیٹھو تو تم کھل کر بیٹھو، اللہ تم کو کشادگی دے گا۔ اور جب کہا جائے کہ اٹھ جاؤ تو تم اٹھ جاؤ۔ اللہ درجے بلند کرے گا ان لوگوں کے جو تم میں سے ایمان والے ہیں اور جن کو علم دیا گیا ہے۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے (58:11)۔

مجلس میں آدمی اکیلا نہیں ہوتا بلکہ دوسرے بہت سے لوگ ہوتے ہیں۔ اگر ہر آدمی صرف اپنی فکر کرے تو دوسروں کو تکلیف ہوگی۔ اس لیے حکم دیا گیا کہ مجلس میں دوسروں کی رعایت کرو۔ مثلاً جگہ کم ہو تو سمٹ کر بیٹھیں یا ایک کرسی پر دو آدمی بیٹھ جائیں۔ آنے والوں میں کوئی شخص زیادہ قابل لحاظ ہے تو اس کے لیے جگہ خالی کردیں۔ اسی طرح جب اٹھنے کو کہا جائے تو فوراً اٹھ جائیں۔ کسی خود ساختہ عذر کی بنا پر مزید بیٹھے نہ رہیں۔

ابتدائی مفہوم کے اعتبار سے اس آیت میں مجلس کے آداب ہیں۔ مگر جامع مفہوم کے اعتبار سے اس میں پوری زندگی کے لیے اجتماعی آداب بتا دیے گئے ہیں۔

اجتماعی زندگی کو خوش اسلوبی کے ساتھ چلانے کے لیے دو چیزیں بہت ضروری ہیں۔ ایک، توسع، اور دوسرے یہ کہ باتوں کو سادہ طور پر لیا جائے۔ کسی بات کو عزت کا سوال نہ بنایا جائے۔

جس طرح ایک مجلس میں توسع کا انداز اختیار کرنے سے مجلس کامیاب ہوتی ہے اور ہر ایک کو حسن وخوبی کے ساتھ استفادہ کا موقع ملتا ہے۔ اسی طرح عام زندگی میں توسع کا طریقہ زندگی کے نظام کو خوش اسلوبی کے ساتھ چلانے کا ضامن ہے۔

مجلس میں کبھی اس کی ضرورت پیش آتی ہے کہ ایک آدمی کے بیٹھنے کے لیے دوسرا آدمی اپنی جگہ خالی کردے۔ اسی طرح زندگی کے وسیع تر معاملات میں بھی بار بار اس کی ضرورت پیش آتی ہے کہ ایک لائق آدمی کو کام کا موقع دینے کے لیے دوسرا آدمی اپنے کو پیچھے کرلے۔ ادارہ کا ایک آدمی ادارہ کے مفاد میں ایک فیصلہ دے دے تو دوسرے لوگ اس کو مان لیں۔ وہ ایسا نہ کریں کہ اس کو ذاتی عزت کا سوال بنا کر داخلی انتشار پیدا کرنے میں لگ جائیں۔

درس حدیث

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف کے بارے میں صحابہ کے اقوال کثرت سے حدیث کی کتابوں میں موجود ہیں۔ ان میں سے ایک عائشہ رضی اللہ عنہا کی وہ روایت ہے جو صحیح البخاری میں آئی ہے۔ امام بخاری نے اس کو اپنی کتاب میں معمولی فرق کے ساتھ چار مقام پر نقل کیا ہے۔ کتاب المناقب میں، کتاب الادب میں اور کتاب الحدود میں دو باب کے تحت۔ کتاب الادب کے الفاظ یہ ہیں: عَنْ عَائِشَةَ رضي الله عنها أَنَّهَا قَالَتْ: مَا خُيِّرَ رَسُولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم بَيْنَ أَمْرَيْنِ قَطُّ إِلَّا أَخَذَ أَيْسَرَهُمَا مَا لَمْ يَكُنْ إِثْمًا، فَإِنْ كَانَ إِثْمًا كَانَ أَبْعَدَ النَّاسِ مِنْهُ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 6126)۔ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ جب بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دو معاملہ کے درمیان کسی ایک معاملہ کو اختیار کرنا ہوتا تو آپ ہمیشہ دونوں میں سے آسان معاملہ کو لے لیتے تھے جب تک وہ گناہ نہ ہو۔ پس اگر وہ گناہ ہوتا تو آپ سب سے زیادہ اس سے دور رہتے۔

یہ حدیث امام مسلم نے اپنی صحیح (حدیث نمبر 2327) میں اور امام طبرانی نے الاوسط (حدیث نمبر 2918) میں نقل کی ہے۔ وہاں اِلا ّ اخذَ ایسر ھما کی جگہ اِلا ّ اختار ایسر ھما کے الفاظ ہیں۔ یعنی آپ دونوں میں سے آسان کا انتخاب فرماتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ معاملات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ اسہل کو اختیار کرنے کا تھا نہ کہ اشدّ کو اختیار کرنے کا۔

طریق نبوت کے بارے میں حضرت عائشہ کا یہ بیان بے حد اہم ہے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی کی نہایت جامع تشریح ہے۔ وہ اسلام کی مستقل پالیسی کو بتاتا ہے۔ یہ پالیسی ایک لفظ میں ہے— ممکن سے آغاز۔

آسان اور مشکل کا مطلب سادہ طور پر محض آسان اور مشکل نہیں ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ دو راستوں سے وہ راستہ اختیار کرنا جو کھلا ہوا ہو، اس مقام پر سر نہ ٹکرانا جہاں راستہ بند ہو۔ اور آگے بڑھنے کے لیے ٹکراؤ ضروری ہو گیا ہو۔

اس پالیسی کا فائدہ یہ ہے کہ آدمی کو فوراً اپنے عمل کے لیے مثبت آغاز مل جاتا ہے۔ اس کا ہر قدم منزل کی طرف بڑھنے کے ہم معنی ہوتا ہے۔ اس کی قوتیں تخریب کے بجائے تعمیر پر صرف ہونے لگتی ہیں۔

پیغمبر کا طریقہ

حضرت ابوہریرہ کی ایک روایت ہے جس کو صحیح بخاری میں تین باب کے تحت نقل کیا گیا ہے۔ یہ روایت بتاتی ہے کہ طفیل بن عمرو الدوسی مکی دور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ انھوں نے آپ کا پیغام سنا۔ ان پر اتنا گہرا اثر ہوا کہ اسی وقت وہ آپ کے

ہاتھ پر بیعت کر کے اسلام میں داخل ہو گئے۔ اس کے بعد آپ نے ان سے کہا کہ تم اپنے قبیلہ میں واپس جاؤ اور لوگوں کو دین توحید کی طرف بلاؤ۔ وہ اپنے قبیلہ کی طرف واپس گئے اور ان کو دعوت دینا شروع کیا (صحیح البخاری، حدیث نمبر 6126)۔

ان کی ساری کوشش کے باوجود صرف دو آدمی اسلام میں داخل ہوئے۔ ایک ان کے والد، اور دوسرے ابوہریرہ، جو اسی قبیلہ دوس سے تعلق رکھتے تھے۔ قبیلہ کی اکثریت ان کے خلاف ہوگئی اور طرح طرح سے ان کو ستانا شروع کیا۔ مدنی دور میں طفیل بن عمر الدوسی دوبارہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا کہ دوس کا قبیلہ سرکش ہو گیا ہے۔ اس نے توحید کی دعوت کو ماننے سے انکار کر دیا ہے۔ اس لیے آپ ان کے خلاف بددعا کیجیے۔ فَادْعُ اللّٰہَ عَلَیْہِمْ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 2327)۔

روایت میں آتا ہے کہ اس کو سن کر لوگوں نے گمان کیا کہ اب آپ قبیلہ کے خلاف بددعا کریں گے (المعجم الاوسط للطبرانی، حدیث نمبر 2918)۔ دوسری روایت میں ہے کہ لوگ کہنے لگے کہ اب قبیلہ دوس ہلاک ہو گیا (فتح الباری 6/166) مگر آپ نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھایا تو آپ کی زبان سے یہ دعائیہ لفظ نکلا: اللّٰهُمَّ اهْدِ دَوْسًا وَائْتِ بِهِمْ (مسند أحمد، حدیث نمبر 7315)۔ قبیلہ دوس کو ہدایت دے اور ان کو مجھ سے ملا دے (7/704) جلد ہی بعد قبیلۂ دوس کا حاکم حبیب بن عمرو اور دوسرے تمام لوگ دعوت توحید سے متاثر ہوئے اور اسلام میں داخل ہو گئے۔

اس واقعہ میں ایک سوچ پیغمبر کی ہے اور دوسری سوچ عام آدمی کی۔ عام آدمی نے صرف ظاہر کو جانا۔ وہ قبیلہ کے صرف وقتی ردعمل کو دیکھ سکا۔ چنانچہ اس نے قبیلہ کو گمراہ سمجھ کر اس کو ہلاکت کا مستحق قرار دے دیا۔ مگر پیغمبر کی بصیرت نے انسانی افکار سے اوپر اٹھ کر خدائی

توفیق کو دیکھا۔ اس کو نظر آیا کہ خدا اس کا منتظر ہے کہ دعا کرنے والے قبیلہ کے حق میں دعا کریں اور وہ اپنے بندوں کے لیے ہدایت کے دروازے کھول دے۔ تجربہ نے بتایا کہ عام آدمی کا اندازہ غلط تھا اور پیغمبر کا اندازہ نہایت صحیح اور درست۔

یہ واقعہ پیغمبر خدا کی ایک سنت کو بتاتا ہے — ناامیدی کے حالات میں بھی امید کے اوپر قائم رہنا۔

اخلاق کا کرشمہ

ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں قصۃ غورث بن الحارث کے عنوان کے تحت ایک واقعہ تفصیل کے ساتھ لکھا ہے، اس کا خلاصہ ہے:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب غزوہ ذات الرقاع (4 ھ) سے واپس لوٹ رہے تھے۔ ایک جگہ لوگوں نے پڑاؤ ڈالا، رسول اللہ بھی ایک درخت کے نیچے لیٹ گئے۔ اتنے میں دشمن قوم کا ایک آدمی غورث بن الحارث آیا۔ آپ کی تلوار درخت کی ایک شاخ سے لٹکی ہوئی تھی۔ اس نے تلوار اپنے ہاتھ میں لے لی اور کہا: مَن یَمنعُک مِنّی یا محمّد۔ یعنی، اے محمد، آپ کو مجھ سے کون بچائے گا۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ۔ اس نے کئی بار اپنا جملہ کہا۔ ہر بار آپ نے جواب دیا کہ اللہ۔ آپ کے اس جواب سے اس کے اوپر ہیبت طاری ہوئی اور اس نے تلوار زمین پر رکھ دی۔

اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تلوار اٹھا لی اور اس سے وہی جملہ فرمایا کہ تم کو میرے ہاتھ سے کون بچائے گا۔ اس نے کہا: کن خیر آخذ (بہتر پکڑنے والے بنو) اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ملامت نہیں کی۔ آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ تم خود تو برے

آخذ ثابت ہوئے اور مجھ کو اچھا آخذ بننے کے لیے کہہ رہے ہو۔ آپ نے اس کو معاف کرتے ہوئے اسے چھوڑ دیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر اس کو ملامت کرتے یا اس کو سزا دیتے تو اس کے اندر انتقال کا جذبہ بھڑکتا۔ مگر جب آپ نے اس کو سرزنش کیے بغیر چھوڑ دیا تو اس کا ضمیر جاگ اٹھا۔ وہ آپ کی شرافت اور آپ کے اخلاقی کمال کا مبلغ بن گیا۔ اس نے قبیلہ میں واپس جا کر یہ کہنا شروع کیا: جِئْتُكُمْ مِنْ عِنْدِ خَيْرِ النَّاسِ (البدایہ والنہایہ لابن کثیر، جلد 4، صفحہ 271-270)۔ میں اس شخص کے یہاں سے واپس آرہا ہوں جو تمام لوگوں میں سب سے بہتر ہے۔

انتقام کا طریقہ صرف مسئلہ کو بڑھاتا ہے۔ جب کہ معافی کا طریقہ مسئلہ کو آخری حد تک ختم کر دیتا ہے۔ اسی کے ساتھ اس کا مزید فائدہ یہ ہے کہ وہ معاف کرنے والے کی عظمت کا ایک ایسا مظاہرہ ہے جس کے بعد جانی دشمن بھی وفادار دوست بن جائے۔

آگ کا ٹکڑا

عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رضي الله عنها، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صلى الله عليه وسلم قَالَ: إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ، وَإِنَّكُمْ تَخْتَصِمُونَ إِلَيَّ، وَلَعَلَّ بَعْضَكُمْ أَنْ يَكُونَ أَلْحَنَ بِحُجَّتِهِ مِنْ بَعْضٍ، فَأَقْضِي نَحْوَ مَا أَسْمَعُ، فَمَنْ قَضَيْتُ لَهُ بِحَقِّ أَخِيهِ شَيْئًا فَلَا يَأْخُذْهُ، فَإِنَّمَا أَقْطَعُ لَهُ قِطْعَةً مِنَ النَّارِ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 7169؛ صحیح مسلم، حدیث نمبر 1713)۔ یعنی، حضرت ام سلمہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں ایک انسان ہوں اور تم اپنے مقدمات

میرے پاس لاتے ہو۔ ہوسکتا ہے کہ تم میں سے کوئی شخص دوسرے شخص کے مقابلہ میں زیادہ اچھے انداز میں اپنا دعویٰ پیش کرے اور میں اپنے سننے کے مطابق اس کے حق میں فیصلہ کردوں۔ تو میں نے جس شخص کو اس کے بھائی کا حق دیا، اس کو میں نے آگ کا ایک ٹکڑا دیا۔

یہ حدیث بتاتی ہے کہ ایک جائداد ہر حال میں اسی کی ہے جو اس کا واقعی حق دار ہے حتیٰ کہ اگر خود پیغمبر کسی وجہ سے غیر حق دار کے لیے اس کا فیصلہ کردیں تب بھی وہ غیر حق دار کی نہیں ہوسکتی۔ پیغمبر کے فیصلہ کے باوجود وہ آخرت میں اس کے لیے آگ کا ٹکڑا ثابت ہوگی۔

موجودہ زمانہ میں ناجائز قبضہ بہت عام ہے۔ موجودہ بگڑے ہوئے نظام نے لوگوں کو موقع دیا ہے کہ وہ رشوت اور دھاندلی کے زور پر اپنی ناجائز خواہشات پوری کرسکیں۔ چنانچہ آج ہر بستی اور ہر شہر میں ایسے لوگ ملیں گے جنھوں نے غلط کارروائی کر کے کسی دوسرے شخص کی زمین یا عمارت پر قبضہ کرلیا ہے۔

ایسے لوگوں کے لیے یہ حدیث بہت زیادہ ڈرانے والی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب رسول خدا کے فیصلہ کے باوجود ایک جائداد کسی غیر حقدار کی نہیں ہوتی تو وہ ان لوگوں کی کیسے ہو جائے گی جو فرضی رجسٹری اور جھوٹے سرکاری کاغذات کی بنیاد پر دوسرے کی جائداد پر قبضہ کر بیٹھ گیے ہوں۔

دنیا میں آدمی غیر کی عمارت پر قابض ہو کر خوش ہوتا ہے۔ آخرت میں اس کا کیا حال ہوگا جب اس پوری عمارت کو آگ کی عمارت بنا کر اس کے اندر اسے بند کردیا جائے۔

والدین کی ذمہ داری

عن ابی هُرَيْرَةَ رضي اللّٰه عنه قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صلى اللّٰه عليه وسلم: مَا مِنْ مَوْلُودٍ إِلَّا يُولَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ، فَأَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهِ، وَيُنَصِّرَانِهِ، أَوْ يُمَجِّسَانِهِ (مسند احمد، حدیث نمبر 7181)۔ یعنی، حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ہر پیدا ہونے والا فطرت (صحیح) پر پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس کے ماں باپ اس کو یہودی بنا دیتے ہیں یا اس کو نصرانی بنا دیتے ہیں یا اس کو مجوسی بنا دیتے ہیں۔

اس کا مطلب صرف مذہبی معنوں میں یہودی اور عیسائی اور مجوسی بنانا نہیں ہے۔ یہ تو بنانے کی آخری صورت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس میں ہر وہ بگاڑ شامل ہے جو والدین کے ذریعہ ان کی اولاد میں پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ دوسری روایتوں میں عمومی الفاظ بھی آئے ہیں۔ مثلاً —

عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صلى اللّٰه عليه وسلم: "كُلُّ مَوْلُودٍ يُولَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ حَتَّى يُعْرِبَ عَنْهُ لِسَانُهُ، فَإِذَا أَعْرَبَ عَنْهُ لِسَانُهُ، إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا (مسند أحمد، حدیث نمبر 14805)۔ یعنی، حضرت جابر بن عبد اللہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ہر پیدا ہونے والا فطرت (صحیح) پر پیدا ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ بولنے لگے۔ پھر جب وہ بولنے لگتا ہے تو وہ شکر گزار یا ناشکر بن جاتا ہے۔

بچے پیدا ہوتے ہی بولنے نہیں لگتے۔ وہ کچھ عرصہ کے بعد بولتے ہیں۔ بولنے سے

پہلے ان کا ربط ان کی پیدائشی فطرت سے ہوتا ہے، بولنے کے بعد ان کا ربط ان کے قریبی ماحول سے ہو جاتا ہے جو کچھ ملے اس پر اللہ کا شکر کرنا ہے یا اس کو کسی اور کا عطیہ سمجھنا ہے، اس کا ابتدائی سبق انھیں اپنے ماں باپ سے ملتا ہے۔ کسی کو چھوٹا دیکھ کر اس کو حقیر سمجھنا یا کسی کو بڑا دیکھ کر جل اٹھنا، یہ بھی پہلی بار ان کو اپنے والدین ہی کے ذریعہ معلوم ہوتا ہے۔ اس طرح والدین یا تو اپنے بچوں کو نیک عمل بناتے ہیں یا ان کو بدعمل بنا دیتے ہیں۔ بچہ کا گھر اس کا سب سے پہلا مدرسہ ہے اور بچہ کے والدین اس کے سب سے پہلے معلم۔

قرآنی طریقہ

موجودہ دنیا میں آدمی امتحان کی حالت میں ہے۔ اور جب وہ امتحان کی حالت میں ہے تو اس کو آزادی بھی دی گئی ہے۔ اب کچھ لوگ آزادی کا صحیح استعمال کرتے ہیں اور کچھ لوگ آزادی کا غلط استعمال کرتے ہیں۔ آزادی کے غلط استعمال ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ دنیا میں فساد ہوتا ہے۔ باہمی مقابلے پیش آتے ہیں۔ ایک دوسرے کے خلاف عداوتیں جاگتی ہیں۔ اجتماعی زندگی میں تلخی اور شکایت کے لمحات پیش آتے ہیں۔ یہ سب عین قانون قدرت کے تحت ہوتا ہے۔ اور جو چیز خود قدرت کے منصوبہ کے تحت پیش آئے اس کو ختم کرنا کسی کے لیے ممکن نہیں۔

اب اس کا حل کیا ہے۔ قرآن میں واضح طور پر اس کا حل بتایا گیا ہے۔ اور وہ یہ کہ لوگ ردعمل کا طریقہ نہ اختیار کریں بلکہ اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے حکمت اور تدبیر کے ساتھ معاملہ کریں:

جہالت کے مقابلہ میں اعراض (الاعراف، 7:199)

عمل سوء کے مقابلہ میں عمل حسن (حم السجدہ،41:34)

ایذا رسانی کے مقابلہ میں صبر (ابراہیم،14:12)

حمیت جاہلیہ کے مقابلہ میں سکینہ (الفتح،48:26)

قرآن کی ان ہدایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب انسان اپنی آزادی کا غلط استعمال کر کے دوسرے شخص کو اذیت پہنچائے تو دوسرے شخص کو جوابی طریقہ نہیں اختیار کرنا ہے بلکہ برداشت کا طریقہ اختیار کرنا ہے۔ اس کو اشتعال انگیزی کے باوجود مشتعل نہیں ہونا ہے۔ اس کو نفرت کے جواب میں محبت کا تحفہ پیش کرنا ہے۔ اگر وہ ایسا کرے تو قدرت کا قانون حرکت میں آئے گا اور وہ زیادہ بہتر طور پر اس کے مسئلہ کو حل کردے گا۔

صبر واعراض انسان کا معاملہ نہیں، وہ حقیقۃً خدا کا معاملہ ہے۔ یہ خود خدا کی مرضی ہے کہ لوگ صبر کریں۔ کیونکہ اس کے بغیر خدا کا منصوبۂ امتحان مکمل نہیں ہوسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا ثواب بہت ہے۔ بلکہ اس کا ثواب تمام دوسرے اعمال سے زیادہ ہے۔ قرآن میں خصوصی طور پر وعدہ کیا گیا ہے کہ جو لوگ اللہ کے لیے صبر کریں ان کو ان کا اجر بے حساب مقدار میں دیا جائے۔

چپ رہیے

قرآن میں ہے کہ کان اور آنکھ اور دل، ہر چیز کے بارے میں انسان سے پوچھ ہوگی (17:36)۔ حدیث میں آیا ہے کہ تم میں جو شخص فتویٰ دینے میں زیادہ جری ہے وہ جہنّم کے اوپر زیادہ جری ہے — أَجْرَؤُكُمْ عَلَى الْفُتْيَا، أَجْرَؤُكُمْ عَلَى النَّارِ (مسند الدارمی، حدیث نمبر 159)۔

اس بنا پر صحابی کرام فتویٰ دینے میں انتہائی احتیاط برتتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود کے متعلق حدیث میں آیا ہے کہ عبداللہ ترازو میں اُحد پہاڑ سے بھی زیادہ وزنی ہیں۔ عَبْدُ اللّٰهِ أَثْقَلُ فِي المِيْزَان من أُحدٍ (الادب المفرد، حدیث نمبر 237)۔ اس کے باوجود ان کا یہ حال تھا کہ وہ کوفہ میں تھے۔ ان سے ایک معاملہ میں پوچھا گیا تو انھوں نے جواب نہیں دیا۔ لوگ ان سے مہینہ بھر پوچھتے رہے۔ یہاں تک کہا کہ اگر آپ ہی فتویٰ نہ دیں تو ہم کس سے پوچھیں (مَنْ نَسْأَلُ إِنْ لَمْ نَسْأَلْكَ وَأَنْتَ مِنْ جِلَّةِ أَصْحَابِ مُحَمَّدٍ صلی اللّٰہ علیہ وسلم بِهَذَا الْبَلَدِ، وَلَا نَجِدُ غَيْرَكَ؟)۔ اس کے بعد انھوں نے انتہائی احتیاط کے ساتھ اس کا جواب دیا (سنن النسائی، حدیث نمبر 3358)۔

حضرت عبداللہ بن عمر ہمیشہ فتویٰ دینے سے پرہیز کرتے تھے۔ لوگ جب زیادہ اصرار کرتے تو کہتے کہ ہماری پیٹھ کو جہنّم کے لیے سواری نہ بناؤ: لَا تَجْعَلُوا أَظْهُورَنَا مَطَايَا إِلَى جَهَنَّمَ (المعرفۃ والتاریخ للفسوی، جلد 1، صفحہ 493)۔

ان روایات میں فتویٰ سے مراد کوئی محدود فتویٰ نہیں ہے۔ اس کا تعلق ان تمام امور سے ہے جو مسلمانوں کو پیش آتے ہیں اور جن میں وہ اپنے علما اور اپنے رہنماؤں سے رائے پوچھتے ہیں۔ ایسے امور میں علما اور رہنماؤں کا فرض ہے کہ وہ بولنے سے زیادہ سوچیں۔ وہ اس وقت تک کوئی بیان نہ دیں جب تک اس معاملہ میں مشورہ اور مطالعہ اور غور وفکر کی تمام شرطوں کو آخری حد تک پورا نہ کر چکے ہوں۔ ایسے امور میں نہ بولنا اس سے بہتر ہے کہ آدمی غیر ذمہ دارانہ طور پر بولنے لگے۔

اجتماعی معاملات میں رائے دینا انتہائی نازک ذمہ داری ہے، کیوں کہ اگر رائے غلط ہو تو لوگوں کو نامعلوم مدت تک اس کا نقصان بھگتنا پڑتا ہے۔ اس لیے آدمی کو چاہیے کہ اگر وہ بولنا چاہتا ہے تو پہلے اس کی تمام شرطوں کو پورا کرے، اس کے بعد اپنی رائے کا اظہار کرے۔

قیامت میں ادائیگی

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم قَالَ : أَتَدْرُونَ مَا الْمُفْلِسُ؟ قَالُوا: الْمُفْلِسُ فِينَا مَنْ لَا دِرْهَمَ لَهُ، وَلَا مَتَاعَ فَقَالَ: إِنَّ الْمُفْلِسَ مِنْ أُمَّتِي يَأْتِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِصَلَاةٍ وَصِيَامٍ وَزَكَاةٍ، وَيَأْتِي قَدْ شَتَمَ هَذَا، وَقَذَفَ هَذَا، وَأَكَلَ مَالَ هَذَا، وَسَفَكَ دَمَ هَذَا، وَضَرَبَ هَذَا فَيُعْطَى هَذَا مِنْ حَسَنَاتِهِ، وَهَذَا مِنْ حَسَنَاتِهِ، فَإِنْ فَنِيَتْ حَسَنَاتُهُ قَبْلَ أَنْ يُقْضَى مَا عَلَيْهِ أُخِذَ مِنْ خَطَايَاهُمْ فَطُرِحَتْ عَلَيْهِ، ثُمَّ طُرِحَ فِي النَّارِ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 2581)۔ حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک بار پوچھا کہ کیا تم جانتے ہو کہ مفلس کون ہے۔ لوگوں نے کہا کہ ہم میں مفلس وہ شخص ہے جس کے پاس نہ درہم ہو اور نہ کوئی سامان۔ آپ نے فرمایا کہ میری امت میں مفلس وہ شخص ہے جو قیامت کے دن نماز اور روزہ اور زکواۃ لے کر آئے۔ اسی کے ساتھ وہ اس حال میں آئے کہ اس نے کسی کو گالی دی ہو، کسی کو الزام لگایا ہو، کسی کا مال کھایا ہو، کسی کا خون بہایا ہو، کسی کو مارا ہو۔ پس اس کی نیکیاں اِس کو اور اس کو دے دی جائیں۔ پھر اگر حساب برابر ہونے سے پہلے ان کی نیکیاں ختم ہو جائیں تو لوگوں کے گناہوں کو لے کر اس کے اوپر ڈال دیا جائے۔ اور پھر اس کو جہنّم میں پھینک دیا جائے۔

یہ حدیث پڑھ کر ان لوگوں کے اوپر کپکپی طاری ہونی چاہیے۔ جو دوسروں کا حق مارتے ہیں۔ کیوں کہ یہ حدیث بتاتی ہے کہ دوسروں کے مال پر مال دار بننے والے قیامت میں بالکل مفلس ہو جائیں گے جو لوگ دوسروں کے گھر پر قبضہ کر کے گھر والے بنے ہوئے ہوں،

وہ آخرت میں اس طرح بے گھر ہو جائیں گے کہ درخت کے پتوں کا سایہ بھی نہ ہوگا جس کے نیچے وہ پناہ لے سکیں۔

دوسری طرف اس حدیث میں ان لوگوں کے لیے خوش خبری ہے جن کا حق مارا گیا ہے۔ اس دنیا میں جو چیز انھیں گالی، الزام تراشی، غصب، تشدد اور جارحیت کے روپ میں مل رہی ہے۔ قیامت کے دن اس کی ادائیگی ایسے قیمتی سکوں کی صورت میں ہوگی جس سے آخرت کی دنیا کی ہر چیز حاصل کی جاسکتی ہے۔ دنیا کے مفلس، اس دن آخرت کے دولت مند کی صورت میں ظاہر ہوں گے۔

قناعت

عبداللہ بن عَمر و بن العاص کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس شخص نے فلاح پائی جو اللہ کے آگے جھک گیا۔ جس کو بقدر ضرورت رزق ملا اور اللہ نے جتنا اس کو دیا اس پر اس نے قناعت اختیار کی:

عن عبدِاللّٰہ بن عمرو بن العاص اَنّ رسولَ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال قَدْ أَفْلَحَ مَنْ أَسْلَمَ، وَرُزِقَ كَفَافًا، وَقَنَّعَهُ اللّٰهُ بِمَا آتَاهُ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 1054)۔ قناعت (contentment) کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی عمل کرنا چھوڑ دے۔ قناعت کا لفظ عمل کا الٹا نہیں ہے بلکہ وہ ہوس کا الٹا ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ پوری طرح ایک فعال زندگی گزارے۔ مگر اسی کے ساتھ وہ زیادہ کی خواہش سے اپنے آپ کو بچائے۔ کیوں کہ زیادہ کی خواہش رکھنے والا آدمی کبھی اس دنیا میں مطمئن نہیں ہوسکتا۔

قناعت کا تعلق عمل سے نہیں ہے بلکہ نتیجۂ عمل سے ہے۔ عمل تو زندگی کا تقاضا ہے۔

ایک زندہ آدمی کبھی عمل سے خالی نہیں ہوسکتا۔ مگر نتیجہ کا تعلق بہت سی خارجی چیزوں سے ہوتا ہے۔ اس لیے آدمی کو چاہیے کہ اپنی حد تک وہ عمل میں کوتاہی نہ کرے، اور نتیجہ کے معاملہ میں اس پر تیار رہے کہ جو بھی ملے گا وہ اس پر راضی ہو جائے گا۔

یہ دنیا کچھ اس طرح بنی ہے کہ یہاں عمل کرنا آدمی کے اپنے اختیار میں ہوتا ہے اور نتیجہ کا نکلنا دوسرے بہت سے عوامل کے اختیار میں۔ اس لیے اس دنیا میں حقیقت پسندانہ رویہ صرف وہی ہے جس کو قناعت کہا جاتا ہے۔ تاہم اس کا مطلب نتیجہ میں قناعت ہے نہ کہ کوشش میں قناعت۔ نتیجہ کے معاملہ میں قانع بن جانا حقیقت پسندی ہے۔ جب کہ عمل کے معاملہ میں قانع بننا خودکشی کے ہم معنی ہے۔

اس معاملہ میں صحیح رویہ کا ایک سادہ معیار ہے۔ وہ یہ کہ ذہنی سکون کو بھنگ کیے بغیر کوشش کو جاری رکھا جائے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنی صلاحیت اور اپنے مواقع کے اعتبار سے بھرپور عمل میں لگا رہے۔ جہاں تک نتیجہ کا تعلق ہے، وہ صرف اس حد تک اس کا طالب بنے جب تک اس کا ذہنی سکون بھنگ نہ ہو۔ جب نتیجہ کی خواہش میں اس کا ذہنی سکون چھننے لگے تو اس کو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ قناعت کے دائرہ سے نکل کر ہوس کے دائرہ میں داخل ہو گیا ہے۔ اور ہوس بہرحال قابل ترک ہے۔

قانع آدمی کے لیے پیسہ برائے ضرورت ہوتا ہے اور غیر قانع آدمی کے لیے پیسہ برائے پیسہ۔ قانع آدمی اس وقت مطمئن ہو جاتا ہے جب کہ اس کو بقدر ضرورت پیسہ مل جائے۔ مگر غیر قانع آدمی کبھی مطمئن نہیں ہوتا۔ کیوں کہ اس کی پیسہ کی طلب کسی بھی حد پر ختم نہیں ہوتی۔ وہ ہمیشہ مزید اضافہ کے ساتھ جاری رہتی ہے۔

اس قناعت کا تعلق صرف پیسہ کے معاملہ سے نہیں ہے بلکہ زندگی کے ہر معاملہ سے

ہے۔ ایک شخص سروس کر رہا ہے۔ ایک شخص لیڈری کے میدان میں ہے۔ ایک شخص حکومت کے عہدہ تک پہنچ گیا ہے۔غرض آدمی جس شعبہ میں بھی ہو، ہر جگہ اس کے لیے ایک طریقہ ملے ہوئے پر قناعت کرنے کا ہے اور دوسرا طریقہ نہ ملے ہوئے کی طرف دوڑنے کا۔

قناعت کا طریقہ یہ ہے کہ حالات اس کو جس درجہ تک پہنچا دیں اس پر راضی ہو کر وہ اپنی ڈیوٹی انجام دینے میں لگ جائے۔ وہ ملی ہوئی حیثیت پر راضی رہے۔ اگر معمول کے مطابق اس کو مزید ترقی ملے تو اس کو وہ خوشی کے ساتھ قبول کر لے، اور اگر مزید ترقی کے مواقع نہ پیدا ہوں تو جہاں اس کو حالات نے پہنچایا ہے اس کو وہ دل کی رضامندی کے ساتھ قبول کر لے۔

پیاس آدمی کی ایک فطری ضرورت ہے۔مگر ایک شخص وہ ہے جو صحت مند پیاسا ہو۔ دوسرا آدمی وہ ہے جو پیاس کی بیماری (عُطاش) میں مبتلا ہو جائے۔صحت مند پیاسا صرف بقدر ضرورت پانی کا طالب ہوتا ہے۔ بقدر ضرورت پانی پینے کے بعد وہ بالکل مطمئن ہو جاتا ہے۔مگر جو شخص پیاس کی بیماری میں مبتلا ہو جائے، وہ ہر وقت پانی کا طالب بنا رہے گا۔ پانی کی کوئی بھی مقدار اس کو مطمئن کرنے والی نہیں۔

قانع آدمی اس دنیا میں صحت مند پیاسے کی مانند ہے، اور غیر قانع آدمی اس دنیا میں بیمار پیاسے کی مانند۔

اختلاف کے باوجود

جس زمانہ میں حضرت علی اور حضرت معاویہ کے درمیان جنگ ہو رہی تھی، قیصر روم (قسطنطنیہ) نے ارادہ کیا کہ وہ مسلم دنیا پر حملہ کر دے۔اس کے ذہن میں آیا کہ اِس وقت مسلمان باہمی لڑائی میں مبتلا ہیں۔ اگر اس وقت میں نے حملہ کر دیا تو میں شام ومصر وغیرہ علاقہ

پر دوبارہ قبضہ کرسکتا ہوں۔ حضرت معاویہ کو اس کی خبر ملی تو انھوں نے فوراً قیصر روم کے نام ایک خط روانہ کیا، اس میں لکھا ہوا تھا: إِذَا عَقَدتَ العَزْمَ عَلَى أَنْ تُحَقِّقَ إِرَادَتَكَ فَإِنَّنِي أُقْسِمُ أَنْ أَتَصَالَحَ مَعَ صَاحِبِي ثُمَّ لَأُشَيِّرَنَّ ضِدَّكَ جَيْشاً سَأَكُونُ ضِمْنَ أَوَّلِ كَتِيبَةٍ فِيهِ وَسَأَجْعَلَنَّ مِنَ القُسْطَنْطِينِيَّةِ شُعْلَةَ نَارٍ (البدایۃ والنہایۃ لابن کثیر، جلد 11، صفحہ 400)۔ یعنی، اگر تم نے یہ عزم کیا کہ تم اپنے ارادہ کو پورا کرو تو میں قسم کھاتا ہوں کہ میں علی سے صلح کر لوں گا۔ پھر میں تمہارے خلاف ایک لشکر روانہ کروں گا جس کے پہلے دستہ میں میں خود شامل ہوں گا اور پھر میں قسطنطنیہ کو آگ بنا دوں گا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ حضرت معاویہ کے اس خط کے بعد قیصر روم نے اپنا حوصلہ کھو دیا۔ اس نے فوجوں کی تیاری روک دی۔ اس نے سمجھ لیا کہ اب مسلمانوں سے جنگ چھیڑنا اپنی مزید بربادی کو دعوت دینا ہے۔

یہ زندہ لوگوں کا طریقہ ہے۔ ان کے اندر آپس میں اختلافات پیدا ہوتے ہیں۔ مگر جب معاملہ وسیع تر مفاد کا آجائے تو وہ اپنے اختلاف کو ختم کر کے ایک ہو جاتے ہیں۔ ان کے اختلاف کی ایک حد ہوتی ہے۔ حد کے آجانے کے بعد ان کا اختلاف باقی نہیں رہتا۔

زندہ انسان دوستی کے باوجود کسی کی بے جا حمایت نہیں کرتا۔ وہ دشمنی کے باوجود کوئی چھوٹی حرکت نہیں کرتا۔ وہ انفرادی جھگڑے کے باوجود اجتماعی امور میں متحد ہو جاتا ہے۔ وہ شخصی کدورت کے باوجود اسلامی تعلق میں فرق نہیں آنے دیتا۔ زندہ انسان کسی سے نزاع پیش آنے کے باوجود اس کی خصوصیات کا اعتراف کرتا ہے۔ وہ رنجش پیدا ہونے کے باوجود امانتوں کو ادا کرتا ہے۔ زندہ انسان کسی حال میں پست حرکت نہیں کرتا، وہ کسی حال میں اپنی انسانیت کو نہیں کھوتا۔ زندہ انسان دشمن ہوسکتا ہے مگر وہ کمینہ نہیں ہوسکتا۔ زندہ انسان شاکی ہو سکتا ہے مگر یہ ممکن نہیں جس سے اس کو شکایت ہو اس کے خلاف وہ جھوٹا الزام لگانے لگے۔

دعا اور اعتراف

تاریخ اسلام کا ایک واقعہ وہ ہے جس کو مواخاۃ کہا جاتا ہے۔ مکہ کے مسلمان جب مہاجر کی حیثیت سے مدینہ آئے تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم لوگ دو دو شخص اللہ کی راہ میں بھائی بھائی بن جاؤ — تآخَوْا فِي اللّٰهِ أَخَوَيْن أَخَوَيْن (سیرت ابن ہشام، جلد 2، صفحہ 109)۔ اس ہدایت کے مطابق ہر انصاری نے ایک مہاجر کو اپنا بھائی بنالیا۔ انصار نے اپنے تمام اثاثہ کو تقسیم کر کے آدھا خود لیا اور آدھا اپنے مہاجر بھائی کو دیدیا۔ اس مواخاۃ کی تفصیل سیرت کی کتابوں میں موجود ہے۔ اس معاملہ میں انصار نے یک طرفہ طور پر جس کمالِ ایثار کا ثبوت دیا اس کی کوئی دوسری مثال پوری معلوم تاریخ میں نہیں ملتی۔ انصار کے اعلیٰ سلوک سے خود مہاجرین بے حد متاثر تھے:

عَنْ أَنَسٍ قَالَ: قَالَ الْمُهَاجِرُونَ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ، مَا رَأَيْنَا مِثْلَ قَوْمٍ قَدِمْنَا عَلَيْهِمْ أَحْسَنَ مُوَاسَاةً فِي قَلِيلٍ، وَلَا أَحْسَنَ بَذْلًا فِي كَثِيرٍ، لَقَدْ كَفَوْنَا الْمَؤُنَةَ، وَأَشْرَكُونَا فِي الْمَهْنَأِ، حَتَّى لَقَدْ حَسِبْنَا أَنْ يَذْهَبُوا بِالْأَجْرِ كُلِّهِ. قَالَ: "لَا، مَا أَثْنَيْتُمْ عَلَيْهِمْ، وَدَعَوْتُمُ اللّٰهَ لَهُمْ" (مسند احمد، حدیث نمبر 13075)۔ حضرت انس روایت کرتے ہیں کہ مہاجرین نے کہا کہ اے خدا کے رسول، جس قوم کے یہاں ہم آئے ہیں، ان سے بہتر قوم ہم نے نہیں دیکھی۔ وہ کم میں بہترین ہمدردی کرنے والے ہیں اور زیادہ میں بہترین خرچ کرنے والے ہیں۔ وہ محنت میں ہماری طرف سے کافی ہو گئے اور پیداوار میں ہم کو شریک کرلیا۔ حتی کہ ہم کو ڈر رہے کہ اجر انھیں کو نہ مل جائے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہیں، جب تک تم ان کی تعریف کرو اور اللہ سے ان کے لیے دعا کرتے رہو۔

اس حدیث سے نہایت اہم اسلامی اصول معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ زید کو بکر سے کچھ ملے مگر زید کے پاس کوئی مادی چیز لوٹانے کے لیے نہ ہوتو وہ کیا کرے۔ ایسی حالت میں زید کو چاہیے کہ وہ بکر کے عطیہ کا کھلے دل سے اعتراف کرے۔ اعتراف کا یہ احساس اتنا زیادہ گہرا ہو کہ زید کے دل سے بکر کے لیے دعائیں نکلنے لگیں — مال والے کے پاس دینے کے لیے اگر مال ہے، تو بے مال والے کے پاس بھی دینے کے لیے ایک چیز موجود ہے، اور وہ دعا اور اعتراف ہے۔ اور بلاشبہ دعا اور اعتراف کی اہمیت کسی مادی عطیہ سے کم نہیں۔

خیر کثیر

عبد اللہ بن عباس رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے چچا کے لڑکے تھے۔ نوجوانی کی عمر میں ایک بار وہ اونٹ پر رسول اللہؐ کے پیچھے بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ نے ان کو ایک لمبی نصیحت فرمائی۔ اس حدیث کا ایک حصہ یہ ہے: اعْلَمْ أَنَّ فِي الصَّبْرِ عَلَى مَا تَكْرَهُ خَيْرًا كَثِيرًا، وَأَنَّ النَّصْرَ مَعَ الصَّبْرِ، وَأَنَّ الْفَرَجَ مَعَ الْكَرْبِ، وَأَنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا (مسند أحمد، حدیث نمبر 2803) ۔یعنی، جان لو کہ ناپسندیدہ بات پر صبر کرنے میں بہت زیادہ بھلائی ہے۔ اور صبر کے ساتھ اللہ کی مدد آتی ہے۔ اور تکلیف کے ساتھ کشادگی ہے اور مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔

یہ پیغمبرانہ الفاظ زندگی میں کامیابی کی حقیقت کو بتا رہے ہیں۔ ایسی حقیقت جس کا تعلق ذاتی زندگی سے بھی ہے اور قومی اور اجتماعی زندگی سے بھی۔

آپ کو ایک گھر یا ایک دکان یا ایک آفس چلانا ہے تو لازماً اس میں ایسی چیزیں سامنے آئیں گی جو آپ کو پسند نہ ہوں گی۔ ان ناپسندیدہ چیزوں پر اگر آپ بھڑک اٹھیں یا بے برداشت ہو جائیں تو آپ کبھی گھر یا دکان یا آفس کو چلانے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ لیکن

اگر آپ وقتی ناپسندیدگی کو برداشت کرلیں اور جذباتی ہیجان سے ہٹ کر عقلی فیصلہ کے تحت کام کریں تو یقینا آپ اپنے مستقبل کو کامیابی کی طرف لے جائیں گے۔

یہی معاملہ قومی اوراجتماعی زندگی کا بھی ہے۔قومی زندگی میں بھی دوسروں کی طرف سے ناخوشگوار باتیں پیش آتی ہیں۔اشتعال انگیز الفاظ کان میں پڑتے ہیں۔ان مواقع پر دوبارہ صبر ہی کامیابی کا واحد راستہ ہے۔اگرایک گروہ کے لوگ دوسرے گروہ کی ناخوش گوار باتوں کو نظر انداز نہ کریں، اور ہر ناپسندیدہ بات پیش آنے پر دوسرے گروہ سے لڑنے کے لیے کھڑے ہوجائیں تو ایسے بے برداشت لوگ ہمیشہ ناکام اور برباد رہیں گے۔پیغمبر کی نصیحت کے مطابق، کامیابی کا طریقہ یہ ہے کہ ایسے مواقع پر اپنے منفی جذبات کو قابو میں رکھا جائے۔ دوسروں کے خلاف اٹھنے کے بجائے اپنے آپ کو دبایا جائے۔ یہ صابرانہ طریقہ تنگی کے بعد کشادگی لائے گا، وہ مشکل کو بالآخر آسانی میں تبدیل کرنے کا سبب بن جائے گا۔

صبر کی عبادت

نماز کا وقت ہو اور مسجد سے اذان کی آواز آئے تو ایک مسلمان خوش ہوتا ہے کہ اس کے لیے وقت آ گیا کہ وہ نماز ادا کرے اور عبادت کا ثواب حاصل کرے۔اسی طرح جب رمضان کا نیا چاند آسمان پر نظر آتا ہے تو مسلمان خوش ہوتے ہیں کہ رمضان کے مہینہ کی آمد نے ان کو موقع دیا کہ وہ روزہ رکھ کر اپنے آپ کو اس کے ثواب کا مستحق بنائیں۔

اسی طرح ایک اور عظیم عبادت ہے جس کو شریعت میں صبر کہا گیا ہے۔قرآن میں ہے کہ صبر کرنے والوں کو بے حساب اجر دیا جائے گا۔(39:10)۔حدیث میں ہے کہ صبر سے زیادہ بہتر عطیہ کبھی کسی کو نہیں دیا گیا: لَنْ تُعْطَوْا عَطَاءً خَيْرًا وَأَوْسَعَ مِنَ الصَّبْرِ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 6470)۔صبر ایک عبادت ہے، بلکہ تمام عبادتوں میں سب سے بڑی عبادت۔

عصر کی نماز کا ثواب بہت زیادہ ہے، مگر آپ عصر کی نماز دوپہر کے وقت نہیں پڑھ سکتے۔ اسی طرح رمضان کے روزہ کے لیے غیر معمولی ثواب کی خوش خبری دی گئی ہے۔ مگر یہ ثواب محرم کے مہینہ میں روزہ رکھ کر حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ یہی معاملہ صبر کی عبادت کا بھی ہے۔ صبر کی عبادت صبر کے حالات میں انجام دی جا سکتی ہے، غیر صابرانہ حالات میں صبر کی عبادت کی انجام دہی ممکن نہیں۔

صبر کا موقع کب پیش آتا ہے۔ صبر کا موقع اس وقت پیش آتا ہے جبکہ آپ کے ساتھ اشتعال انگیزی کی جائے۔ آپ کے ساتھ برابرتاؤ کیا جائے۔ جب کوئی شخص ایسی بات کہے جس سے آپ کی انا پر چوٹ لگتی ہو۔ صبر پر عمل کرنے کا موقع ہمیشہ مخالفانہ حالات میں ہوتا ہے نہ کہ موافقانہ حالات میں۔

صبر کے حالات پیش آنے پر اکثر لوگ بھڑک اٹھتے ہیں۔ وہ منفی نفسیات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ اگر وہ شعوری طور پر جانیں کہ یہ تو ان کے لیے صبر کی عبادت کا موقع ہے تو وہ صبر کے وقت کا اسی طرح استقبال کریں جس طرح وہ نماز اور روزہ کے وقت کا استقبال کرتے ہیں۔

صبر کا موقع عبادت کا موقع ہے۔ ایسا موقع پیش آنے پر آدمی کو یقین کرنا چاہئے کہ وہ وقت آ گیا جب کہ عبادتِ عظیم کا ثبوت دے کر وہ ثوابِ عظیم کا مستحق بن جائے۔

برا گمان

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيراً مِنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ (49:12)۔ اے ایمان والو، بہت سے گمان سے بچو بیشک بعض گمان گناہ ہیں۔

گمان (ظن) بڑی تقسیم میں دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک حسن ظن جو جائز ہے اور

دوسرا سوءِ ظن جو حرام: إِنَّ الظَّنَّ عَلَى أَقْسَامٍ، مِنْهَا مَا يَجِبُ اتِّبَاعُهُ، وَهُوَ حُسْنُ الظَّنِّ، وَمِنْهَا مَا يَحْرُمُ اتِّبَاعُهُ، كَسُوءِ الظَّنِّ (التفسیر المظہری، جلد 9، صفحہ 54)۔ مفسر طبری نے اِنّ بعضَ الظنِّ اثم" کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مومن کو اس سے منع فرمایا کہ وہ دوسرے مومن کے حق میں برا گمان کرے: نَهَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنَ أَنْ يَظُنَّ بِالْمُؤْمِنِ شَرًّا (تفسیر الطبری جامع البیان، جلد 22، صفحہ 304)۔

ایک ہے عین واقعہ یا عین مشاہدہ کی بنیاد پر رائے قائم کرنا۔ اور ایک ہے قیاس اور استنباط کی بنیاد پر رائے قائم کرنا۔ اس معاملہ میں شریعت کا اصول یہ ہے کہ اگر کسی کے بارے میں بری رائے قائم کرنے کا معاملہ ہوتو ایسی رائے صرف عین واقعہ یا عین مشاہدہ کی بنیاد پر قائم کی جاسکتی ہے۔ البتہ اگر اچھی رائے قائم کرنے کا معاملہ ہوتو دونوں طریقوں کی بنیاد پر رائے قائم کرنا جائز ہوگا۔ حدیث میں یہاں تک ارشاد ہوا ہے: إِذَا ظَنَنْتَ فَلَا تُحَقِّقْ (آمالی المحاملی، حدیث نمبر 343)۔ یعنی، اگر کسی شخص کے بارے میں تمہیں کوئی برا گمان ہو جائے تو اس کی تحقیق میں نہ پڑو، بلکہ اس کو اپنے ذہن سے نکال دو۔

روایات میں آتا ہے کہ ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن مسعود سے ولید بن عقبہ کا ذکر کیا اور کہا کہ اس شخص کی داڑھی سے شراب ٹپکتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا: ہم کو تجسس سے روک دیا گیا ہے۔ البتہ اگر کوئی چیز بالکل ظاہر ہوجائے گی تو ہم اس پر مواخذہ کریں گے — قِيلَ هَذَا فُلَانٌ تَقْطُرُ لِحْيَتُهُ خَمْرًا، فَقَالَ عَبْدُ اللّٰهِ: إِنَّا قَدْ نُهِينَا عَنِ التَّجَسُّسِ وَلَكِنْ إِنْ يَظْهَرْ لَنَا شَيْءٌ نَأْخُذْ بِهِ (سنن ابوداؤد، حدیث نمبر 4890)۔

حضرت عمر فاروق نے فرمایا: تمہارے مومن بھائی کی زبان سے کوئی بات نکلے تو تم ہرگز

اس کو برے معنی میں نہ لو جب کہ تم اس کو اچھے معنی میں بھی لے سکتے ہو: لا تَظُنَّنَّ بِكَلِمَةٍ خَرَجَتْ مِنْ مُسْلِمٍ شَرًّا وَأَنْتَ تَجِدُ لَهَا فِي الْخَيْرِ مَحْمَلا (روضۃ العقلاء لابن حبان، صفحہ 90)۔

دفع احسن

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ (41:34)۔ یعنی، اور بھلائی اور برائی دونوں برابر نہیں۔ تم جواب میں وہ کہو جو اس سے بہتر ہو۔ پھر تم دیکھو گے کہ تم میں اور جس میں دشمنی تھی وہ ایسا ہو گیا جیسے کوئی دوست قرابت والا۔

ایک شخص آپ کے ساتھ دشمنی کا معاملہ کرے اور آپ اس پر بھڑک کر اس کی مذمت کرنے لگیں تو اس کے اندر ضد پیدا ہو گی۔ اس کی دشمنی اور بڑھ جائے گی۔ آپ کا ایسا ردعمل آگ پر تیل ڈالنے کے ہم معنی ہو گا۔ جس دشمنی کی ابتدائی صورت آپ کے لیے ناخوشگوار ثابت ہوئی تھی، اب آپ کو اس دشمنی کی انتہائی صورت کا تلخ تر تجربہ برداشت کرنا پڑے گا۔

اس کے برعکس اگر آپ ایسا کریں کہ جس آدمی نے آپ کے ساتھ دشمنی والا سلوک کیا ہے، اس کے ساتھ آپ اعراض برتیں۔ یا اس کے ساتھ نرمی اور حسن سلوک کا معاملہ کریں تو یہ آگ پر پانی ڈالنے کے ہم معنی ہو گا۔ آپ کا ایسا رویہ دشمن کو نفسیاتی شکست میں مبتلا کر دے گا۔ اس کے بعد اس کا ضمیر جاگ اٹھے گا۔ وہ اندرونی طور پر شرمندگی کے احساس میں مبتلا ہو جائے گا۔ وہ مزید دشمنی کرنے کے بجائے دشمنی کی تلافی کی بات سوچنے لگے گا۔

اشتعال کے جواب میں مشتعل ہونا یا منفی ردعمل کا طریقہ اختیار کرنا دل کی بھڑاس

نکالنے کا ذریعہ ہوسکتا ہے۔ مگر وہ کوئی مفید نتیجہ برآمد کرنے والا نہیں۔ یہ نادان آدمی کا کام ہے کہ وہ کوئی خلاف مزاج بات دیکھے تو فوراً بھڑک اٹھے۔ عقل مند وہ ہے جو اقدام سے پہلے نتیجہ کی بات سوچے۔ جو آخری نتیجہ کو سامنے رکھ کر اپنے عمل کا نقشہ بنائے نہ کہ محض وقتی جذبہ کے تحت کارروائی کرنے لگے۔

ہر آدمی اصلاً فطرت کا ایک ظاہرہ ہے۔ ہر ایک آپ ہی کی طرح کا ایک انسان ہے۔ بظاہر کوئی شخص آپ کا دشمن ہو تب بھی اس کو ایک انسان سمجھئے۔ اس کی برائی کو نظر انداز کرکے اس کے ساتھ اچھا سلوک کیجئے۔ اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ وہ آپ کا قریبی دوست بن گیا۔

صبر کی اہمیت

قرآن میں صبر کی غیر معمولی عظمت بیان ہوئی ہے۔ صبر کو اولوالعزم پیغمبروں کا طریقہ بتایا گیا ہے (الاحقاف، 46:35) صبر پر اعلیٰ ترین کامیابیوں کی بشارت ہے (7:137) صبر قیادت عالم کا زینہ ہے (السجدہ، 32:24) صبر حفاظت کا یقینی ذریعہ ہے (یوسف، 12:90) حتیٰ کہ صبر وہ چیز ہے جو آدمی کو بے حساب اجر کا مستحق بناتا ہے (39:10)۔

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی شخص کو صبر سے بہتر اور صبر سے بڑا عطیہ نہیں دیا گیا: وَمَا أَعْطَى اللّٰهُ أَحَدًا مِنْ عَطَاءٍ أَوْسَعَ مِنَ الصَّبْرِ (سنن ابو داؤد، حدیث نمبر 1644)۔ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ ہم نے اپنی زندگی کا سب سے بہتر صبر کے ذریعہ پایا: وَجَدْنَا خَيْرَ عَيْشِنَا بِالصَّبْرِ (الزہد والرقائق لابن المبارک: 997)۔ ابن حجر العسقلانی نے صبر کی حدیث کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ صبر تمام اچھے اخلاق کا جامع ہے (فالصبر جامع المکارم الاخلاق) فتح الباری 11/309-311)۔

صبر نہ بزدلی ہے اور نہ وہ بے عملی ہے۔ صبر ایک مثبت قدر ہے۔ صبر بلند ترین ذہنی حالت ہے۔ صبر سب سے بڑا عمل ہے۔ صبر انسانیت کا تکمیلی درجہ ہے۔

آپ سڑک کے کنارے کھڑے ہوئے ہیں، کچھ لوگ آتے ہیں اور آپ کے خلاف اشتعال انگیز نعرہ لگا دیتے ہیں۔ اب آپ کے لیے ردعمل کے دو مختلف طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ آپ نعرہ کو سن کر بھڑک اٹھیں۔ آنے والوں کے ساتھ جھگڑنے لگیں۔ یہ بے صبر کا طریقہ ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اشتعال انگیز نعرہ کو سنیں مگر آپ اس پر مشتعل نہ ہوں، آپ کا ذہن بدستور اعتدال کی حالت پر باقی رہے۔ آپ اپنے جذبات کو تھام کر یہ سوچیں کہ ایسے موقع پر آپ کو کیا کرنا چاہیے۔ یہ دوسرا طریقہ صبر کا طریقہ ہے۔

بے صبری بھی عمل ہے، اور صبر بھی عمل ہے۔ دونوں میں سے کوئی بھی بے عملی نہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ بے صبر آدمی فوری جذبات کے تحت اقدام کر بیٹھتا ہے، خواہ اس کا نتیجہ کچھ بھی نکلے۔ اس کے برعکس، صبر والا آدمی سوچ سمجھ کر اور مشورہ کر کے اپنے اقدام کا فیصلہ کرتا ہے۔

بے صبری کی روش تباہی کی طرف لے جاتی ہے اور صبر کی روش کامیابی کی طرف۔

تکبیر، تواضع

اللہ کے مقابلہ میں کَبِّرْہ کا حکم ہے اور انسان کے مقابلہ میں تواضعوا کا۔ یعنی اللہ کے مقابلہ میں یہ مطلوب ہے کہ اس کو اپنا کبیر بنایا جائے۔ اور انسان کے مقابلہ میں یہ مطلوب ہے کہ لوگ ایک دوسرے کے مقابلہ میں تواضع کا رویہ اختیار کریں۔ یہی تکبیر اور تواضع دو لفظ میں پورے دین کا خلاصہ ہے۔

قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ تم اللہ ہی کی خوب بڑائی بیان کرو: وَكَبِّرْهُ تَكْبِيرًا (17:111)۔ دوسری جگہ فرمایا کہ تم صرف اپنے رب کی بڑائی کرو: وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ (74:3)۔

اللہ کی معرفت کے بعد آدمی کے دل میں اپنے خالق و مالک کے لیے جو سب سے بڑا جذبہ پیدا ہوتا ہے وہ یہی ہے۔ اس کو ساری عظمت صرف ایک اللہ کی طرف دکھائی دینے لگتی ہے۔ وہ اس کے آگے جھک جاتا ہے۔ اللہ کو کبیر کی حیثیت سے دریافت کرنا اس کے اندر یہ شعور پیدا کرتا ہے کہ وہ اور دوسرے تمام انسان اللہ کے مقابلہ میں صرف صغیر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہی وہ احساس ہے جو ایک مومن کی زندگی میں عبادت، تقویٰ، خشوع، تضرع اور انابت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

امام مسلم نے اپنی صحیح میں حضرت عیاض بن حِمار کی یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ اللہ نے میری طرف یہ وحی کی ہے کہ تم لوگ تواضع اختیار کرو، یہاں تک کہ کوئی کسی کے اوپر فخر نہ کرے، کوئی کسی کے اوپر زیادتی نہ کرے: إِنَّ اللّٰهَ أَوْحَى إِلَيَّ أَنْ تَوَاضَعُوا، حَتَّى لَا يَفْخَرَ أَحَدٌ عَلَى أَحَدٍ، وَلَا يَبْغِيَ أَحَدٌ عَلَى أَحَدٍ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 2865)۔

یہ حدیث بتاتی ہے کہ ایک انسان کو دوسرے انسان کے مقابلہ میں کیسا ہونا چاہیے۔ اس کو چاہیے کہ وہ دسرے انسانوں کے مقابلہ میں متواضع بن جائے۔ زیادہ والا کم والے پر فخر نہ کرے۔ طاقتور آدمی کمزور آدمیوں کے اوپر زیادتی نہ کرے۔

ایمان آدمی کے اندر جو شعور اور جو کیفیت پیدا کرتا ہے، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اللہ کو اپنا کبیر بنا کر اس کے مقابلہ میں اپنے کو صغیر بنا لیتا ہے۔ پھر یہی شعور اس کے اندر یہ مزاج پیدا کرتا ہے کہ وہ تمام انسانوں کو قابلِ احترام سمجھے، وہ اُن کے ساتھ تواضع کا رویہ اختیار کرے نہ کہ سرکشی اور تحقیر کا۔

جنت میں مکان

أَنَا زَعِيمٌ بِبَيْتٍ فِي رَبَضِ الْجَنَّةِ لِمَنْ تَرَكَ الْمِرَاءَ وَإِنْ كَانَ مُحِقًّا، وَبِبَيْتٍ فِي وَسَطِ الْجَنَّةِ لِمَنْ تَرَكَ الْكَذِبَ وَإِنْ كَانَ مَازِحًا وَبِبَيْتٍ فِي أَعْلَى الْجَنَّةِ لِمَنْ حَسَّنَ خُلُقَهُ (سنن ابوداؤد، حدیث نمبر 4800)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جنت کے کنارے ایک گھر کی ذمہ داری لیتا ہوں اس شخص کے لیے جو جھگڑے کو چھوڑ دے خواہ وہ حق پر ہو۔ اور جنت کے بیچ میں ایک گھر کی اس شخص کے لیے جو جھوٹ کو ترک کر دے خواہ وہ مذاق کر رہا ہو۔ اور جنت کے اعلیٰ درجہ میں ایک گھر اس شخص کے لیے جس کا اخلاق اچھا ہو۔

دو آدمی میں جھگڑا ہو تو دیکھنے کا ایک پہلو یہ ہے کہ کون حق پر ہے اور کون ناحق پر۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ اگر دونوں اپنے موقف پر اڑے رہیں تو جھگڑا بڑھتا ہے۔ جان ومال کی تباہی پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے اللہ سے ڈرنے والے کو یک طرفہ طور پر جھگڑے سے الگ ہو جانا چاہئے۔ ایسا کرنے کے لیے اپنے نفس کو کچلنا ہوتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا بہت بڑا اجر ہے۔

ہنسی مذاق کے وقت اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی سنجیدگی کو بھول جاتا ہے اور جھوٹ بولنے میں کوئی ہرج نہیں سمجھتا۔ مگر جنتی انسان وہ ہے جو سچ اور جھوٹ کے معاملہ میں اتنا حساس ہو کہ غفلت کے اوقات میں بھی اس کی زبان جھوٹ بولنے سے بچی رہے۔

حسن اخلاق دراصل حسن ایمان کا نتیجہ ہے۔ جس شخص کا ایمان اس کو خدا سے ڈرنے والا بنا دے وہ بندوں کے معاملہ میں اس کو بے حد محتاط بنا دیتا ہے۔ اس کی زبان کسی کی بے آبروئی کے لیے نہیں کھلتی۔ اس کا ہاتھ کسی کو تکلیف دینے کے لیے نہیں اٹھتا۔ اس کے پاؤں کسی کی بدخواہی کے لیے نہیں چلتے۔ یہی حسن اخلاق ہے اور یہ حسن اخلاق جس کے اندر پیدا

ہو جائے وہ یقیناً جنت میں اعلیٰ مقام پاتا ہے۔ اعلیٰ اخلاق سے آدمی کو اعلیٰ جنت اسی طرح ملتی ہے جس طرح اعلیٰ بیج سے اعلیٰ پھل والا درخت۔

سکون کا راز

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم: انْظُرُوا إِلَى مَنْ أَسْفَلَ مِنْكُمْ، وَلَا تَنْظُرُوا إِلَى مَنْ هُوَ فَوْقَكُمْ، فَهُوَ أَجْدَرُ أَنْ لَا تَزْدَرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 2963)۔ حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تم اس کو دیکھو جو تمہارے نیچے ہے اور اس کو نہ دیکھو جو تمہارے اوپر ہے۔ کیوں کہ اس رویہ سے اس بات کی زیادہ توقع ہے کہ تم اپنے اوپر خدا کی نعمتوں کو حقیر نہ سمجھو۔

یہ زندگی کا ایک نہایت قیمتی اصول ہے۔ موجودہ دنیا میں خود فطرت کے نظام کے تحت ایسا ہے کہ کسی کے پاس کم سامان ہوتا ہے اور کسی کے پاس زیادہ سامان۔ فرق کی یہ صورت حال کبھی ختم ہونے والی نہیں۔ ایسی حالت میں پر سکون زندگی حاصل کرنے کا راز صرف ایک ہے۔ وہ یہ کہ آدمی اپنے اور دوسروں کے درمیان غلط تقابل نہ کرے۔

اگر وہ اپنے سے اوپر والوں کو دیکھے گا تو اس کے اندر حسد اور بے چینی پیدا ہوگی۔ وہ سکونِ قلب سے محروم ہو جائے گا۔ اس کے برعکس اگر وہ اپنے سے نیچے والوں کو دیکھے تو اس کے اندر شکر کا جذبہ پیدا ہوگا اور اسی کے ساتھ اس کو روحانی سکون بھی حاصل ہوگا۔ اس کا دن چین کے ساتھ گزرے گا اور رات کے وقت اس کو اچھی نیند کی نعمت حاصل ہوگی۔

اس بات کو مشہور انگریز افسانہ نگار شیکسپیر (1565-1616) نے اپنے لفظوں میں اس طرح کہا ہے کہ یہ دراصل تقابل ہے جس کی وجہ سے لوگ پریشان رہتے ہیں:

It is by comparison that you suffer.

ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان فرق کا یہ نظام خود فطرت کا بنایا ہوا ہے۔ اس میں گہری مصلحت ہے۔ اس کی وجہ سے لوگوں کے درمیان چیلنج کی صورت حال قائم رہتی ہے۔ یہی چیلنج تمام ترقیوں کا زینہ ہے۔ انسانی سماج میں اگر چیلنج ختم ہو جائے تو اس کی ترقیاتی سرگرمیاں بھی ختم ہو جائیں گی۔ آدمی کو چاہیے کہ جب وہ اپنے سے کم والے کو دیکھے تو شکر ادا کرے۔ اور جب اپنے سے اوپر والے کو دیکھے تو مسابقت کے جذبہ کے تحت آگے بڑھنے کی کوشش کرے۔

ان شاء اللہ

اسلام کی تعلیمات میں سے ایک تعلیم یہ ہے کہ آدمی جب کسی کام کے بارے میں اپنے ارادہ کا اظہار کرے تو اس کے ساتھ ان شاء اللہ (اگر اللہ نے چاہا) بھی ضرور کہے۔ مثلاً ایک شخص دہلی سے بمبئی جانے کا ارادہ کرتا ہے تو وہ اس طرح نہ کہے کہ کل میں بمبئی جاؤں گا، بلکہ یوں کہے کہ: ان شاء اللہ کل میں بمبئی جاؤں گا۔

یہ کلمہ گویا اس حقیقت واقعہ کا اعتراف ہے کہ میری چاہ صرف اس وقت پوری ہوگی جب کہ اللہ کی چاہ بھی اس میں شامل ہو جائے۔ یہ اپنے چاہنے میں اللہ کے چاہنے کو ملانا ہے، اپنے ارادے کے ساتھ اللہ کے ارادے کو شامل کرنا ہے۔

اصل یہ ہے کہ انسان ارادہ کرتا ہے اور اس کے مطابق کوشش کرتا ہے۔ مگر کسی کوشش کی تکمیل صرف اس وقت ممکن ہوتی ہے جب کہ اس کے ساتھ اللہ کی رضامندی بھی شامل ہو جائے۔ اسی کو عربی میں اس طرح کہا گیا ہے کہ کوشش میری طرف سے ہے اور اس کی تکمیل اللہ کی طرف سے (السَّعْيُ مِنِّي وَالإِتْمَامُ مِنَ اللّٰهِ)۔ اس اعتبار سے خدا اور

بندے کا معاملہ گویا دندانہ دار پہیہ (cog wheel) کا معاملہ ہے۔ ایک پہیہ خدا کا ہے اور دوسرا پہیہ انسان کا۔ جب دونوں کے دندانے ایک دوسرے میں مل جاتے ہیں، اس کے بعد زندگی کی مشین چل پڑتی ہے۔ انسان اگر ایسا کرے کہ خدا کے پہیہ سے الگ ہو کر اپنا پہیہ چلانا چاہے تو بظاہر حرکت کے باوجود وہ بے فائدہ ہوگا۔ کیوں کہ پوری مشین کے چلنے کے لیے ضروری تھا کہ خدا کے پہیہ کا دندانہ بھی انسان کے پہیہ کے ساتھ شامل ہو۔

ان شاء اللہ کا کلمہ، باعتبار حقیقت، ایک دعا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے کام کا آغاز کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے درخواست کرتا ہے کہ وہ انسان کے کاگ میں اپنا کاگ ملا دے تاکہ زندگی کی مشین چل پڑے اور اپنے مطلوبہ انجام تک پہونچے۔ ان شاء اللہ کہنا گویا زندگی کے سفر میں مالک کائنات کو اپنے ساتھ لینا ہے۔ اور جس آدمی کا یہ حال ہو کہ خود مالک کائنات اس کا ہم سفر ہو جائے اس کی منزل تک پہونچنے سے کون روک سکتا ہے۔

تنگی میں آسانی

فتح مکہ کا واقعہ 8ھ میں پیش آیا۔ اس کے بعد آپ نے صحابہ کرام کے ساتھ مکہ سے طائف کا سفر فرمایا۔ اس سفر میں جو واقعات پیش آئے، ان میں سے ایک واقعہ یہ تھا: قَالَ ابْنُ إِسْحَاقَ: ثُمَّ سَلَكَ فِي طَرِيقٍ يُقَالُ لَهَا: الضَّيِّقَةُ. فَلَمَّا تَوَجَّهَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَأَلَ عَنْ اسْمِهَا، فَقَالَ: ”مَا اسْمُ هٰذِهِ الطَّرِيقِ؟“ فَقِيلَ: الضَّيْقَةُ. فَقَالَ: ”بَلْ هِيَ الْيُسْرَى“ (سیرت ابن ہشام، جلد 2، صفحہ 482)۔ پھر آپ ایک راستہ میں

چلے جس کو تنگ راستہ کہا جاتا تھا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی طرف متوجہ ہوئے تو آپ نے اس کا نام پوچھا۔ کہا گیا کہ اس کا نام تنگ راستہ ہے۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں، یہ آسان راستہ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ وہ تنگ ہے مگر بند تو نہیں۔ بظاہر اگر چہ یہ راستہ تنگ دکھائی دے رہا ہے۔لیکن اگر ہمت اور احتیاط سے کام لیں تو یقینا ہم اس سے گزر سکتے ہیں۔ پھر تنگی کے باوجود اگر وہ ہمارے لیے رکاوٹ نہیں تو ہم اس کو تنگ کیوں کہیں۔ کیوں نہ ہم اس کو آسان کہیں۔ کیوں کہ اصل مقصد گزرنا ہے اور وہ اب بھی ہمیں حاصل ہے۔

یہ واقعہ اس طرح کے معاملات میں مومن کے مزاج کو بتاتا ہے۔ مومن چیزوں کو ان کے ظاہر کے اعتبار سے نہیں دیکھتا بلکہ چیزوں کو ان کے باطن کے اعتبار سے دیکھتا ہے۔ مومن معاملات کے تاریک پہلو کو نظر انداز کر دیتا ہے اور صرف اس کے روشن پہلو پر اپنی تمام توجہ لگا دیتا ہے۔ مومن کیا ہے کو نہیں دیکھتا، وہ ہمیشہ یہ دیکھتا ہے کہ کیا ہوسکتا ہے۔ مومن ناموافق پہلو کو اہمیت نہیں دیتا۔ وہ صرف موافق پہلو پر اپنی ساری نظریں جما دیتا ہے۔

مومن منفی سوچ سے مکمل طور پر پاک ہوتا ہے۔ اس کی سوچ تمام تر مثبت سوچ ہوتی ہے۔ مومن کی شخصیت کو بتانے کے لیے اگر نفسیاتی اصطلاح استعمال کی جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ مومن ایک مثبت مفکر (positive thinker) ہوتا ہے۔ یعنی مثبت ذہن رکھنے والا انسان۔

مومن کی یہ صفت اس کو بے پناہ بنا دیتی ہے۔ اس کے لیے رکاوٹیں بھی زینہ بن جاتی ہیں۔ تنگ راستہ بھی اس کے لیے کشادہ راستہ بن جاتا ہے۔

حیاتِ مومن

ایمان واسلام کے واقعات

صفت مومن

قرآن میں مومن کی جو صفات بتائی گئی ہیں، ان میں سے ایک صفت توسم (الحجر، 15:75) ہے۔ توسم کا مطلب ہے استدلال بالعلاقات (تفسیر القرطبی، جلد 10، صفحہ 43)۔ یعنی ظاہری نشانیوں سے باطنی حقیقتوں کو جان لینا۔ مثلاً عربی میں کہا جاتا ہے: تَوَسَّمْتُ فِيهِ الخَيْرَ۔ یعنی میں نے اس شخص کے ظاہری قرائن سے معلوم کرلیا کہ اس کے اندر خیر کی صفت پائی جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں ایک روایت اس طرح آئی ہے:

قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: اتَّقُوا فِرَاسَةَ المُؤْمِنِ فَإِنَّهُ يَنْظُرُ بِنُورِ اللّٰہِ، ثُمَّ قَرَأَ: إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِينَ (15:75)؛ (سنن الترمذی، حدیث نمبر 3127)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مومن کی فراست سے ڈرو۔ کیونکہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔ اس کے بعد آپ نے یہ آیت پڑھی کہ اس میں نشانیاں ہیں توسم کی صفت رکھنے والوں کے لیے۔

دنیا میں دو قسم کے انسان ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو چیزوں کو ان کے ظاہر اور خارجی پہلو سے لیتے ہیں۔ ایسے لوگ معاملات کی گہرائی کو سمجھ نہیں پاتے۔ وہ صرف ظاہری بینی کی حد تک جانتے ہیں اور محض سطحی رائے قائم کرتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو نادانی کی کارروائیاں کرتے ہیں۔ وہ ایسے اقدامات کرتے ہیں جن کا نتیجہ مزید تباہی کے سوا کچھ اور نکلنے والا نہ ہو۔

دوسرا انسان وہ ہے جو ظاہری سطح سے گزر کر گہرائی تک پہنچتا ہے۔ جو خارجی مظاہر سے داخلی حقیقتوں کا پتہ لگاتا ہے۔ جو دوررس پہلوؤں کو دھیان میں رکھ کر اپنا عملی منصوبہ بناتا ہے۔ یہی دوسرا انسان متوسم ہے، اور جو متوسم ہو اس کی شخصیت اتنی بے پناہ ہوجاتی ہے کہ اس کا مقابلہ کرنا کسی کے بس میں نہیں ہوتا۔

مومن ایک متوسم انسان ہوتا ہے۔ وہ ظواہر سے گزر کر حقائق کو دیکھ لیتا ہے۔ یہی اللہ کے نور سے دیکھنا ہے۔ کیوں کہ اللہ کی نگاہ ظاہر کو پار کر کے باطن تک کا احاطہ کرلیتی ہے۔ ایسے خدائی انسان کا کون مقابلہ کرسکتا ہے۔

مثبت طریقہ

قرآن میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ بھلائی اور برائی دونوں یکساں نہیں ہو سکتے۔ اس لیے تم برائی کا بدلہ اچھائی کے ذریعہ دو: وَلا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلا السَّيِّئَةُ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَن (41:34)۔ یہ بات قرآن میں مختلف الفاظ میں بار بار کہی گئی ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اہل ایمان کو ہمیشہ مثبت ردعمل کا ثبوت دینا چاہیے۔ انھیں ہر حال میں منفی ردعمل سے بچنا چاہیے۔ ان کا سلوک دوسروں کے ساتھ عام حالات میں بھی بہتر ہونا چاہیے۔ اور اگر کوئی شخص یا گروہ اپنی طرف سے برے سلوک کا مظاہرہ کرے تب بھی خدا پرستوں کے اوپر فرض ہے کہ وہ ردعمل کی نفسیات میں مبتلا نہ ہوں۔ اس وقت بھی وہ بااصول انسان کا ثبوت دیں۔ برائی کے جواب میں بھی وہ اپنے اچھے سلوک پر قائم رہیں۔

مذکورہ آیت کی تشریح میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں: أَمَرَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِينَ بِالصَّبْرِ عِنْدَ الْغَضَبِ، وَالْحِلْمِ عِنْدَ الْجَهْلِ، وَالْعَفْوِ عِنْدَ الْإِسَاءَةِ (تفسیر ابن کثیر، جلد 7، صفحہ 181)۔ یعنی، اللہ نے اس آیت میں مسلمانوں کو یہ حکم دیا ہے کہ جب انھیں غصہ آجائے تو وہ صبر و برداشت سے کام لیں۔ ان کے ساتھ جب کوئی شخص جہالت کرے تو وہ بردباری کا طریقہ اختیار کریں۔ اور جب ان کے ساتھ کوئی شخص برا سلوک کرے تو وہ اسے معاف کردیں۔

اس اسلامی سلوک کو ایک لفظ میں مثبت سلوک کہا جا سکتا ہے۔ یعنی جوابی معاملہ نہ کرتے ہوئے ہر ایک سے معتدل معاملہ کرنا۔ دوسروں کی روش خواہ کچھ بھی ہو، اپنے آپ کو ہمیشہ اعلیٰ انسانی سلوک پر قائم رکھنا۔

مومن وہ ہے جو برتر حقیقتوں میں جینے لگے۔ جس کے سوچنے کی سطح عام انسانوں سے اوپر اٹھ جائے۔ ایسے انسان کے اندر بے پناہ تحمل کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کو اندرونی طور پر اتنا سکون مل جاتا ہے جو باہر کے کسی بھی واقعہ سے نہیں ٹوٹتا۔ جہاں لوگ غصہ کرتے ہیں وہاں اسے لوگوں کے اوپر ترس آتا ہے، جہاں لوگ بھڑک جاتے ہیں وہاں وہ سمندر کی طرح پرسکون بنا رہتا ہے۔

قول سدید

قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ: اے ایمان والو، اللہ سے ڈرو اور درست بات کہو۔ وہ تمہارے اعمال سدھارے گا اور تمہارے گناہوں کو بخش دے گا۔ اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے اس نے بڑی کامیابی حاصل کی (33:70-71)۔

اس قرآنی آیت میں ہمیشہ قول سدید (درست بات) کا حکم ہے۔ قول سدید کا مطلب ہے ٹھیک بات کہنا، عین وہی بات کہنا جو صحیح ہو اور واقعہ کے مطابق ہو۔ اصل حقیقت سے کچھ بھی اِدھر یا اُدھر ہٹی ہوئی نہ ہو۔ جس طرح تیر ٹھیک نشانہ کی طرف رخ کر کے چلایا جاتا ہے، اسی طرح قول سدید ٹھیک حقیقت کو سامنے رکھ کر بولا جاتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کرتے ہوئے فرمایا: اللَّهُمَّ اهْدِ

قَلْبِي، وَسَدِّدْ لِسَانِي (سنن ابو داوٗد، حدیث نمبر 1510؛ سنن الترمذی، حدیث نمبر 3551؛ مسند احمد، حدیث نمبر 1997)۔ اے اللہ، میرے دل کو ہدایت دے اور میری زبان کو قول سدید کی توفیق دے۔ اس دعا سے اندازہ ہوتا ہے کہ قول سدید کی اسلام میں کتنی زیادہ اہمیت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قول سدید کسی شخص کے مومن و مسلم ہونے کی پہچان ہے۔

انسانی کلام کی دو قسمیں ہیں۔ ایک غیر سدید کلام، دوسرا وہ جو پورے معنی میں سدید (درست) کلام ہو۔ سدید کلام وہ ہے جو عین مطابقِ حقیقت ہو۔ جو واقعات وحقائق پر مبنی ہو۔ جس کی پشت پر ٹھوس دلائل موجود ہوں۔ جس میں ساری رعایت زیر بحث معاملہ کی ہو، کسی بھی دوسری چیز کی رعایت اس میں شامل نہ ہو۔ جو تعصب سے پوری طرح پاک ہو۔

اس کے برعکس، غیر سدید کلام وہ ہے جس میں حقیقت کی رعایت شامل نہ ہو۔ جس کی بنیاد ظن وگمان پر رکھی گئی ہو، جس کی حیثیت محض رائے زنی کی ہو، نہ کہ حقیقتِ واقعہ کے اظہار کی۔ پہلے قسم کا کلام خدا کا پسندیدہ کلام ہے، اور دوسرے قسم کا کلام خدا کا مبغوض کلام۔

انسان کی انسانیت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ جب بھی بولے قول سدید کی زبان میں بولے۔ قول سدید کسی انسان کی انسانیت کا ثبوت ہے۔ اور قول غیر سدید اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کو بولنے والا انسانیت سے خارج ہے، خواہ بظاہر وہ انسان کی صورت میں دکھائی دیتا ہو۔

قابلِ پیشین گوئی کردار

سب سے بہتر انسان کون ہے۔ اسلام کے نزدیک سب سے بہتر انسان وہ ہے، جو قابلِ پیشین گوئی کردار (predictable character) کا حامل ہو۔ جس کے متعلق پیشگی

طور پر یہ یقین کیا جا سکے کہ جب بھی اس سے سابقہ پڑے گا اس سے اچھائی ہی کا تجربہ ہو گا، جب بھی اس سے کوئی معاملہ پیش آئے گا وہ دوسروں کے لیے ایک سچا انسان ثابت ہو گا۔

روایات میں آتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کی ایک مجلس کے پاس کھڑے ہوئے، آپ نے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ کیا میں تم کو تمہارے اچھے شخص اور تمہارے برے شخص کے بارے میں نہ بتاؤں۔ یہ سن کر لوگ خاموش رہے۔ تب آپ نے تین بار اپنے اس سوال کو دہرایا۔ اس کے بعد ایک شخص نے کہا کہ کیوں نہیں، اے خدا کے رسول، آپ ہم کو ہمارے اچھے شخص اور ہمارے برے شخص کے بارے میں ضرور بتائیے۔ آپ نے فرمایا کہ تم میں اچھا شخص وہ ہے جس سے بھلائی کی امید کی جائے اور جس کے شر سے لوگ مطمئن ہوں: خَيْرُكُمْ مَنْ يُرْجَى خَيْرُهُ وَيُؤْمَنُ شَرُّهُ (سنن الترمذی، حدیث نمبر 2263)۔ اس حدیث کے مطابق، بہترین انسان وہ ہے کہ جب کسی سے اس کا سابقہ پیش آئے تو اس سے دوسرے کو میٹھا بول ملے۔ وہ دوسرے کے لیے نفع بخش ثابت ہو۔ وہ دوسرے کو خوشی کا تحفہ دے سکے۔ اس سے دوسرے شخص کو ہمیشہ انصاف کا تجربہ ہو۔ وہ دوسرے کے حق میں ایک با اصول اور با کردار انسان ثابت ہو۔

اس کا یہ قابل پیشین گوئی کردار اس وقت بھی باقی رہے جب کہ دوسرے شخص کی طرف سے اس کو کوئی شکایت پہنچی ہو، جب کہ دوسرے شخص سے اس کو زیادتی کا کوئی تجربہ ہوا ہو۔ ایسے ناموافق حالات میں بھی اس کا حق پسندی کا مزاج باقی رہے۔ وہ اشتعال انگیزی کا جواب بھی صبر وسکون کے ساتھ دے۔ اس کے متعلق یہ امید کی جائے کہ دوسروں کی طرف سے برے سلوک کے باوجود وہ اپنے اصول کے مطابق ان کے ساتھ حسن سلوک کی روش پر قائم رہے گا۔ اس کا کردار ہمیشہ اعلیٰ انسانی امید پر پورا اترے گا۔

خیر پسند

زید بن مُھَلْہِل نجد میں بعثت نبوی سے پہلے پیدا ہوئے۔ وہ شاعر تھے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے شمشیر زنی اور گھوڑے کی سواری میں شہرت حاصل کی۔ چنانچہ زید الخیل کہے جانے لگے۔ خیل عربی زبان میں گھوڑے اور گھوڑ سوار کو کہتے ہیں۔

انھوں نے اسلام سے پہلے فارس (شہ سوار) اور شمشیر زنی کی تعریف پر ایک پر جوش نظم کہی تھی۔ اس میں وہ اپنے قبیلہ کے بارے میں کہتے ہیں کہ میری قوم لوگوں کی سردار ہے۔ اور سرداری اس وقت قائد بنتا ہے جب کہ شعلہ بار ہتھیلیوں نے جنگ کی آگ کو بھڑکا دیا ہو:

وَقَوْمِي رُؤُوسُ النّاسِ وَالرَّأْسُ قَائِدٌ

إِذَاالحَرْبُ شَنَّتْهاالأَكُفُّ المَسَاعِرُ

زید الخیل ہجرت کے بعد مدینہ آ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے اور اسلام قبول کرلیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زید الخیل کا نام پسند نہیں کیا۔ آپ نے ان کا نام بدل کر زید الخیر رکھ دیا۔ 9 ھ میں مدینہ میں ان کا انتقال ہوا۔ (لباب الآداب لأسامۃ بن منقذ، جلد 1، صفحہ 220)۔

اس واقعہ سے اسلام کا مزاج معلوم ہوتا ہے۔ اسلام کا مقصد آدمی کو "زید شہ سوار" بنانا نہیں ہے بلکہ اسلام کا مقصد یہ ہے کہ آدمی "زید صاحبِ خیر" بنے۔ قدیم عرب میں گھوڑا دوڑانا اور تلوار کا کمال دکھانا ہیروانہ کام سمجھا جاتا تھا۔ پیغمبر اسلام نے ان کے جذبات کو موڑا۔ اور ان کو یہ ذہن دیا کہ وہ خیر کے حامل بنیں، وہ خیر کے میدان میں بڑے بڑے کارنامے انجام دیں۔ وہ لوگوں کو موت کا تحفہ نہ دیں بلکہ وہ لوگوں کو زندگی کا تحفہ دینے کی کوشش کریں۔

آج کل کی زبان میں اگر کہا جائے تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اسلام کا خاص مقصد تخلیقی (creative) انسان پیدا کرنا ہے۔ اللہ پر ایمان آدمی کے اندر تخلیقی اوصاف کو جگا دیتا

ہے۔ وہ ہر اعتبار سے ایک نیا انسان بن جاتا ہے۔ اس کی سوچ عام سوچ سے اوپر اٹھ جاتی ہے۔ اس کا کردار دوسرے لوگوں کے کردار سے بلند ہوجاتا ہے۔ وہ زمین میں رہتے ہوئے ایک آسمانی انسان بن جاتا ہے۔

مومن کا کام زید الخیل بننا نہیں، بلکہ زید الخیر بننا ہے۔ یہی مومنانہ شخصیت کا خلاصہ ہے۔

اچھا مسلمان

حضرت ابوذر الغفاری ایک مشہور صحابی ہیں۔ انھوں نے مدینہ کے پاس ”ربذہ“ میں 32ھ میں وفات پائی۔ ان سے ایک طویل حدیث مروی ہے۔ اس حدیث کا ایک حصہ یہ ہے:

دَخَلْتُ الْمَسْجِدَ، فَإِذَا رَسُولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم جَالِسٌ وَحْدَهُ، ...فَجَلَسْتُ إِلَيْهِ، فَقُلْتُ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ، ...أَيُّ الْمُؤْمِنِينَ أَكْمَلُ إِيمَانًا؟ قَالَ: ”أَحْسَنُهُمْ خُلُقًا“، قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ، فَأَيُّ الْمُؤْمِنِينَ أَسْلَمُ؟ قَالَ: ”مَنْ سَلِمَ النَّاسُ مِنْ لِسَانِهِ وَيَدِهِ“، ...قَالَ: قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ، فَأَيُّ الْهِجْرَةِ أَفْضَلُ؟ قَالَ: ”مَنْ هَجَرَ السَّيِّئَاتِ“ (صحیح ابن حبان، حدیث نمبر 807)۔ یعنی، میں مسجد میں داخل ہوا تو میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تنہا بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں آپ کے پاس بیٹھ گیا۔ پھر میں نے کہا کہ اے خدا کے رسول، مومنوں میں سب سے زیادہ افضل کون ہے۔ آپ نے فرمایا کہ جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں۔ پھر میں نے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول، سب سے افضل مسلم کون ہے۔ آپ نے فرمایا کہ جس کی زبان اور جس کے ہاتھ سے لوگ محفوظ ہوں۔ پھر میں نے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول،

سب سے افضل ہجرت کون سی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اس شخص کی ہجرت جو برائیوں کو چھوڑ دے۔

اس حدیث رسول سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام جو انسان بنانا چاہتا ہے وہ کیسا انسان ہوتا ہے۔ یہ وہ انسان ہے جو لوگوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں بہترین اخلاق کا ثبوت دے۔ یہ وہ انسان ہے جس کے اندر ذمہ داری کا احساس اس طرح جاگ اٹھے کہ وہ اپنی زبان سے کسی کا دل نہ دُکھائے، اس کے ہاتھ سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔ وہ ہر اس عادت اور ہر اس روش کو چھوڑ دے جس میں برائی کا کوئی پہلو موجود ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ اچھا مسلمان وہ ہے جو اچھا انسان ہو۔ اسلام دراصل انسان سازی کا مذہب ہے۔ اسلام کا مقصد انسان کی فکری تطہیر اور عملی اصلاح ہے، جس آدمی کے دل میں اسلام اتر جائے وہ اپنے آپ اچھا انسان بھی بن جائے گا۔

جس آدمی کی زندگی بھلائی سے خالی ہو اس کی زندگی یقیناً اسلام سے بھی خالی ہو گی۔

جامع اصول

دین انسانیت کا نہایت سادہ اصول یہ ہے کہ — دوسروں کے ساتھ وہی سلوک کرو جو تم اپنے لیے پسند کرتے ہو۔ حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا جب تک اس کا یہ حال نہ ہو جائے کہ وہ اپنے بھائی کے لیے وہی پسند کرے جو وہ خود اپنے لیے پسند کرتا ہے: لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّى يُحِبَّ لِأَخِيهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهِ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 13)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ حدیث کی تمام کتابوں میں آیا ہے۔ مثلاً مسلم کی روایت میں یہ الفاظ ہیں: وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَا يُؤْمِنُ عَبْدٌ

حَتَّى يُحِبَّ لِجَارِهِ، أَوْ قَالَ: لِأَخِيهِ، مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهِ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 45)۔ یعنی، اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، کوئی بندہ اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک وہ اپنے پڑوسی (یا اپنے بھائی) کے لیے وہی پسند نہ کرے جو وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے۔

کوئی آدمی خواہ پڑھا لکھا ہو یا بے پڑھا لکھا ہو، ایک طبقہ سے تعلق رکھتا ہو یا دوسرے طبقہ سے، حتی کہ معذور ہو یا غیر معذور، ہر حال میں وہ یقینی طور پر یہ جانتا ہے کہ کیا چیز مجھے پسند آتی ہے اور کیا چیز مجھے پسند نہیں آتی۔ اب ہر آدمی سادہ طور پر اپنے لیے یہ اصول بنا لے کہ جو سلوک اس کو پسند آتا ہے وہی سلوک وہ دوسروں کے ساتھ کرے۔ اور جو سلوک اس کو پسند نہیں آتا اس سے وہ خود بھی پرہیز کرنے لگے۔

یہ ایک ایسا جامع اصول ہے جو عورت اور مرد، فرد اور قوم، ملکی اور غیر ملکی ہر ایک کے لیے کارآمد ہے۔ لوگ اگر اس اصول کو اختیار کرلیں تو خاندانی زندگی بھی بہتر ہو جائے اور سماجی زندگی بھی۔ قومی زندگی بھی خوش اسلوبی کے ساتھ چلنے لگے اور بین الاقوامی زندگی بھی۔ یہ گویا انسانی اخلاقیات کے لیے ایک شاہ کلید ہے۔ یہ ایک ہی کنجی تمام تالوں کو کھول دینے کے لیے کافی ہے۔

جو آدمی اپنے اور غیر میں فرق نہ کرے وہ ایک بااصول انسان ہوگا۔ اس کے اندر ایک بے تضاد شخصیت پرورش پائے گی۔ اس کی یہ صفت اس کو کامل انسان بنا دے گی۔

بے مسئلہ

مومن ایک بے مسئلہ انسان ہوتا ہے۔ وہ ہر حال میں اور ہر ماحول میں مسٹر نو پرابلم بن کر رہتا ہے۔ اِس معاملہ میں اس کی حساسیت اتنی بڑھی ہوئی ہوتی ہے کہ وہ معمولی درجہ میں

بھی کسی کے لیے مسئلہ پیدا کرنا پسند نہیں کرتا۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کا یہ حال تھا کہ ایک شخص گھوڑے پر سوار ہوتا اور اس کا کوڑا زمین پر گر پڑتا تو وہ گھوڑے سے اتر کر اپنا کوڑا اٹھاتا تھا (سنن ابو داؤد، حدیث نمبر 1642)۔

حدیث میں بتایا گیا ہے کہ سب سے اچھا مسلم وہ ہے جس کے شر سے لوگ مامون رہیں: وَيُؤْمَنُ شَرُّهُ (سنن الترمذی، حدیث نمبر 2263)۔ ایک اور روایت میں ہے کہ مومن وہ ہے جو اللہ سے ڈرے اور لوگوں کو اپنے شر سے محفوظ رکھے: يَتَّقِي اللَّهَ وَيَدَعُ النَّاسَ مِنْ شَرِّهِ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 2786)۔

البخاری (کتاب الادب) میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر مسلم پر صدقہ ہے۔ یعنی اس کو دینے والا بننا چاہیے۔ پوچھا گیا کہ اگر کسی کے پاس کچھ نہ ہو۔ آپ نے فرمایا کہ وہ محنت کر کے کمائے اور پھر اس میں سے دے۔ پوچھا گیا کہ اگر وہ ایسا بھی نہ کر سکے۔ آپ نے فرمایا کہ وہ زبان سے اچھا کلمہ کہے۔ پوچھا گیا کہ اگر وہ ایسا بھی نہ کر سکے تو آپ نے فرمایا: فليمسك عَنِ الشَّرِّ فَإِنَّهُ لَهُ صَدَقَةٌ۔ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 5676)۔ یعنی، وہ اپنے شر کو دوسروں سے روکے۔ کیوں کہ یہ بھی ایک عطیہ ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ کامل ایمان والا مومن وہ ہے جو مجاہد بنے اور اللہ کے راستہ میں اپنے جان و مال کو خرچ کرے۔ اور اس کے بعد وہ آدمی جو کسی گھاٹی میں اللہ کی عبادت کرے اور لوگ اس کے شر سے بچے ہوئے ہوں: قَدْ كُفِيَ النَّاسُ شَرَّهُ (سنن ابو داؤد، حدیث نمبر 2485)۔

حدیث کی کتابوں میں کثرت سے اس قسم کی تعلیمات آئی ہیں۔ ان کا خلاصہ یہ ہے کہ سماج میں رہنے والے ایک مسلمان کے لیے کردار کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ وہ دوسروں کو نفع پہنچائے۔ اس کے بعد اسلامی کردار کا کم سے کم معیار یہ ہے کہ وہ پوری طرح بے ضرر بنا ہوا

ہو، وہ کسی کے لیے کسی بھی قسم کا کوئی چھوٹا یا بڑا مسئلہ پیدا نہ کرے۔ یہی اخلاقی صفت کسی کے مومن و مسلم ہونے کی اصل پہچان ہے۔

پڑوسی کے ساتھ

قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ: تم لوگ اچھا سلوک کرو، رشتہ دار پڑوسی کے ساتھ، اجنبی پڑوسی کے ساتھ اور پاس بیٹھنے والے کے ساتھ اور مسافر کے ساتھ (4:36)۔ پڑوسی کے حقوق کا حکم اس تفصیل کے ساتھ دینے کا مطلب یہ ہے کہ ہر قسم کے پڑوسی کے ساتھ اچھا سلوک کرنا واجب ہے، خواہ وہ قریب کا پڑوسی ہو یا دور کا پڑوسی، خواہ وہ وقتی پڑوسی ہو یا مستقل پڑوسی، خواہ وہ گھر کا پڑوسی ہو یا ایسا پڑوسی ہو جو تعلیم یا کاروبار یا سفر کے دوران آدمی کے ساتھ ہو جائے۔ جب بھی اور جہاں بھی ایک آدمی دوسرے آدمی کے ربط میں آئے تو لازم ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص کے انسانی حقوق کا لحاظ کرے، ایک شخص دوسرے شخص کو کسی بھی اعتبار سے شکایت کا موقع نہ دے۔ ایک مسلمان کو فرد کے اعتبار سے بھی اچھا پڑوسی بننا ہے، اور وسیع تر سطح پر قومی اعتبار سے بھی اسے اچھا پڑوسی ہونے کا ثبوت دینا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، کوئی بندہ مومن نہیں ہو سکتا یہاں تک کہ وہ اپنے پڑوسی کے لیے، یا یہ فرمایا کہ اپنے بھائی کے لیے، وہی پسند کرے جو وہ خود اپنے لیے پسند کرتا ہے: وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَا يُؤْمِنُ عَبْدٌ حَتَّى يُحِبَّ لِجَارِهِ، أَوْ قَالَ: لِأَخِيهِ، مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهِ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 45)۔ ایک اور روایت کے مطابق آپ نے فرمایا کہ وہ شخص جنت میں نہیں جائے گا جس کے شر سے اس کا پڑوسی امن میں نہ ہو: لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ لَا يَأْمَنُ جَارُهُ بَوَائِقَهُ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 46)۔ ایک حدیث میں ہے کہ: خَيْرُ الأَصْحَابِ عِنْدَ اللَّهِ خَيْرُهُمْ

لِصَاحِبِهِ، وَخَيْرُ الجِيرَانِ عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرُهُمْ لِجَارِهِ۔ یعنی، اللہ کے نزدیک سب سے اچھا ساتھی وہ ہے جو اپنے ساتھی کے لیے اچھا ہو اور اللہ کے نزدیک سب سے اچھا پڑوسی وہ ہے جو اپنے پڑوسی کے لیے اچھا ہو (سنن الترمذی، حدیث نمبر 1944)۔ آپ نے فرمایا: مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلَا يُؤْذِ جَارَهُ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 6018)۔ یعنی، جو شخص اللہ پر ایمان رکھتا ہو وہ اپنے پڑوسی کو نہ ستائے۔ اسی طرح آپ نے فرمایا: مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيُكْرِمْ جَارَهُ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 6019)۔ یعنی، جو شخص اللہ پر ایمان رکھتا ہو وہ اپنے پڑوسی کی عزت کرے۔

حدیث کا مطالعہ

عَنْ أَسْمَاءَ بِنْتِ أَبِي بَكْرٍ رضي الله عنهما قَالَتْ: قَدِمَتْ عَلَيَّ أُمِّي وَهِيَ مُشْرِكَةٌ فِي عَهْدِ قُرَيْشٍ فَقَالَتْ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ إِنَّ أُمِّي قَدِمَتْ عَلَيَّ وَهِيَ رَاغِبَةٌ أَفَأَصِلُهَا؟ قَالَ: نَعَمْ صِلِيهَا (صحیح البخاری، حدیث نمبر 3183؛ صحیح مسلم، حدیث نمبر 1003)۔ یعنی، اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میری (رضاعی) ماں میرے پاس مدینہ آئیں۔ اس وقت وہ شرک پر تھیں اور وہ قریش کی حلیف تھیں۔ میں نے پوچھا کہ اے خدا کے رسول میری مشرک ماں میرے پاس آئی ہے اور وہ مجھ سے کچھ چاہتی ہے۔ کیا میں انہیں صلہ رحمی کے طور پر کچھ دوں۔ آپ نے فرمایا کہ ہاں، ان کو دو۔

یہ حدیث بظاہر والدین کے ساتھ حسن سلوک کے بارے میں ہے، خواہ وہ مشرک اور کافر ہی کیوں نہ ہو۔ حدیث کی کتابوں میں وہ اسی طرح کے باب کے تحت لکھی ہوئی ملے گی۔ مگر کسی حدیث کو سمجھنے کے لیے صرف اس کے ”ترجمہ باب“ کو دیکھنا کافی نہیں۔ اسی کے

ساتھ حدیث کے متن پر گہرائی کے ساتھ غور کرنا چاہیے۔ اس کے بعد ہی آدمی کے اوپر اس کے پورے معانی کھل سکتے ہیں۔

اس حدیث سے حقوق والدین کے مسئلہ کے علاوہ مزید یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ اس زمانہ کا واقعہ ہے جب کہ قریش اور مسلمانوں کے درمیان خاتمہ جنگ کا معاہدہ ہو گیا تھا۔ اس کے نتیجہ میں یہ ہوا کہ مکہ کے مشرکین مدینہ آنے لگے اور مدینہ کے مسلمان مکہ جانے لگے۔

عقل عام یہ سمجھنے کے لیے کافی ہے کہ اس آمد و رفت میں صرف "صلہ رحمی" کا مسئلہ سامنے نہیں آیا۔ بلکہ اسی کے ساتھ یہ ہوا کہ شرک اور توحید پر گفتگو ہونے لگی۔ آبائی مذہب اور پیغمبرانہ مذہب کا تقابل کیا جانے لگا۔ توہم پرستانہ مذہب اور الہامی مذہب کا فرق لوگوں پر واضح ہونے لگا۔

اس طرح یہ ہوا کہ صلح حدیبیہ کی تدبیر نے جنگی ماحول کو دعوتی ماحول میں تبدیل کر دیا۔ مکہ اور مدینہ میں جہاں اس سے پہلے تلواروں کی جھنکار سنائی دیتی تھی، وہ دعوت حق کی آوازوں سے گونجنے لگے، اور جب ایسا ہو جائے تو اسلام کی فتح اتنی ہی یقینی ہو جاتی ہے جتنا کہ تاریکیوں کی دنیا میں سورج کے طلوع ہونے سے سورج کا فتح یاب ہونا۔

اعتراف

سب سے بڑا عمل اعتراف ہے۔ اعتراف کی حیثیت جڑ والی صفت کی ہے۔ جس آدمی کے اندر اعتراف کا مادہ ہو، اس کے اندر دوسری تمام خوبیاں بھی موجود ہوں گی۔ جو آدمی اعتراف سے خالی ہو، وہ یقینی طور پر تمام خوبیوں سے بھی خالی ہوگا۔

یہ اعتراف کا مادہ ہی ہے جو کسی آدمی کو ایمان کی طرف لے جاتا ہے جو کہ دین کی اصل

بنیاد ہے۔ جس کو شریعت کی زبان میں ایمان کہا جاتا ہے، اسی کا نام فطرت کی زبان میں اعتراف ہے۔ اعتراف کی فطرت جب ایمان میں ڈھل جائے تو وہیں سے دینی یا اسلامی زندگی شروع ہوجاتی ہے۔ اعتراف ہی کی عملی صورت کا نام عبادت خداوندی ہے۔

اعتراف کا مادہ ہی آدمی کو مجبور کرتا ہے کہ وہ پیغمبر کی پیغمبری کو مانے۔ وہ اس حقیقت کو تسلیم کرے کہ پیغمبر اس کے لیے قابل اطاعت نمونہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اسے اپنی پوری زندگی میں پیغمبر کے حکم کی پیروی کرنا چاہیے۔

قرآن کو خدا کی کتاب سمجھنا اور حدیث کو پیغمبر خدا کے کلام کا درجہ دینا بھی اسی جذبۂ اعتراف کی بنا پر ہوتا ہے۔ حقیقت واقعہ کے اعتراف کا جذبہ آدمی کو مجبور کرتا ہے کہ وہ قرآن و حدیث کی اس حیثیت کو تسلیم کرے جو فی الواقع اسے حاصل ہے۔

اسی طرح انسانوں کے حقوق کی ادائیگی کا معاملہ بھی اعتراف سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ دراصل جذبۂ اعتراف ہی ہے جو آدمی سے یہ کہتا ہے کہ دوسروں کا حق جو تمہارے اوپر آتا ہے اس کو تم پوری طرح ادا کرو۔ احترام، شفقت، امانت، صبر، شریفانہ اخلاق، وعدہ پورا کرنا، لوگوں کے ساتھ خیر خواہی کرنا، اس قسم کی جتنی بھی اعلی انسانی خصوصیات ہیں، ان سب کا سرچشمہ اعتراف ہے۔

اسی طرح تمام بری صفات کا رشتہ بے اعترافی سے بندھا ہوا ہے۔ ایمان پر راضی نہ ہونا بے اعترافی ہے۔ کسی انسان کے ساتھ حسد اسی لیے پیدا ہوتا ہے کہ آدمی اس کے فضل کا اعتراف کرنا نہیں چاہتا۔ آدمی خیانت اسی لیے کرتا ہے کہ وہ نہیں مانتا کہ جو چیز اس کے پاس ہے وہ اس کی اپنی نہیں ہے بلکہ دوسرے کی ہے۔

ناشکری نہیں

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (دنیا کے معاملہ میں) اس کو دیکھو جو تمہارے نیچے ہے، اس کو نہ دیکھو جو تمہارے اوپر ہے۔ اس طرح تم اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کو حقیر نہ سمجھو گے: عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم: انْظُرُوا إِلَى مَنْ أَسْفَلَ مِنْكُمْ، وَلَا تَنْظُرُوا إِلَى مَنْ هُوَ فَوْقَكُمْ، فَهُوَ أَجْدَرُ أَنْ لَا تَزْدَرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 2963)۔

دنیا کی چیزوں کی تقسیم میں یکسانیت نہیں۔ یہاں کسی کو کم ملا ہے اور کسی کو زیادہ۔ کسی کو ایک چیز دی گئی ہے اور کسی کو دوسری چیز۔ اس صورت حال نے دنیوی معاملات میں ایک شخص اور دوسرے شخص کے درمیان فرق کر دیا ہے۔ اب اگر آدمی اپنا مقابلہ اس شخص سے کرے جو بظاہر اس کو اپنے سے کم نظر آتا ہے تو اس کے اندر شکر کا جذبہ پیدا ہوگا۔ اس کے برعکس، اگر آدمی اپنا مقابلہ اس شخص سے کرنے لگے جو بظاہر اس کو اپنے سے زیادہ دکھائی دیتا ہے تو اس کے اندر ناشکری کا احساس ابھرے گا۔

اس نفسیاتی خرابی سے بچنے کا آسان حل یہ بتایا گیا ہے کہ ہر آدمی اس کو دیکھے جو اس کے نیچے ہے، وہ اس کو نہ دیکھے جو اس کے اوپر ہے۔

شیخ سعدی نے لکھا ہے کہ میرے پاؤں میں جوتے نہیں تھے۔ میں نے کچھ لوگوں کو جوتا پہنے ہوئے دیکھا۔ مجھے خیال آیا کہ دیکھو، خدا نے ان کو جوتا دیا اور مجھے بغیر جوتے کے رکھا۔ وہ اسی خیال میں تھے کہ ان کی نظر ایک شخص پر پڑی جس کا ایک پاؤں کٹا ہوا تھا۔ یہ دیکھ کر انھوں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس نے انہیں اس سے بہتر بنایا اور ان کو دو تندرست پاؤں عطا کیے — اللہ تعالیٰ کو اپنے ہر بندہ سے یہ مطلوب ہے کہ وہ اس کا شکر گزار بنے۔ مگر موجودہ دنیا میں شکر گزار وہی شخص رہ سکتا ہے جو اس اعتبار سے اپنا نگراں بن گیا ہو۔

جنت کے کنارے

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم: إِذَا مَرَرْتُمْ بِرِيَاضِ الجَنَّةِ فَارْتَعُوا. قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ وَمَا رِيَاضُ الجَنَّةِ؟ قَالَ: المَسَاجِدُ، قُلْتُ: وَمَا الرَّتْعُ يَا رَسُولَ اللّٰهِ؟ قَالَ: سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ أَكْبَرُ (**سنن الترمذی، حدیث نمبر3509**)۔یعنی، حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جب تم جنت کے باغوں سے گزرو تو اس سے چرلیا کرو۔ میں نے کہا کہ اے خدا کے رسول، جنت کے باغ کیا ہیں۔آپ نے فرمایا کہ مسجدیں اور ذکر کے حلقے۔ میں نے کہا کہ اے خدا کے رسول، چرنا کیا ہے۔آپ نے فرمایا: سبحان اللّٰہ اور الحمد للّٰہ اور لا الٰہ الا اللّٰہ اور اللّٰہ اکبر۔

آدمی جب دنیا میں چلتا پھرتا ہے تو اس کے سامنے ایسے مواقع آتے ہیں جو اس کے خدائی احساسات کو جگاتے ہیں۔ کبھی مسجد اس کو خدا کی معبودیت کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ کبھی ذکر خداوندی کی مجلسیں اس کو خدا کی صفات کی یاد دلاتی ہیں۔ کبھی کائنات کی نشانیاں اس کو خدا کی عظمت وجلال کی جھلک دکھاتی ہیں۔

اس قسم کے تجربات آدمی کو جنت کے باغوں میں سے کسی باغ کے کنارے پہنچا دیتے ہیں۔ وہ آدمی کے اندر ان احساسات کو پیدا کرنے کا سبب بنتے ہیں جو اس کو جنت میں پہنچانے والے ہیں۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ ان مواقع سے استفادہ کرے اور ان سے جنتی غذا لے کر اپنے آپ کو جنت میں بسنے کے قابل بنالے۔

ان تجربات کے درمیان آدمی کے اوپر اتنا شدید تاثر طاری ہونا چاہیے کہ اس کی روح حقیقت اعلیٰ سے مربوط ہوجائے۔ اس کے ابلتے ہوئے احساسات ان الفاظ میں ڈھل جائیں کہ خدایا، تو پاک ہے۔ سارا شکر اور ساری تعریف تیرے لیے ہے۔ تو ہی معبود ہے، تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔ ساری بڑائی صرف تیرے لیے ہے، تیرے سوا کسی کو بھی کوئی بڑائی حاصل نہیں۔

دنیا میں آدمی کو اس طرح رہنا ہے کہ وہ یہاں کے مناظر میں جنت کی جھلک دیکھنے لگے۔ اس کے بعد ہی وہ جنت کے باغوں میں چرنے کی سعادت حاصل کرسکتا ہے۔

ذکر وفکر

- قَالَ الشَّيْخُ أَبُو سُلَيْمَانَ الدَّارَانِيُّ (وفات 215ھ): إِنِّي لَأَخْرُجُ مِنْ مَنْزِلِي، فَمَا يَقَعُ بَصَرِي عَلَى شَيْءٍ إِلَّا رَأَيْتُ لِلّٰهِ عَلَيَّ فِيهِ نِعْمَةً، وَلِي فِيهِ عِبْرَةٌ (تفسیر ابن کثیر، جلد 2، صفحہ 184)۔ شیخ ابو سلیمان دارانی نے کہا کہ میں اپنے گھر سے نکلتا ہوں تو میرا حال یہ ہوتا ہے کہ جس چیز پر بھی میری نظر پڑتی ہے اس میں مجھے اللہ کی نعمت دکھائی دیتی ہے اور اس میں میرے لیے عبرت ہوتی ہے۔
- عَنِ الحَسَنِ البَصْرِيِّ (110-21) أَنَّهُ قَالَ: تَفَكُّرُ سَاعَةٍ خَيْرٌ مِنْ قِيَامِ لَيْلَةٍ (حلیۃ الاولیاء لابی نعیم، جلد 6، صفحہ 271)۔ حسن بصری نے کہا کہ ایک گھڑی کے لیے اللہ میں سوچنا، ساری رات نماز پڑھنے سے بہتر ہے۔
- قال سفیان بن عیینه (198-107ھ): الفِكْرَةُ نُورٌ يَدْخُلُ القَلْبَ، وَكَانَ يَقُولُ: إِذَا الْمَرْءُ كَانَتْ لَهُ فِكْرَةٌ، فَفِي كُلِّ شَيْءٍ لَهُ عِبْرَةٌ (حلیۃ الاولیاء لابی نعیم،

جلد 7، صفحہ 306)۔ یعنی، سفیان بن عیینہ نے کہا کہ غور وفکر کرنا روشنی ہے جو تمہارے دل میں داخل ہوتی ہے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ جب آدمی کے اندر سوچ کا مادہ ہوتو ہر چیز میں اس کے لیے عبرت ونصیحت ہوگی۔

ایک روایت میں بتایا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ وہ آدمی مبارک ہے جس کا بولنا یادِ الٰہی کا بولنا ہو۔ جس کی خاموشی غور وفکر کی خاموشی ہو اور جس کا دیکھنا عبرت کا دیکھنا ہو: أَنَّ عِيسَى بْنَ مَرْيَمَ كَانَ يَقُولُ: طُوبَى لِمَنْ كَانَ قِيلُهُ تَذَكُّرًا، وَصَمْتُهُ تَفَكُّرًا، وَنَظَرُهُ عِبْرَةً (تاریخ دمشق لابن عساکر، جلد 68، صفحہ 43)۔

دین کی اصل حقیقت ذکر وفکر ہے۔ ذکر وفکر سے مراد معروف قسم کے اوراد واشغال نہیں ہیں۔ ذکر وفکر ایک زندہ عمل ہے، جو شعور خداوندی کی زمین پر پیدا ہوتا ہے۔ جب ایک شخص پر اللہ کی حقیقت اپنے جلال وکمال کے ساتھ منکشف ہوتی ہے تو اس کے ذہن میں ایک نئی روشنی آجاتی ہے۔ اس کی روح ربانی جلووں سے بیدار ہوجاتی ہے۔

ایسا آدمی اندر سے باہر تک بدل جاتا ہے۔ اس کا چپ رہنا اور اس کا بولنا، اس کا دیکھنا اور اس کا سننا، اس کا چلنا اور اس کا رکنا، ہر چیز میں ایک ربانی نور پیدا ہوجاتا ہے۔ ساری دنیا اس کے لیے رزق رب کا دسترخوان بن جاتی ہے۔

یہی وہ ربانی انسان ہے جس کو مومن باللہ کہا جاتا ہے۔

ایک انسانی کردار

قرآن میں ایک انسانی کردار کی مثال دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ:

ان کو اس شخص کا حال سناؤ جس کو ہم نے اپنی آیتیں دی تھیں تو وہ ان سے نکل بھاگا۔ پس شیطان اس کے پیچھے لگ گیا اور وہ گمراہوں میں سے ہوگیا۔ اور اگر

ہم چاہتے تو اس کو ان آیتوں کے ذریعہ سے بلندی عطا کرتے مگر وہ تو زمین کا ہو رہا اور اپنی خواہشوں کی پیروی کرنے لگا: وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ الَّذِي آتَيْنَاهُ آيَاتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَأَتْبَعَهُ الشَّيْطَانُ فَكَانَ مِنَ الْغَاوِينَ۔ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنَاهُ بِهَا وَلَكِنَّهُ أَخْلَدَ إِلَى الْأَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوَاهُ (7:175-176)۔

اس آیت میں اس انسان کی مثال دی گئی ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ ایسے حالات فراہم کرے جس کے اندر رہ کر وہ ایک دینی زندگی گزارے اور آخرت میں خدا کا انعام حاصل کرے۔ مگر وہ اس پر راضی نہ ہو اور حرص وہوس میں مبتلا ہو کر ایک ایسی زندگی کی طرف بھاگ کھڑا ہو جس میں دنیا کی چمک دمک تو ہو مگر اس کی دینی اور اخروی زندگی اجڑ جائے۔ ایسے لوگوں کی بابت فرمایا کہ یہی گھاٹا اٹھانے والے لوگ ہیں: فَأُولَئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ (7:178)۔

ایک شخص کو خدا یہ موقع دے کہ وہ بقدر ضرورت روزی پر قناعت کر کے دینی زندگی گزارے مگر وہ بقدر عیش حاصل کرنے کی خاطر یہ کرے کہ دینی زندگی کو چھوڑ کر دنیوی زندگی کی طرف دوڑ پڑے تو اس کا یہ فعل مذکورہ قرآنی آیت کا مصداق ہوگا۔

اسی طرح ایک شخص کو مامور بن کر دین کا کام کرنے کا موقع ملے مگر وہ امیر بننے کے شوق میں اس کو استعمال نہ کر سکے۔ ایک شخص کو اقتدار سے باہر زبان وقلم کے ذریعہ دعوت دین کا کام کرنے کا موقع دیا جائے مگر وہ اقتدار کا منصب حاصل کرنے کی خاطر اپنے آپ کو اس سے محروم کر لے۔ ایک شخص کے لیے غیر مشہور حیثیت میں دین کی خدمت کرنے کے مواقع فراہم ہوں مگر اپنے آپ کو مشہور حیثیت میں دیکھنے کے پیچھے وہ تمام مواقع کو تباہ کر دے۔ جو لوگ ایسا کریں ان کی مثال اس انسان کی سی ہے جس کو خدا نے بلند حیثیت دینا چاہا مگر اس نے اپنے آپ کو پستی کی حالت میں گرا دیا۔

حرص دنیا کو چھوڑ کر ہی کوئی شخص دینی خدمت کا موقع اپنے لیے پا سکتا ہے۔

زاویہ نظر کا فرق

سورۃ البقرہ میں بنی اسرائیل کی قدیم تاریخ کا ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے تقریباً تین سو سال بعد، اور حضرت داؤدؑ سے کچھ پہلے، ان کے ایک نبی شموئیل (1100-1020) تھے جو شام کے ایک شہر رامہ میں رہتے تھے۔ بنی اسرائیل اس وقت دشمنوں سے گھرے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنے پیغمبر سے کہا کہ ہمارے لیے ایک ملک (بادشاہ) مقرر کر دیجیے۔ شموئیل جو اس وقت بوڑھے ہو چکے تھے، انہوں نے کہا کہ اللہ نے طالوت (Saul) کو تمہارے لیے بادشاہ مقرر کیا ہے (2:247)۔

اس کے بعد قرآن میں ہے کہ: بنی اسرائیل نے کہا کہ اس کو ہمارے اوپر بادشاہی کیسے مل سکتی ہے۔ حالانکہ اس کے مقابلہ میں ہم بادشاہی کے زیادہ حق دار ہیں، اور اس کو زیادہ دولت بھی حاصل نہیں۔ نبی نے کہا کہ اللہ نے تمہارے مقابلہ میں اس کو چنا ہے اور علم اور جسم میں اس کو زیادتی دی ہے۔ اور اللہ اپنی سلطنت جس کو چاہتا ہے دیتا ہے اور اللہ بڑی وسعت والا، جاننے والا ہے (2:247)۔

شموئیل نبی نے جس آدمی کو بنی اسرائیل کے اوپر سردار مقرر کیا، اس کا ایک پہلو یہ تھا کہ وہ اونچے خاندان کا نہیں تھا اور اس کے پاس زیادہ دولت بھی نہیں تھی، بنی اسرائیل نے جب اس کو اس اعتبار سے دیکھا تو وہ ان کے درمیان ایک کم تر انسان نظر آیا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ایسا ایک کم تر انسان ہمارے اوپر سردار کس طرح بن سکتا ہے۔ مگر اس کی شخصیت کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ وہ جسمانی اعتبار سے ایک طاقت ور انسان تھا اور اس کے ساتھ ذہین اور مدبر تھا۔ اس دوسرے پہلو سے دیکھنے میں وہ سب سے زیادہ لائق تھا۔ کیونکہ سرداری کے لیے اسی قسم کی صلاحیت والے انسان کی ضرورت ہوتی ہے۔

یہ زاویۂ نظر کے فرق کا معاملہ ہے۔ کسی چیز کو آپ ایک رخ سے دیکھیں تو وہ درست نظر آئے گی۔ اسی چیز کو دوسرے رخ سے دیکھیے تو وہ بالکل غلط معلوم ہونے لگی گی۔

یہی اس دنیا میں انسان کا امتحان ہے۔ یہاں صحیح زاویہ نظر والا آدمی ہدایت پائے گا، اور غلط زاویہ نظر والا آدمی بے راہ ہو کر رہ جائے گا۔

نصرت کا قانون

قرآن میں ایک طرف: تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ (33:3) کی تعلیم دی گئی ہے، اور دوسری طرف فرمایا کہ: خُذُوا حِذْرَكُمْ (4:71)۔ پہلی آیت کو اگر مطلق معنوں میں لیا جائے تو مومن کو یہ کرنا چاہیے کہ وہ ہر معاملہ میں خدا پر بھروسہ کر کے بیٹھ جائے۔ کیونکہ جب اصل حقیقت یہ ہو کہ جو کچھ ہوتا ہے، خدا کے کیے سے ہوتا ہے تو اس کے بعد انسان کی اپنی تدبیر ایک غیر ضروری چیز معلوم ہونے لگتی ہے۔ بلکہ وہ اس بات کا ایک ثبوت ہے کہ آدمی کو خدا کی مدد پر پورا بھروسہ نہیں۔

اسی طرح دوسری آیت کو اگر اس کے لفظی اور ظاہری مفہوم کے اعتبار سے لیا جائے تو مومن کو بھی ٹھیک ویسے ہی اپنے بچاؤ کی یا اپنے معاملات کو درست کرنے کی تدبیر کرنا چاہیے جیسے کہ عام دنیا دار لوگ کرتے ہیں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلی آیت کو اگر اس کے پورے مفہوم میں لیا جائے تو دوسری آیت غیر متعلق ہے۔ اور اگر دوسری آیت کو اس کے پورے مفہوم میں لیا جائے تو پہلی آیت کی مطابقت دوسری آیت کے ساتھ ناقابل فہم نظر آنے لگتی ہے۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں آیتوں میں کوئی تضاد نہیں۔ یہ ایک ہی معاملہ کے دو پہلو

ہیں۔ تَوَكَّلْ عَلَى اللهِ کی آیت خدا کی نسبت سے ہے اور خُذُوا حِذْرَكُمْ کی آیت بندے کی نسبت سے۔

اصل یہ ہے کہ دنیا میں خدا کی جو مدد آتی ہے، وہ ہمیشہ اسباب کے پردے میں آتی ہے۔ اسباب کا پردہ ہٹا کر براہ راست انداز میں خدا کی مدد کبھی نہیں آتی۔ یہی وجہ ہے کہ مومن کو اپنی استطاعت کے مطابق پوری تدبیر کرنی پڑتی ہے۔ اگر وہ تدبیر نہ کرے تو گویا اس نے وہ حالات ہی فراہم نہیں کیے جس کے قالب میں اس کے لیے خدا کی مدد اترتی۔

یہ دوطرفہ عقیدہ آدمی کے اندر بے پناہ اعتماد پیدا کر دیتا ہے۔ ایک طرف وہ تدبیر میں کمی نہیں کرتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ خدا کی مدد جب بھی آئے گی تدبیر ہی کے اندر سے آئے گی۔ دوسری طرف اس کو اپنی کامیابی کا بے پناہ یقین ہوتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ جب میں نے تدبیر کی شرط پوری کر دی تو خدا کی طرف سے آنے والی مدد بھی ضرور آ کر رہے گی۔

مومن کوشش کے معاملہ میں مجاہد ہوتا ہے اور نتیجہ کے معاملہ میں متوکل۔

اثر قبول نہ کرنا

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا ایک قول ہے کہ لوگوں سے اختلاط کرو اور یہ دیکھتے رہو کہ تم اپنے دین کو زخمی نہ کر لو — قَالَ ابْنُ مَسْعُودٍ: خَالِطِ النَّاسَ، وَدِينَكَ لَا تَكْلِمَنَّهُ (صحیح البخاری، جلد 8، صفحہ 30)۔

اسلام میں یہ پسندیدہ بات نہیں کہ آپ لوگوں سے ملنا جلنا چھوڑ دیں۔ بلکہ اسلام میں یہ

مطلوب ہے کہ آپ ہر قسم کے لوگوں سے ملتے رہیں۔ یہ اختلاط اس لیے بھی ضروری ہے کہ اسلام ایک دعوتی مذہب ہے، اور اختلاط کے بغیر دعوت کا کام نہیں ہوسکتا۔

اس کے علاوہ آپ کی شخصیت کی تکمیل کے لیے بھی اختلاط ضروری ہے۔ جب آپ لوگوں سے ملتے جلتے ہیں تو بار بار ایسے حالات پیش آتے ہیں جو آپ سے کسی ردعمل کا تقاضا کرتے ہیں۔ مثلاً کسی آدمی نے کڑوی بات کہہ دی۔ اب آپ کو اس کا جواب دینا ہے۔ کسی سے آپ نے ایک وعدہ کرلیا، اسے آپ کو پورا کرنا ہے۔ کسی کی کوئی امانت آپ کے پاس آ گئی جسے آپ کو ادا کرنا ہے۔ اس طرح کے معاملات کے دوران ہی آپ تربیت پا کر اسلامی اخلاق کے مالک بنتے ہیں۔

تاہم اختلاط کا یہ نتیجہ نہیں ہونا چاہیے کہ آپ دوسروں کا غلط اثر قبول کرلیں۔ مثلاً ایک خاتون نے ایک صاحبہ کو اپنی سہیلی بنایا۔ خاتون سادہ انداز میں رہتی تھیں اور سہیلی کے اندر فیشن والا مزاج تھا۔ سہیلی نے بار بار خاتون سے کہنا شروع کیا کہ تم کیا یہ بیوہ عورتوں کی طرح بالکل سادہ کپڑے پہنتی ہو۔ اس طرح کی باتیں کر کے سہیلی نے مذکورہ خاتون کو رنگین کپڑوں کی طرف راغب کیا پھر ان کے ڈھیلے کپڑے کی جگہ چست کپڑے سلوائے۔ اس طرح سہیلی کے اثر سے خاتون کی ایک ایک چیز بدلنے لگی۔ یہاں تک کہ وہ باقاعدہ فیشن پسند ہو گئیں اور روزانہ ان کے کئی کئی گھنٹے صرف میک اپ کی نذر ہونے لگے۔

مسلمان کو چاہیے کہ وہ اپنی دینی شخصیت کا ہمیشہ محافظ بنا رہے۔ وہ دوسروں سے اثر قبول کرنے کے بجائے خود دوسروں پر اپنا اثر ڈالنے کی کوشش کرے۔ وہ لوگوں کے درمیان داعی بن کر رہے، نہ کہ خود دوسروں کا مدعو بن جائے۔

مخلص، منافق

انسان وہ ہے جو بااصول انسان ہو۔ جس کا حال یہ ہو کہ جو وہ کہے وہی کرے، اور جو اسے کرنا ہے وہی کہے۔ جس کے قول اور فعل میں تضاد نہ پایا جائے۔

اخلاق کے اعتبار سے انسان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک، مخلص انسان، اور دوسرے، منافق انسان۔ مخلص انسان کے لیے دنیا میں بھی کامیابی ہے اور آخرت میں بھی کامیابی۔ منافق انسان دنیا میں بھی بے عزت ہے اور آخرت میں بھی بے عزت۔

مخلص انسان سنجیدہ انسان ہوتا ہے۔ وہ حقیقت کا اعتراف کرنے والا ہوتا ہے۔ اس کا ایک سوچا سمجھا ہوا اصول ہوتا ہے۔ وہ زندگی میں جو روش بھی اختیار کرتا ہے، اسی اصول کی روشنی میں اختیار کرتا ہے۔ اس کے تمام معاملات اسی اصول کے تابع ہوتے ہیں۔ اس کے متعلق پیشگی طور پر رائے قائم کی جاسکتی ہے کہ کس وقت وہ کس قسم کا رویہ اختیار کرے گا۔

مخلص انسان انکار کرسکتا ہے مگر وہ دھوکا نہیں دے سکتا۔ وہ سخت گیر ہوسکتا ہے مگر وہ جھوٹا نہیں ہوسکتا۔ وہ مخالفت کرسکتا ہے مگر وہ کمینہ پن نہیں کرسکتا۔ یہ تو ممکن ہے کہ وہ وعدہ نہ کرے مگر جب وہ وعدہ کرلے گا تو ضرور اس کو پورا کرے گا۔ ایسا ہوسکتا ہے کہ وہ اقرار نہ کرے مگر اقرار کرلینے کے بعد ایسا نہیں ہوسکتا کہ وہ اپنے قول سے پھر جائے۔

منافق انسان اس کے بالکل برعکس صفات والا انسان ہوتا ہے۔ وہ قابل پیشین گوئی کردار کا حامل نہیں ہوتا۔ وہ کہتا ہے مگر کرتا نہیں۔ وہ وعدہ کرتا ہے مگر وعدہ کو پورا کرنے سے اسے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ اس کا قول کچھ ہوتا ہے اور اس کا عمل کچھ۔ وہ خوبصورت باتوں کا بادشاہ ہوتا ہے مگر وہ خوب صورت کردار کا پیکر نہیں ہوتا۔

منافق انسان کی زندگی اصول کے بجائے مصلحت اور مفاد کے تابع ہوتی ہے۔ وہ ہر ایک سے اس کی پسند کی بولی بولتا ہے۔ ہر موقع پر حالات کو پرکھ کر عمل کرتا ہے۔ وہ صرف اس مقام پر متحرک ہوتا ہے جہاں اس کو کسی قسم کا ذاتی فائدہ نظر آئے اور جہاں ذاتی فائدہ نہ ہو وہاں وہ حرکت میں نہیں آتا۔ مخلص انسان انسان ہے اور منافق انسان بے انسان۔

پاکیزہ روش

قرآن میں اہل جنت کے تذکرہ کے ذیل میں فرمایا گیا ہے کہ — بے شک جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیا، اللہ ان کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ ان کو وہاں سونے کے کنگن اور موتی پہنائے جائیں گے اور وہاں ان کی پوشاک ریشم ہوگی۔ (یہ وہ لوگ ہیں جن کو دنیا میں) پاکیزہ قول (قول طیب) کی ہدایت بخشی گئی تھی۔ اور ان کو خدائے حمید کا راستہ (صراط الحمید) دکھایا گیا تھا (22:23-24)۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ دو چیزیں ہیں جو کسی کے لیے جنت میں داخلہ کا ذریعہ بنیں گی۔ ایک، اعتراف حق، اور دوسرے، اتباع حق۔

جب کسی سماج میں حق کی دعوت اٹھتی ہے تو ایک قسم کے لوگ وہ ہوتے ہیں جن کا ردعمل منفی انداز میں ہوتا ہے۔ وہ قول غیر طیب کے ذریعہ اس کا استقبال کرتے ہیں۔ وہ اپنے بگڑے ہوئے مزاج کی بنا پر اس کو عزت کا سوال بنا کر اسے رد کر دیتے ہیں۔ وہ سوچنے لگتے ہیں کہ اگر میں نے اس کو مان لیا تو اس کے بعد میری بڑائی ختم ہو جائے گی۔ یہ سرکشی کا ردعمل ہے۔ اور جو لوگ دعوت حق کے مقابلہ میں سرکشی کا ردعمل پیش کریں وہ اپنے اس ردعمل سے جنت کا استحقاق کھو رہے ہیں۔

دوسرا انسان وہ ہے جو قول طیب کے ذریعے دعوت حق کا استقبال کرتا ہے۔ جب وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کی اندرونی آواز اس کے حق ہونے کی گواہی دے رہی ہے تو اس کے بعد کوئی بھی دوسری چیز اس کے لیے قبول حق میں رکاوٹ نہیں بنتی۔ وہ کھلے طور پر اس کا اعتراف کر کے اپنے آپ کو اس میں شامل کر دیتا ہے۔

دعوت حق کے مقابلہ میں یہ دو قسم کا ردعمل دو الگ الگ عملی نتیجے پیدا کرتا ہے۔ جو لوگ اس کے مقابلہ میں قول غیر طیب کا مظاہرہ کریں وہ ان کی پوری زندگی کو غلط رخ پر ڈالنے کا سبب بن جاتا ہے۔ ان کی ہر روش اور ان کے ہر عمل سے حق پسندی کی روح نکل جاتی ہے۔

اس کے برعکس، جو لوگ قول طیب اور کلمۂ اعتراف کے ذریعہ دعوت حق کا استقبال کرتے ہیں ان کی پوری زندگی میں سچائی کا نکھار آجاتا ہے۔ وہ اپنے ضمیر کے مطابق چلتے ہیں۔ ان کا ہر عمل حق اور عدل کے رنگ میں رنگا ہوا ہوتا ہے۔

مومن کا طریقہ

صحیح البخاری کی ''کتاب التفسیر'' میں قرآن سے متعلق بہت سی روایتیں جمع کی گئی ہیں۔ سورۃ الحجرات کی تفسیر کے تحت ایک واقعہ دو واسطوں سے نقل کیا گیا ہے۔

ابن ابی ملیکہ (وفات 117ھ) کہتے ہیں کہ قریب تھا کہ دو اصحاب خیر ہلاک ہو جائیں، یعنی ابوبکر اور عمر۔ ان دونوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اپنی آوازیں بلند کیں۔ یہ اس وقت ہوا جب کہ بنوتمیم کا وفد مدینہ آیا۔ ابوبکر نے کہا کہ القعقاع بن معبد کو ان کا امیر بنائیے۔ عمر نے کہا کہ الاقرع بن حابس کو ان کا امیر بنائیے۔ پھر ابوبکر نے عمر سے کہا

کہ تم نے صرف میری مخالفت کے لیے ایسا کہا ہے۔ عمر نے جواب دیا کہ میرا مقصد تمہاری مخالفت نہیں۔ پھر دونوں بحث کرنے لگے۔ یہاں تک کہ ان کی آوازیں اونچی ہوگئیں۔ اس پر آیت اتری کہ: اے ایمان والو، تم اللہ اور اس کے رسول کے آگے نہ بڑھو۔ اور اللہ سے ڈرو۔ بے شک اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔ اے ایمان والو، تم اپنی آوازیں پیغمبر کی آواز سے اوپر مت کرو... ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال حبط ہو جائیں اور تم کو خبر بھی نہ ہو (49:1-2)۔

ابن الزبیر کہتے ہیں کہ اس کے بعد عمر کا یہ حال ہوا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس طرح بولتے کہ پوری طرح سنائی نہ دیتا اور رسول اللہ دوبارہ پوچھتے کہ تم نے کیا کہا: فَمَا كَانَ عُمَرُ يُسْمِعُ رَسُولَ اللَّهِ صلى الله عليه وسلم بَعْدَ هَذِهِ الْآيَةِ حَتَّى يَسْتَفْهِمَهُ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 4845، 7302)۔

یہی مومن کا طریقہ ہے۔ مومن بے خبری میں خدا اور رسول کی آواز پر اپنی آواز بلند کر سکتا ہے۔ مگر جیسے ہی اس کو بتایا جائے وہ فوراً اپنی آواز پست کر لیتا ہے۔ وہ اپنی آواز کو خدا و رسول کی آواز کے مقابلہ میں نیچا کر لیتا ہے۔

یہ صرف زمانۂ رسول کی بات نہیں۔ آج بھی اہل ایمان سے یہی مطلوب ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ پہلے براہ راست رسولِ خدا کے ذریعہ اس کو متنبہ کیا جاتا تھا۔ آج قرآن و حدیث کے حوالے سے کوئی دوسرا متنبہ کرنے والا اس کو متنبہ کرے گا۔ آج بھی جب کسی کے سامنے خدا اور رسول کا حکم بیان کیا جائے تو اس کو اپنی آواز اسی طرح پست کر لینا چاہیے جس طرح دورِ اول کے اہل ایمان نے اس کے مقابلہ میں اپنی آواز کو پست کر لیا تھا۔

پہچان کا فرق

مکی دور کے آخر میں جو واقعات پیش آئے، ان میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ ایک بار قریش مکہ کے سردار کعبہ کے اندر جمع ہوئے۔ انہوں نے باہمی مشورہ سے یہ طے کیا کہ محمدؐ کو بلا کر ان کے سامنے کچھ مطالبے رکھے جائیں۔ اگر وہ ان مطالبوں کو پورا کریں تو ہم لوگ ان کا پیغمبر ہونا مان لیں۔ اور اگر وہ ان مطالبوں کو پورا نہ کریں تو ہمارے لیے ان کو رد کرنے کا معقول عذر ہو جائے گا۔ چنانچہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بلایا۔ اس موقع پر انہوں نے آپ سے جو مطالبے کیے، ان میں سے ایک مطالبہ یہ تھا: وَلْيَبْعَثْ لَنَا مَنْ مَضَىٰ مِنْ آبَائِنَا، وَلْيَكُنْ فِيمَنْ يُبْعَثُ لَنَا مِنْهُمْ قُصَيُّ بْنُ كِلَابٍ، فَإِنَّهُ كَانَ شَيْخًا صَدُوقًا، فَنَسْأَلَهُمْ عَمَّا تَقُولُ، أَحَقٌّ هُوَ أَمْ بَاطِلٌ (سیرت ابن ہشام، جلد 1، صفحہ 296)۔ یعنی، اپنے رب سے کہیے وہ ہمارے باپ دادا کو زندہ کر دے جو کہ گزر گئے۔ اور جن کو وہ زندہ کرے ان میں قصی بن کلاب بھی ضرور ہوں، کیونکہ وہ بزرگ اور سچے تھے۔ پس ہم ان سے اس کی بابت پوچھیں جو تم کہتے ہو کہ وہ حق ہے یا باطل ہے۔

یہاں یہ سوال ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو تمام بزرگوں سے زیادہ بزرگ اور تمام سچے لوگوں سے زیادہ سچے تھے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ قدیم مکہ کے لوگوں کو قصی بن کلاب کا بزرگ اور سچا ہونا سمجھ میں آیا، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بزرگ اور سچا ہونا ان کی سمجھ میں نہ آسکا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قصی بن کلاب کی شخصیت ایک گزری ہوئی شخصیت تھی۔ زمانے کے ساتھ ان کی حیثیت لوگوں کی نظر میں مسلم ہو چکی تھی۔ اس کے مقابل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت ایک معاصر شخصیت تھی۔ آپ کی بزرگی اور سچائی، اپنی تمام تر رفعتوں کے باوجود، ابھی ایک شخص کے اندرونی جوہر کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس وقت تک وہ خارجی تاریخ کے ذریعہ معروف و مسلم نہیں بنی تھی۔

اہل کفر صرف خارجی تاریخ کو دیکھ سکتے تھے، وہ پیغمبر کو پہچاننے میں ناکام رہے۔ اہل ایمان نے اندرونی جوہر کی سطح پر پہچانا، اس لیے وہ پیغمبر کو فوراً پہچان گئے اور آپ پر ایمان لائے۔ آنکھ والا صرف وہ ہے جو کسی انسان کو اس کے جوہر کی بنیاد پر پہچانے۔ وہ شخص اندھا ہے جو کسی انسان کو صرف اس وقت پہچانے جب کہ اس کے گرد تاریخ کی تصدیقات جمع ہو چکی ہوں۔

فکری انقلاب

عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ جُبَيْرِ بْنِ مُطْعِمٍ، عَنْ أَبِيهِ رضي الله عنه قَالَ: سَمِعْتُ النَّبِيَّ صلى الله عليه وسلم يَقْرَأُ فِي الْمَغْرِبِ بِالطُّورِ، فَلَمَّا بَلَغَ هَذِهِ الْآيَةَ: أَمْ خُلِقُوا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ أَمْ هُمُ الْخَالِقُونَ. أَمْ خَلَقُوا السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ بَلْ لَا يُوقِنُونَ. أَمْ عِنْدَهُمْ خَزَائِنُ رَبِّكَ أَمْ هُمُ الْمُسَيْطِرُونَ (52:35-37) كَادَ قَلْبِي أَنْ يَطِيرَ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 4854)۔ محمد بن جبیر بن مطعم اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا کہ وہ نماز مغرب میں سورہ طور پڑھ رہے تھے۔ جب آپ اس آیت تک پہنچے کہ ”کیا وہ خالق کے بغیر پیدا ہو گئے ہیں یا وہ خود ہی خالق ہیں۔ کیا انہوں نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا ہے۔ بلکہ وہ یقین نہیں رکھتے۔ کیا ان کے پاس خدا کی رحمت کے خزانے ہیں یا وہی اس پر داروغہ ہیں“ جب میں نے اس کو سنا تو قریب تھا کہ میرا دل اڑ جائے۔

حضرت جبیر بن مطعم بدر کی جنگ تک اسلام نہیں لائے تھے۔ وہ بدر کے واقعہ کے

بعد اپنے قیدیوں کو چھڑانے کے لیے مکہ سے مدینہ آئے۔ اس وقت وہ مشرک تھے۔ مدینہ کے زمانہ قیام میں ان پر یہ تجربہ گزرا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مغرب کی نماز کی امامت کر رہے تھے۔ آپ نے نماز میں سورہ طور پڑھی۔ جُبیرؓ بن مطعم کے کان میں آواز آئی تو وہ اس کو سننے لگے۔ جب آپ اس کو پڑھتے ہوئے مذکورہ آیتوں تک پہنچے تو اس نے ان کے شعور کو اس طرح جھنجوڑا کہ ان کے اندر ایک ہلچل پیدا ہوگئی۔ ان کا دل ان کے سینہ میں اڑنے لگا۔

جبیر بن مطعم اس وقت مشرک تھے۔ مگر اب ان کا ذہن توحید کی طرف مڑ گیا۔ وہ اپنا محاسبہ کرنے لگے اور شرک و توحید کے فرق پر غور کرتے رہے۔ یہاں تک کہ حق ان پر واضح ہو گیا۔ انھوں نے شرک کو چھوڑ کر توحید کو اپنا دین بنا لیا۔ اصحاب رسول سب اسی قسم کے لوگ تھے۔ وہ شعوری انقلاب کے ذریعہ اسلام میں آئے تھے۔ بعد کو ایسے لوگ اسلام کے حامل بنے جن کو پیدائشی اتفاق نے مسلمان بنا دیا تھا۔ اور ظاہر ہے کہ پیدائشی اتفاق وہ کردار پیدا نہیں کر سکتا جو فکری انقلاب کے ذریعہ پیدا ہوتا ہے۔

کھجور کی چپل پہننے والے

موجودہ افغانستان قدیم زمانہ میں سجستان کہا جاتا تھا۔ اس کا دار السلطنت کابل تھا۔ یہاں ایک ترک راجہ کی حکومت تھی۔ وہ بدھ مذہب کو مانتا تھا اور اس کا خاندانی لقب رُتبیل (زَندپیل) تھا۔ یہ علاقہ امیر معاویہ کے زمانہ میں اسلامی خلافت میں شامل ہوا۔ رتبیل نے ابتدءً اسلامی فوجوں سے مقابلہ کیا۔ اس کے بعد اس نے دس لاکھ درہم سالانہ خرچ پر معاہدہ کر کے اپنے لیے امان حاصل کر لی۔ رتبیل ایک مدت تک خراج دیتا رہا۔ اس کے بعد اس نے خراج دینا بند کر دیا۔ اس کے علاقہ پر بار بار فوجیں بھیجی گئیں مگر وہ مطیع نہ ہوا۔

اس سلسلہ میں تاریخوں میں جو واقعات آتے ہیں ان میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ یزید بن عبدالملک اموی (م 105ھ) کے زمانہ میں جب خلافت دمشق کے کچھ نمائندے اس کے پاس خراج طلب کرنے کے لیے پہنچے تو اس نے ان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: ”وہ لوگ کہاں گئے جو پہلے آیا کرتے تھے۔ ان کے پیٹ فاقہ کشوں کی طرح دبے ہوئے تھے۔ پیشانیوں پر سیاہ نشان پڑے رہتے تھے اور وہ کھجوروں کی چپلیں پہنا کرتے تھے“ راوی کا بیان ہے کہ یہ کہہ کر رتبیل نے خراج دینے سے انکار کر دیا اور تقریباً چوتھائی صدی تک وہ اسلامی حکومت سے آزاد رہا۔

صحابہ کے زمانہ کے سیدھے سادھے معمولی لوگ رتبیل کی نظر میں اس سے زیادہ طاقتور تھے جتنا کہ بنوامیہ کے زمانہ میں شان وشوکت والے لوگ۔ اس کی وجہ کیا تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کسی آدمی کی طاقت کا راز اس کے جسم پر دکھائی دینے والی ظاہری رونقیں نہیں ہیں بلکہ اس کی اندرونی صلاحیت ہے۔ یہ اندرونی صلاحیت پہلے کے لوگوں میں بہت زیادہ تھی اگرچہ ظاہری طور پر وہ معمولی حالت میں دکھائی دیتے تھے۔

طاقت ور وہ ہے جس کی ضروریات مختصر ہوں۔ جس کی آرزوئیں محدود ہوں۔ جو لذت اور جاہ کا طالب نہ ہو۔ جس کی تواضع میں تسکین ملتی ہو نہ کہ اپنے کو بڑا بنانے میں۔ ایسا آدمی نفسیاتی پیچیدگیوں سے خالی ہوتا ہے۔ اس کے لیے صحیح فیصلہ کرنے میں کوئی چیز رکاوٹ نہیں بنتی۔ مصلحتوں کا خیال کبھی اس کا قدم نہیں روکتا۔ اپنے مقصد کی خاطر قربانی کی حد تک جانے میں اس کے لیے کوئی چیز حائل نہیں ہوتی۔

اس کے برعکس، جو لوگ مصنوعی چیزوں میں گھرے ہوئے ہوں وہ زندگی کی حقیقی معرفت سے محروم رہتے ہیں۔ غیر ضروری تکلفات ان کے لیے ایسا بندھن بن جاتے ہیں کہ وہ

نہ تو کسی بات کو صحیح رنگ میں دیکھ پاتے اور نہ اس میں اپنے آپ کو واقعی طور پر شامل کر سکتے۔ وہ ذات کے لیے زیادہ اور مقصد کے لیے کم ہو کر رہ جاتے ہیں۔

عزت کیسے ملتی ہے

16 ھ میں مسلمان فوجیں حضرت ابو عبیدہؓ کی قیادت میں شام کو فتح کرتے ہوئے فلسطین تک پہنچ گئیں۔ عیسائی بیت المقدس میں قلعہ بند ہو گئے اور مسلم فوجوں نے اس کو اپنے محاصرہ میں لے لیا۔ اس وقت عیسائیوں کی طرف سے صلح کی پیش کش ہوئی جس میں ایک خاص شرط یہ تھی کہ خلیفہ (عمر فاروقؓ) خود آ کر عہد نامہ کی تکمیل کریں۔ حضرت ابو عبیدہ نے عیسائیوں کی اس پیش کش سے خلیفہ دوم کو مطلع کیا۔ آپ نے اصحاب سے مشورہ کیا اور بالآخر مدینہ سے نکل کر فلسطین کے لیے روانہ ہوئے۔

حضرت عمر فاروق کے ساتھ ایک اونٹ تھا اور ایک خادم۔ جب آپ مدینہ کے باہر پہنچے تو آپ نے خادم سے کہا۔ ہم دو ہیں اور سواری ایک ہے۔ اگر میں سواری پر بیٹھوں اور تم پیدل چلو تو میں تمہارے اوپر ظلم کروں گا۔ اور اگر تم سواری پر بیٹھو اور میں پیدل چلوں تو تم میرے اوپر ظلم کرو گے۔ اگر ہم دونوں اکٹھے سوار ہو جائیں تو ہم جانور کی پیٹھ توڑ ڈالیں گے۔ اس لیے ہم کو چاہیے کہ ہم راستہ کی تین باریاں مقرر کر لیں۔ چنانچہ سارا سفر اس طرح طے ہوا کہ ایک بار عمر فاروق بیٹھتے اور خادم اونٹ کی نکیل پکڑ کر چلتا۔ پھر خادم بیٹھتا اور عمر فاروقؓ اونٹ کی نکیل پکڑ کر چلتے۔ اس کے بعد کچھ دور تک اونٹ خالی چلتا اور دونوں اس کے ساتھ پیدل چل رہے ہوتے۔ اس طرح سارا سفر طے ہوتا رہا۔

حاکم نے روایت کیا ہے کہ اس سفر کے دوران یہ واقعہ پیش آیا کہ جب آپ اسلامی

لشکر سے ملے تو ان لوگوں نے دیکھا کہ آپ ایک تہ بند باندھے ہوئے ہیں اور کسی قسم کا کوئی سامان آپ کے پاس نہیں ہے۔ حضرت ابوعبیدہ (فوج کے افسر اعلیٰ) نے کہا کہ اے امیر المومنین آپ کو عیسائیوں کے فوجی افسروں اور ان کے مذہبی عہدیداروں سے ملنا ہے اور آپ اس حال میں ہیں۔ عمر فاروق نے کہا: اے ابوعبیدہ، کاش یہ بات تمہارے سوا کوئی اور کہتا۔ ہم دنیا میں سب سے پست قوم تھے پھر اللہ نے اسلام کے ذریعہ ہم کو عزت دی۔ جب بھی ہم اس کے سوا کسی اور چیز کے ذریعہ عزت چاہیں گے تو اللہ ہم کو ذلیل کر دے گا: إِنَّا كُنَّا أَذَلَّ قَوْمٍ، فَأَعَزَّنَا اللّٰهُ بِالْإِسْلَامِ، فَمَهْمَا نَطْلُبِ الْعِزَّ بِغَيْرِ مَا أَعَزَّنَا اللّٰهُ بِهِ، أَذَلَّنَا اللّٰهُ (مستدرک الحاکم، حدیث نمبر 207)۔

عزت اور ذلت کو اللہ کی طرف سے سمجھنا ایک ایسا عقیدہ ہے جو آدمی کو بغیر کسی ہتھیار کے ہتھیار والا بنا دیتا ہے۔ یہ عقیدہ آدمی کو ایک ایسی خود اعتمادی سکھاتا ہے جو کسی خارجی سہارے کے بغیر اپنی اندرونی طاقت کے اوپر قائم ہوتی ہے اس کا خزانہ آدمی کے اندر ہوتا ہے نہ کہ اس کے باہر اور جس طاقت کی بنیاد اندرونی جذبہ پر ہو اس کو کوئی چھیننے والا کبھی چھین نہیں سکتا۔

ایک دعا

عمرو بن بحر بن محبوب الکنانی (255-163ھ) بصرہ میں پیدا ہوئے اور وہیں انتقال کیا۔ وہ عام طور پر الجاحظ کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کا شمار عربی ادب کے ائمہ میں ہوتا ہے۔ مطالعہ کے اتنے زیادہ حریص تھے کہ آخر عمر میں جب مفلوج ہو کر مرے تو ان کے سینہ پر کتاب رکھی ہوئی تھی۔ ان کی ایک کتاب "البیان والتبیین" ہے۔ اس کتاب کے مقدمہ

میں انہوں نے یہ دعا لکھی ہے: اللّٰھُمّ إنّا نعُوذُ بِكَ مِنْ فِتْنَةِ الْقَوْلِ، كَمَا نعُوذُ بِكَ مِنْ فِتْنَةِ الْعَمَلِ، وَنَعُوذُ بِكَ مِنَ التّكَلُّفِ لِمَا لَا نُحْسِنُ، كَمَا نَعُوذُ بِكَ مِنَ الْعُجْبِ بِمَا نُحْسِنُ، وَنَعُوذُ بِكَ مِنَ السّلَاطَةِ وَالْهَذَرِ، كَمَا نَعُوذُ بِكَ مِنَ الْعِيِّ وَالْحَصَرِ (البیان والتبیین، جلد 1، صفحہ 27)۔ اے اللہ، ہم تجھ سے قول کے فتنہ سے اسی طرح پناہ مانگتے ہیں جس طرح ہم تجھ سے عمل کے فتنہ سے پناہ مانگتے ہیں۔ اور ہم تجھ سے اس کام کا بار اٹھانے سے پناہ مانگتے ہیں جس کو ہم بخوبی نہیں کر سکتے اور اسی طرح اس کام پر گھمنڈ سے پناہ مانگتے ہیں جس کو ہم بخوبی کر سکتے ہیں۔ اور ہم تجھ سے زباں درازی اور لغو بات سے پناہ مانگتے ہیں جس طرح ہم تجھ سے کلام پر قادر نہ ہونے اور گفتگو میں عاجز ہو جانے سے پناہ مانگتے ہیں۔

یہ دنیا آزمائش کی جگہ ہے۔ یہاں ہر چیز کے ساتھ کوئی نہ کوئی آزمائش کا پہلو لگا ہوا ہے۔ اس لیے وہ شخص جو خدا کی پکڑ سے ڈرتا ہو، اس کو ہر معاملہ میں خدا سے پناہ مانگنا چاہیے اور ہر معاملہ میں خدا کی مدد کا طالب ہونا چاہیے۔

اس دنیا کا اصل امتحان یہ نہیں ہے کہ آدمی نے کیا پایا اور کیا کھویا۔ یہاں اصل امتحان یہ ہے کہ کھونے یا پانے کے موقع پر اس نے کیا ردّعمل (response) پیش کیا۔ اس کو قول کے معاملہ میں بھی اتنا ہی محتاط ہونا چاہیے جتنا کوئی شخص عمل کے معاملہ میں محتاط ہوتا ہے۔ اس کو اپنے کیے کو بھی اسی خانہ میں ڈالنا چاہیے جس خانہ میں وہ اپنے نہ کیے کو ڈالتا ہے۔ اس کو قدرت کے موقع پر اسی طرح عبدیت کا ثبوت دینا چاہیے جس طرح عجز کے موقع پر عبدیت کا ثبوت دیا جاتا ہے۔

اس دنیا میں کامیابی بھی آزمائش ہے اور ناکامی بھی آزمائش۔ یہاں عمل بھی جانچ کا لمحہ ہے اور بےعملی بھی جانچ کا لمحہ۔

خاموش تدبیر

الطاف حسین حالی (1837-1914) اصلاحی شاعری کو پسند کرتے تھے۔ اس اعتبار سے انہوں نے قدیم اردو شاعری کا جائزہ لیا تو وہ انہیں نہایت بے معنی نظر آئی۔ انہوں نے پایا کہ قدیم اردو شاعری میں مبالغہ ہے۔ حسن و عاشقی کی داستان ہے۔ فرضی خیال آرائی ہے۔ حالی نے اس شاعری پر سخت تنقید کی اور اس کے بجائے بامقصد شاعری کی وکالت کی۔

یہ تنقید ان لوگوں کو بہت ناگوار ہوئی جو قدیم اردو شاعری کو اپنے لیے فخر کا سرمایہ بنائے ہوئے تھے۔ ان کو برداشت نہیں ہوا کہ ایک شخص ان کے پرفخر اثاثہ کو بے قیمت بتائے۔ چنانچہ وہ حالی کے دشمن ہو گئے۔ ان لوگوں نے حالی کے خلاف نہایت غیر سنجیدہ قسم کے مخالفانہ مضامین چھاپنے شروع کیے۔ حالی نے اس لغو طوفان کے جواب میں خاموشی اختیار کر لی۔ اس پر اودھ پنچ (لکھنؤ) نے ایک فاتحانہ نظم شائع کی۔ اس کا ایک شعر یہ تھا:

ابتر ہمارے حملوں سے حالی کا حال ہے
میدان پانی پت کی طرح پائمال ہے

مخالفت برائے مخالفت کا یہ طوفان مکمل طور پر یک طرفہ تھا۔ اس لیے وہ بہت زیادہ دیر تک جاری نہیں رہ سکتا تھا۔ چنانچہ کچھ دنوں کے بعد مخالفین خاموش ہو گئے۔ حالی سے کسی نے پوچھا کہ آپ کے مخالفین کیسے چپ ہو گئے۔ وہ تو بظاہر چپ ہونے والے نظر نہیں آتے تھے۔ حالی نے اس کے جواب میں ایک نظم لکھی۔ اس کا ایک شعر یہ تھا:

کیا پوچھتے ہو کیونکر سب نکتہ چیں ہوئے چپ
سب کچھ کہا انہوں نے پر ہم نے دم نہ مارا

کوئی شخص سنجیدہ اختلاف اور علمی تنقید کرے تو وہ بلاشبہ قابل غور ہوتی ہے۔ اگر وہ درست ہے تو اس کو مان لینا چاہیے اور اگر اس کے اندر استدلالی نقص ہے تو دلائل کے ساتھ اس کی غلطی کا تجزیہ کرنا چاہیے۔

مگر مخالفت برائے مخالفت ہو، جو علمیت اور سنجیدگی سے خالی ہو، جس کی بنیاد حقائق کے بجائے الزام تراشی اور عیب جوئی پر ہو، ایسی مخالفت کا بہترین جواب خاموشی ہے۔ ایسے لوگوں کا جواب دینا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص چیختے ہوئے گدھے کے سامنے اغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ (31:19) کا وعظ کہنے لگے، یعنی اپنی آواز کو پست رکھو۔

زبان کی طاقت

المتنبی (303-345ھ) مشہور عرب شاعر ہے۔ وہ کوفہ میں پیدا ہوا۔ اور بغداد میں اس کی وفات ہوئی۔ اس کا ایک شعر ہے جس میں وہ کہتا ہے کہ تمہارے پاس اگر گھوڑا اور مال نہیں ہے جس کو تم اپنے محبوب کو ہدیہ کرسکو، تو تمہیں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ تمہارا حال اگر تمہارا ساتھ نہیں دیتا تو تمہاری گویائی تمہارا ساتھ دے گی:

لَا خَيْلَ عِندَكَ تُهْدِيهَا وَلَا مَالُ،
فَلْيُسْعِدِ النُّطْقُ إِنْ لَمْ تُسْعِدِ الْحَالُ

گویائی (نطق) اللہ تعالیٰ کی بڑی عجیب نعمت ہے۔ یہ انسان کے پاس ایک ایسی طاقت ہے جو ہر دوسری طاقت پر بھاری ثابت ہوتی ہے، بشرطیکہ اس کو صحیح طور پر استعمال کیا جائے۔ یہ دولت سے زیادہ قیمتی ہے اور ہتھیار سے زیادہ موثر۔ اس کے ذریعہ مفتوح اپنے فاتح کو جھکا سکتا ہے اور مغلوب اپنے غالب کو زیر کرلیتا ہے۔

حافظ حامد حسن علوی (1872-1959) نہایت ذہین آدمی تھے۔ گفتگو میں کوئی شخص ان کے مقابلہ میں ٹک نہیں سکتا تھا۔ اسی کے ساتھ وہ پر جلال شخصیت کے مالک تھے۔ انہوں نے بتایا کہ زندگی میں صرف ایک بار ایسا ہوا ہے کہ میں کسی شخص کے مقابلہ میں بالکل لاجواب ہوگیا۔ اس کا ایک فقرہ میری ساری ذہانت پر بھاری ثابت ہوگیا اور میرے لیے چپ ہوجانے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔

حافظ حامد حسن علوی کچھ معزز لوگوں سے گفتگو میں مصروف تھے۔ اتنے میں ایک فقیر عورت آگئی۔ اس نے کہا "بابا کچھ دیدے"۔ وہ لوگ متوجہ نہیں ہوئے تو عورت نے اپنے سوال کو کئی بار دہرایا۔ حافظ صاحب مرحوم کو عورت کا بار بار سوال کرنا گفتگو میں بے جا مداخلت محسوس ہوا۔ انہوں نے کسی قدر خفگی کے ساتھ کہا: بہت بیوقوف ہے۔ اس کے بعد عورت نے کہا: "ہاں بابا، غریب بیوقوف ہی ہوتا ہے"۔ یہ کہہ کر عورت چلی گئی۔ حافظ صاحب مرحوم اس کے جملہ کی تاب نہ لا کر خاموش ہوگئے۔ اس کے بعد وہ اس مجلس میں کچھ بول نہ سکے۔ بعد کو انہوں نے کہا: اب تک کوئی شخص مجھے لاجواب نہ کرسکا، اس غریب عورت نے مجھے لاجواب کردیا۔

آپ کے پاس اگر کچھ نہ ہو، تب بھی آپ کے پاس ایک چیز ہے۔ اور وہ خدا کی دی ہوئی قوت گویائی ہے، اپنی گویائی کو استعمال کیجیے۔ اس بے کچھ سے آپ اپنے لیے سب کچھ پاسکتے ہیں۔

حاضر جوابی

مولانا سعید احمد خان سلطان پوری، جمعیۃ علما ہند کے آرگنائزر تھے۔ لوگ انہیں ازراہِ محبت "دادا" کہا کرتے تھے۔ 20 جنوری 1989ء کو اپنے وطن سلطان پور میں ان کا انتقال ہوگیا۔ بوقت انتقال ان کی عمر تقریباً 70 سال تھی۔

وہ نہایت حاضر جواب آدمی تھے۔ ایک بار کا قصہ ہے۔ وہ مسجد عبد النبی (نئی دہلی) میں ایک مجلس کے درمیان بیٹھے ہوئے تھے۔ اتنے میں ایک خوش پوش، بلند قامت آدمی آ کر سامنے کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے تیز و تند لہجہ میں کہا کہ آپ کے دفتر کے کارکن نہایت بدتمیز ہیں۔ وہ ہم جیسے لوگوں کا احترام نہیں کرتے۔ اس کے بعد جو گفتگو ہوئی وہ حسب ذیل تھی:

مولانا سعید احمد : آپ کون صاحب ہیں۔

نو وارد : مجھ کو آپ نہیں جانتے، میں پنجاب کا رہنے والا ہوں۔

مولانا سعید احمد : جی ہاں، نہیں جانتا۔ اسی لیے تو پوچھ رہا ہوں۔

نو وارد : میں اس زمانہ کا نبی ہوں، اور...

مولانا سعید احمد : اگر تم نبی ہو تو میں تمہارا خدا ہوں تم کو حکم دیتا ہوں کہ تم فوراً یہاں سے نکل جاؤ۔

اپنے موقع کے لحاظ سے یہ بلا شبہ بہترین جواب تھا۔ بعض مواقع پر علمی اور منطقی جواب زیادہ کارآمد ہوتا ہے۔ مگر بعض مواقع ایسے ہیں جہاں جواب کا وہ انداز زیادہ کارآمد ہے جس کی ایک مثال مذکورہ گفتگو میں نظر آتی ہے۔

اسی کو عام زبان میں حاضر جوابی کہتے ہیں۔ حاضر جوابی ایک اعلیٰ انسانی صلاحیت ہے۔ تاہم استعمال کے اعتبار سے اس کی دو الگ الگ قسمیں ہیں۔ ایک یہ کہ اس خداداد صلاحیت کو باطل کے توڑ کے لیے استعمال کیا جائے جس کی ایک مثال اوپر کا واقعہ ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ آدمی اس صلاحیت کو لوگوں کا مذاق اڑانے کے لیے استعمال کرے۔ اس کا پہلا استعمال بلا شبہ مطلوب ہے، اور اس کا دوسرا استعمال بلا شبہ غیر مطلوب ہے۔

اعلیٰ کردار کی ایک مثال

مشرقی بنگال مسلم دورحکومت میں دہلی کی مرکزی سلطنت کے ماتحت تھا۔ درمیان میں کئی بار ایسا ہوا کہ وہاں کا گورنر مرکز سے باغی ہو کر خود بادشاہ بن بیٹھا۔ انہیں میں سے ایک سلطان غیاث الدین (حکومت: 1390-1411) ہے جس نے دہلی کی مرکزی سلطنت سے بغاوت کر کے مشرقی بنگال میں خودمختار حکومت قائم کر لی تھی۔ اس زمانہ میں ڈھاکہ کا شہر وجود میں نہ آیا تھا اور حکومت کا مستقر سونار گاؤں تھا۔ اس مسلمان بادشاہ کا ایک واقعہ ایک انگریز مورخ ایف بی بریڈلے برٹ (Bradley Birt) نے نقل کیا ہے۔ اس کی کتاب DACCA: The Romance of an Eastern Capital کے دوسرے اڈیشن مطبوعہ لندن 1914 میں یہ واقعہ اس طرح درج ہے:

"ایک دن شاہ غیاث الدین تیراندازی کی مشق کر رہا تھا۔ اتفاق سے اس کے تیر سے ایک بیوہ عورت کا اکلوتا لڑکا زخمی ہو گیا۔ بیوہ عورت کو معلوم نہ تھا کہ یہ تیر بادشاہ نے چلایا ہے۔ وہ قاضی شرع کے پاس فریاد لے کر گئی۔ قاضی نے اپنی فراست سے اندازہ لگایا کہ یہ تیر بادشاہ کا ہی چلایا ہوا تھا۔ وہ دیر تک مذبذب رہا کہ بادشاہ کے خوف اور خوف خدا میں سے کس کو ترجیح دوں۔ بالآخر خدا کا خوف قاضی صاحب پر غالب آیا اور انہوں نے بادشاہ کو جواب دہی کے لیے اپنی عدالت میں طلب کیا۔ بادشاہ کو جونہی بلاوا پہنچا وہ بلا کسی تامل کے قاضی کی عدالت کی طرف روانہ ہوا۔ لیکن اس نے اپنے کپڑوں میں ایک چھوٹی سی تلوار بھی چھپا لی۔ قاضی صاحب نے عدالت میں بادشاہ کا کسی قسم کا احترام نہیں کیا۔ اور معاملہ کی جانچ کے بعد حکم دیا کہ وہ اس بیوہ عورت کو معقول مالی معاوضہ دے کر اس سے اپنا قصور معاف کرائے۔ بادشاہ نے بے چون و چرا اس حکم کی تعمیل کی

اور بیوہ عورت کو ایک بڑی رقم پیش کر کے اس سے اپنا قصور معاف کرایا۔ مقدمہ ختم ہونے کے بعد قاضی صاحب اپنی کرسی عدالت سے اٹھ کر بادشاہ کے قدموں پر گر پڑے۔ بادشاہ نے فوراً انہیں اٹھایا اور وہ تلوار ان کو دکھائی جو وہ اپنے کپڑوں میں چھپائے ہوئے تھا اور کہا کہ یہ تلوار میں اس لیے لایا تھا کہ اگر تم میرے اس مقدمہ میں شریعت کے حکم سے ذرا بھی روگردانی کرو گے تو میں تمہارا سر اڑا دوں گا۔ لیکن تم نے شرع کے مطابق فیصلہ صادر کرنے میں میرا کوئی خوف نہیں کیا اس کے لیے تم انتہائی اعزاز کے مستحق ہو (صفحہ 55-56)۔

شریعت کی پابندی کی یہ مثال قائم کرنے والے بادشاہ کا مقبرہ اس کتاب کی اشاعت کے وقت تک سونارگاؤں میں موجود تھا (صدق جدید 2 مئی 1980ء)۔

کسی قوم کی ترقی کا راز یہ ہے کہ اس کے اندر اس قسم کے زندہ افراد موجود ہوں۔ زندہ افراد کی موجودگی سے قوم زندہ ہوتی ہے اور زندہ افراد نہ ہونے سے قوم مر جاتی ہے۔ زندہ آدمی وہ ہے جو مصلحت کے مقابلہ میں اصول کو اہمیت دیتا ہو۔ جو اپنی غلطی پر عذرات اور توجیہات کا پردہ ڈالنے کے بجائے اس کو مان لیتا ہو، جو ذاتی شکایت کو نظر انداز کر دے، نہ کہ اس کی بنا پر کسی کو اپنا دشمن سمجھ لے۔ جو اس وقت بھی ایک انسان کی قدر کر سکے جب کہ اس نے اس کے خلاف کارروائی کی ہو۔

حوصلہ مندی

اصمعی دوسری صدی ہجری کا مشہور لغوی عالم ہے۔ اس کو عربی الفاظ کا لغت جمع کرتے ہوئے ''دَمدَمَ'' کے معنی کی تلاش ہوئی۔ یہ لفظ قرآن میں بھی استعمال ہوا ہے: فَدَمۡدَمَ عَلَيۡهِمۡ رَبُّهُمۡ بِذَنۡۢبِهِمۡ فَسَوّٰاهَا (91:14)۔ یعنی، پھر ان کے رب نے ان کے گناہ کے

سبب ان پر ہلاکت نازل کی، پھر سب کو برابر کر دیا۔

اصمعی یہ جاننا چاہتا تھا کہ اس لفظ کا خاص مفہوم کیا ہے اور عرب اس کو کس موقع پر استعمال کرتے ہیں۔ وہ ایسا کر سکتا تھا کہ کسی بدو کو پکڑتا اور اس سے پوچھتا کہ تم لوگ دَمدَمَ کا لفظ کس موقع پر بولتے ہو۔ مگر وہ جو کچھ بتاتا وہ اصمعی کو خود بھی معلوم تھا۔ اصمعی کو تو اصل میں یہ جاننا تھا کہ وہ کون سا موقع ہے جب کہ ایک عرب بے ساختہ طور پر یہ لفظ بول پڑتا ہے۔ اور یہ بات پوچھ کر جانی نہیں جاسکتی۔ وہ تو صرف اس طرح جانی جاسکتی ہے کہ فطری حالات میں ایسا کوئی لمحہ آئے جبکہ ایک عرب یہ لفظ بولے اور وہاں وہ سننے کے لیے موجود ہو۔

اس مقصد کے لیے اصمعی ایک خانہ بدوش عرب خاندان کے ساتھ لگ گیا۔ وہ خاندان جہاں جاتا اصمعی بھی اس کے ساتھ ہوتا اور ہر وقت اس انتظار میں رہتا کہ کب وہ موقع آئے جب کہ عرب بدو بے ساختہ طور پر یہ لفظ بول پڑے۔ وہ یہاں وہاں پھرتا رہا۔ یہاں تک کہ اسی میں تقریباً چھ ماہ گزر گئے اور بدو کی زبان سے دَمدَمَ کا لفظ اس کو سننے کو نہ ملا۔ آخر ایک روز ایسا ہوا کہ بدو نے ایک مقام پر اپنا خیمہ گاڑ رکھا تھا۔ خیمہ کے اندر سالن کی ہانڈی آگ پر چڑھی ہوئی تھی، بدو مرد خیمہ کے اندر تھا اور اس کی عورت خیمہ کے باہر کوئی کام کر رہی تھی۔ پکتے پکتے ہانڈی نقطہ جوش پر آئی اور اس میں ابال آ گیا۔ عرب بدو نے یہ دیکھ کر اپنی بیوی کو خبردار کرنے کے لیے بآواز بلند کہا: دَمدَمت (ہانڈی ابل گئی)۔ اصمعی نے یہ سنا تو چلاتے ہوئے خیمہ سے نکل پڑا: واللہ وجدت واللہِ وجدتُ۔ یعنی، خدا کی قسم میں پا گیا، خدا کی قسم میں پا گیا۔

اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کون سا شوق اور حوصلہ مندی تھی جس کی وجہ سے دور اول کے مسلمانوں نے بڑے بڑے کارنامے انجام دیے۔ یہ تھا فائدہ اور شہرت کی چاشنی

کے بغیر صرف مقصد کی خاطر محنتیں کرنا۔ موجودہ زمانہ میں بھی بے شمار سرگرمیاں جاری ہیں، مگر وہ سب بے نتیجہ ہوتی جا رہی ہیں۔ کیونکہ آج کا آدمی صرف وہاں سرگرم ہوتا ہے جہاں ذاتی فائدہ یا ذاتی شہرت ومقبولیت کی چاشنی ہو۔ صرف مقصد کی خاطر متحرک ہونا کوئی نہیں جانتا۔

جس قوم کے افراد میں اس قسم کا شوق اور حوصلہ ہو وہی قومیں آگے بڑھتی ہیں۔ ابتدائی دور میں مسلمانوں کے اندر یہی بلند حوصلگی تھی جس کی وجہ سے مسلمان اس زمانہ میں دنیا کے سب سے طاقت ور گروہ بن گئے۔ موجودہ زمانہ میں سطحیت اور خود پسندی اتنی بڑھ گئی ہے کہ کوئی اس قسم کی "بے فائدہ" محنت میں اپنا وقت ضائع کرنا پسند نہیں کرتا۔ اور بلا شبہ یہی اخلاقی زوال موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی پستی کی سب سے بڑی وجہ ہے۔

عام انسان کو یا خوف متحرک کرتا ہے یا خود غرضی۔ مگر ایسے لوگ کوئی تاریخ نہیں بناتے۔ تاریخ صرف وہ لوگ بناتے ہیں جو حوصلہ اور مقصد کی خاطر متحرک ہونا جانتے ہوں۔

کامیاب مقابلہ

مولانا ثناء اللہ امرتسری (1948-1868ء) اپنے وقت کے مشہور مناظر تھے۔ ایک بار دہلی میں ان کا مناظرہ آریہ سماج کے ایک ہندو عالم سے ہوا۔ اس زمانہ میں مولانا ثناء اللہ کے ایک مخالف نے ان کے بارے میں ایک اشتہار شائع کیا تھا۔ اس اشتہار میں مولانا ثناء اللہ کی طرف کچھ ایسی باتیں منسوب کی گئی تھیں جس سے ان کا اسلام ہی مشکوک قرار پا رہا تھا۔

یہ اشتہار آریہ سماجی مناظر کو مل گیا۔ وہ عربی اور فارسی زبانیں جانتا تھا اور عقیدہ اور عمل کے بارے میں علما اسلام کے اختلافی مسائل سے بخوبی آگاہ تھا۔ اس نے مذکورہ اشتہار کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ دونوں فریق جب مناظرہ کے اسٹیج پر آئے تو آریہ سماجی

مناظر نے پہلا کام یہ کیا کہ وہ اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس کے ہاتھ میں مذکورہ اشتہار تھا۔ اس اشتہار کو اس نے مجمع کے سامنے لہراتے ہوئے کہا:

حضرت، میں تو یہاں کسی مسلمان عالم دین سے مناظرہ کرنے کے لیے آیا ہوں۔ مگر مولانا ثناء اللہ امرتسری اس صف میں شامل نہیں۔ مولانا صاحب ایک انسان کی حیثیت سے میرے لیے قابل احترام ہیں۔ لیکن اس اشتہار کو دیکھیے۔ اس کے مطابق خود اسلامی جماعت کے لوگ ان کے اسلام کو تسلیم نہیں کرتے۔ پھر میں کیسے انہیں مسلمان سمجھوں اور اسلام کے بارے میں ان سے مناظرہ کروں۔

مولانا ثناء اللہ امرتسری نے اس پر کسی منفی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ وہ اطمینان کے ساتھ مسکراتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھے اور کہا۔ حضرات، میرے دوست نے ٹھیک کہا۔ مگر آپ سب جانتے ہیں کہ اسلام میں داخل ہونے کے لیے کلمہ شہادت پڑھنا کافی ہے۔ کلمہ پڑھ کر اسلام میں داخل ہوا جاتا ہے۔ میں آپ تمام حاضرین کو گواہ بنا کر آپ کے سامنے کلمہ شہادت پڑھتا ہوں اور اسلام قبول کرتا ہوں۔ أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ۔ اب تو میرے اسلام میں کوئی شک نہیں رہا۔ آیئے، اب مناظرہ کیجیے۔

مولانا ثناء اللہ امرتسری اگر اشتہار کے مضمون پر کلام کرتے اور اپنے آپ کو مسلمان ثابت کرنے لگتے تو بات کبھی ختم نہ ہوتی۔ وہ عقیدہ و عمل کی پیچیدہ بحثوں میں الجھ کر رہ جاتے۔ ہندو مناظر اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا۔ مگر مذکورہ انداز اختیار کر کے انہوں نے ایک منٹ میں سارا مسئلہ ختم کر دیا۔

مثبت اثر

مشہور نحوی سیبویہ (م 177ھ) ایران میں پیدا ہوا اور بصرہ میں پرورش پائی۔ اس کی نوجوانی کا واقعہ ہے جب کہ وہ حدیث وفقہ کا طالب علم تھا۔ ایک دن وہ حماد بن سلمہ (وفات 168ھ) کی مجلس میں تھا۔ انہوں نے ایک حدیث کا املا کراتے ہوئے کہا: ليس من اصحابي احد الالو شئت لاتخذت عليه، ليس ابوالدرداء سیبویہ یہ سن کر بول اٹھا: ليس ابو الدرداء۔ اس پر حماد نے چلا کر کہا: سیبویہ تم غلطی پر ہو۔ یہ استثناء ہے (اس لیے "ابو" کے بجائے "ابا" ہے) سیبویہ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس نے اپنے جی میں کہا کہ میری نحو کمزور ہے اور مجھے اس میں مہارت پیدا کرنی چاہیے۔ اب اس نے نحو سیکھنا شروع کر دیا۔ وہ بصرہ و کوفہ کے نحوی علما، یونس بن حبیب (وفات: 183ھ) اور عیسی بن عمر (وفات: 149ھ) کی مجلسوں میں جانے لگا (طبقات النحويين واللغويين للزبیدی، صفحہ 66)۔

اس نے اس فن میں اتنی محنت کی کہ بالآخر وہ اس کا امام بن گیا۔ نحو و ادب کے شاذ مسائل میں اس کا کوئی ثانی نہ رہا۔ اس کے بعد اس نے نحو پر ایک ایسی کتاب لکھی جو اپنی اہمیت اور بلندی کی وجہ سے "الکتاب" کے نام سے مشہور ہے۔ اس فن کے علما کا کہنا ہے کہ فن نحو پر اس کے برابر کی کوئی کتاب آج تک لکھی نہ جا سکی — جس شخص کی نحو کمزور تھی، وہ تاریخ کا سب سے بڑا نحوی بن گیا۔

ہر شخص کی زندگی میں ایسے واقعات آتے ہیں جب کہ اسے ٹھیس لگتی ہے۔ جب اس کو دوسروں کی طرف سے بے اعترافی کی ذلت اٹھانی پڑتی ہے۔ جب وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان بے جگہ ہو گیا ہے۔

ایسے مواقع پر اثر لینے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی ان تجربات کے بعد بے ہمتی

اور احساس کمتری میں مبتلا ہو جائے۔ ایسے آدمی نے گویا اپنے آپ اپنے کو مار لیا۔ دوسرا شخص وہ ہے جس کے لیے ایسا تجربہ ایک مہمیز بن جائے۔ ایسے آدمی کے لیے اس کا تجربہ اس کی صلاحیتوں کو جگانے کا باعث بن جاتا ہے۔ وہ از سر نو محنت اور عمل کے رخ پر چل پڑتا ہے، یہاں تک کہ ماضی کا ناکام انسان مستقبل کا کامیاب انسان بن جاتا ہے۔ مثبت تاثر آدمی کو کامیابی کی طرف لے جاتا ہے اور منفی تاثر ناکامی اور بربادی کی طرف۔

صرف الفاظ سے

امام حسن بصری (م 110ھ) اور حجاج بن یوسف (م 95ھ) کا زمانہ ایک ہی تھا۔ حسن بصری کی صاف گوئی حجاج کو بہت تکلیف پہنچاتی تھی۔ اس نے طے کیا کہ حسن بصری کو قتل کرادے۔ چنانچہ اس نے حسن بصری کو اپنے دربار میں بلایا۔ اس نے طے کرلیا تھا کہ ان کو زندہ واپس نہیں جانے دے گا۔ میمون بن مہران بتاتے ہیں کہ حسن بصری جب دربار میں داخل ہوئے اور حجاج کے سامنے کھڑے ہوئے تو یہ گفتگو ہوئی: حسن بصری نے کہا اے حجاج، تمہارے اور آدم کے درمیان کتنے باپ ہیں۔ حجاج نے جواب دیا کہ بہت۔ حسن بصری نے کہا کہ اب وہ کہاں ہیں۔ حجاج نے کہا کہ وہ مر گئے۔ حسن بصری کا مطلب یہ تھا کہ جہاں تم مجھ کو پہنچانا چاہتے ہو اسی راستہ پر تم خود بھی تیزی سے جا رہے ہو۔ حجاج اگرچہ ایک ظالم حکمراں تھا۔ مگر یہ الفاظ سن کر اس نے سر جھکا لیا۔ اس کے بعد حسن بصری محفوظ حالت میں دربار سے باہر نکل آئے: فلمّا دخَلَ عليه فقام بين يَدَيْهِ، فقال: يا حَجّاجُ، كم بينكَ وبين آدَمَ من أَبٍ؟ قال: كَثِيْر، قال: فأين هُم؟ قال: ماتُوا، قال: فنكّسَ الحَجّاجُ رأسَهُ، وخَرَجَ الحَسَنُ (حلیۃ الاولیاء للاصفہانی، جلد 4، صفحہ 88)۔

اِس پل پر یا اُس پل پر

ملک شاہ سلجوقی کی شاہی (حکومت 1092-1072) سواری ایک روز ایک پل سے گزر رہی تھی۔ ایک بڑھیا وہاں آ کر کھڑی ہوگئی۔ بادشاہ اس کے قریب پہنچا تو بڑھیا نے پکار کر کہا: اے بادشاہ بتا میرا اور تیرا انصاف اس پل پر ہوگا یا اس پل (صراط) پر۔ ملک شاہ پر اس جملہ کا بے حد اثر ہوا۔ وہ گھبرا کر سواری سے اتر پڑا اور کہا: ماں، اُس پل پر کس کی ہمت ہے کہ کھڑا ہو سکے۔ بہتر ہے کہ میرا اور تمہارا حساب اسی پل پر ہو جائے۔ اس کے بعد بڑھیا نے بتایا کہ سپاہیوں نے اس کی گائے پکڑ کر ذبح کر دی ہے، میں تم سے اس ظلم کا انصاف چاہتی ہوں۔ ملک شاہ سلجوقی وہیں ٹھہر گیا اور معاملہ کی تحقیق شروع کر دی۔ جب ثابت ہو گیا کہ بڑھیا کی شکایت صحیح ہے تو اس نے اسی وقت مجرموں کو سزا دی۔ اس کے بعد اس نے بڑھیا سے معافی مانگی اور گائے کی اصل قیمت سے بہت زیادہ معاوضہ دے کر بڑھیا کو راضی کیا۔

کتے سے بھی زیادہ برا

تاتاری جب بغداد کی سلطنت پر غالب آ گئے تو ان کے اندر احساس برتری پیدا ہو گیا۔ وہ اپنے آپ کو مسلمانوں سے بہت اونچا سمجھنے لگے۔ ایک تاتاری شہزادہ ایک بار گھوڑے پر سوار ہو کر شکار کے لیے جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ اس کا کتا بھی تھا۔ راستہ میں ایک مسلمان بزرگ ملے۔ اس نے مسلمان بزرگ کو اپنے پاس بلایا اور کہا: ”تم اچھے ہو یا میرا کتا“ مسلمان بزرگ نے اطمینان کے ساتھ جواب دیا: اگر میرا خاتمہ ایمان پر ہو تو میں اچھا ورنہ تمہارا کتا اچھا“۔ یہ جملہ اس وقت اتنا موثر ثابت ہوا کہ تاتاری شہزادہ کا دل ہل گیا۔ وہ اس ”ایمان“ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے لگا جس پر آدمی کا خاتمہ نہ ہو تو وہ کتے سے بدتر ہو جاتا ہے۔ اس تلاش کا نتیجہ یہ ہوا کہ بالآخر وہ مسلمان ہو گیا۔

غریبی کا مطلب بے وقوفی نہیں

کچھ معزز لوگ ایک مقام پر بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے اتنے میں ایک بھکاری عورت آئی۔ اس نے سوال کیا مگر کسی نے اس کو جواب نہ دیا۔ اس نے پھر اپنا سوال دہرایا۔ اب بھی کسی نے اس کو جواب دینے کی ضرورت نہ سمجھی، لوگوں کا خیال تھا کہ وہ اس سے زیادہ ضروری گفتگو میں مصروف ہیں کہ ایک بھکاری عورت کا جواب دیں۔ بھکاری عورت اس کے باوجود بار بار اپنے سوال کو دہراتی رہی۔ مجلس میں ایک معزز بزرگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کو اس مسلسل مداخلت پر غصہ آ گیا۔ انہوں نے سخت لہجہ میں کہا: "بڑی بے وقوف معلوم ہوتی ہے" عورت نے یہ سنا تو بولی: "بابا غریب آدمی بے وقوف ہی ہوتے ہیں" یہ کہا اور چلی گئی۔ اس واقعہ کے بعد مذکورہ بزرگ اکثر کہا کرتے تھے: "اس بھکاری عورت نے مجھ کو جو جواب دیا اس سے زیادہ سخت جواب مجھ کو ساری زندگی میں کسی نے نہیں دیا"۔

غم آدمی کو گہرا بنا دیتا ہے

اسی طرح ایک مجلس تھی۔ عمدہ قالین پر کچھ خوش پوش اور معزز افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ اتنے میں ایک آدمی پھٹے حال آیا۔ وہ بلا اجازت مجلس میں بیٹھ گیا۔ ایک صاحب نے اس کو منع کیا کہ یہاں مت بیٹھو۔ بار بار منع کرنے کے بعد بھی جب وہ نہ مانا تو انہوں نے اس کو پکڑ کر مجلس سے اٹھا دیا اور کہا "جا اپنا کام کر"۔ وہ اٹھا اور یہ کہتا ہوا چلا گیا: "ایک ہی راستہ سے آئے ہیں، ایک ہی راستہ سے جائیں گے دونوں"۔ آدمی کا یہ جملہ اتنا موثر ثابت ہوا کہ اس کے بعد مجلس کا رنگ بدل گیا۔ لوگ خاموش ہو گئے اور تھوڑی دیر بعد اٹھ اٹھ کر چلے گئے۔

کبھی آدمی کی زبان سے ایک جملہ نکلتا ہے مگر وہ جملہ محض کچھ الفاظ کا مجموعہ نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ سننے والے کے دل میں برچھی کی طرح چبھتا ہے۔ وہ آدمی کو تیر اور تلوار کے بغیر ذبح کر دیتا ہے۔ مگر برچھی کی مانند چبھنے والے جملے صرف انہیں لوگوں کی زبان سے نکلتے ہیں، جو اس سے پہلے اپنے سینہ میں برچھی چبھا چکے ہوں۔

تنقید کو سن کر

خلیفہ ہارون الرشید (193-170 ھ) نے ایک بار اپنے وزیر سے کہا کہ مجھ کو کسی بزرگ کے پاس لے چلو۔ وہ خلیفہ کو الفضیل بن عیاض (187-105 ھ) کے پاس لے گیا۔ اس سلسلہ میں لمبا قصّہ کتابوں میں نقل ہوا ہے۔

خلیفہ کے ساتھ اس کے کئی درباری تھے۔ انہوں نے فضیل سے مصافحہ کیا۔ خلیفہ نے بھی مصافحہ کیا۔ خلیفہ نے اپنا ہاتھ جب فضیل کے ہاتھ میں رکھا تو انہوں نے کہا کہ کتنا زیادہ نرم ہے یہ ہاتھ، اگر کل کے دن وہ اللہ کے عذاب سے بھی بچ جائے: یَا لَهَا مِنْ كَفٍّ مَا أَلْيَنَهَا إِنْ نَجَتْ غَدًا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ۔

اس کے بعد خلیفہ نے فُضیل سے کہا کہ کچھ نصیحت کیجیے۔ انہوں نے تلخ نصیحت کے انداز میں کچھ کلمات کہے۔ خلیفہ نے کہا کہ اور کچھ فرمائیے۔ فضیل نے مزید کچھ کہا۔ اس طرح وہ سخت تنقیدی انداز میں دیر تک خلیفہ کو ڈرانے والی باتیں کرتے رہے۔ خلیفہ ان کی نصیحتوں کو سن کر رو پڑا۔ آخر میں اس نے اپنے وزیر سے کہا کہ جب تم مجھ کو کسی آدمی کے پاس لے جاؤ تو اسی طرح کے آدمی کے پاس لے چلو۔ یہ مسلمانوں کے سردار ہیں: إِذَا دَلَلْتَنِي عَلَى رَجُلٍ فَدُلَّنِي عَلَى مِثْلِ هَذَا، هَذَا سَيِّدُ الْمُسْلِمِينَ (حلیۃ الاولیاء للاصفہانی، جلد 8، صفحہ 106)۔

آدمی کے اندر اگر صحیح مزاج ہو تو وہ نصیحت کو سن کر اس سے سبق لے گا، خواہ یہ نصیحت کتنے ہی سخت تنقیدی الفاظ میں کی گئی ہو۔ ایسا آدمی نصیحت کو اس کے معنوی اعتبار سے دیکھے گا نہ کہ اس کے لفظی اعتبار سے، وہ اس کو اصولی حیثیت سے لے گا نہ کہ ذاتی حیثیت سے۔

صحیح مزاج اگر بادشاہ کے اندر ہو تو وہ بھی تنقید کو سن کر اسے برداشت کرے گا۔ اور ایک معمولی آدمی بھی اگر صحیح مزاج نہ رکھتا ہو تو وہ تنقید کو سن کر بگڑ جائے گا۔ تنقید کسی آدمی کو پہچاننے کی سب سے زیادہ یقینی کسوٹی ہے۔ تنقید کو سن کر جو آدمی اپنے ذہنی توازن کو نہ کھوئے وہی اعلیٰ انسان ہے۔ اور جو شخص تنقید کو سن کر بگڑ جائے، اس کے متعلق یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ اپنے اندر اعلیٰ انسان والی خصوصیات رکھتا ہے۔

تنقید کسی آدمی کی انسانیت اور اس کے تقوی کی پہچان کراتی ہے۔

نقطۂ انقلاب

عمر بن عبد العزیز تابعی بنو امیہ کے ایک خلیفہ تھے۔ ان کے عالم اور زاہد اور خلیفۂ راشد ہونے پر تمام علما کا اتفاق ہے۔ صحابہ کے بعد ان کا مقام امت میں سب سے زیادہ بلند مانا جاتا ہے۔

حضرت عمر بن عبد العزیز اپنی ابتدائی زندگی میں ایک خوش باش اور خوش پوش انسان کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔ وہ پرتکلف زندگی گزارتے تھے۔ آخر عمر میں وہ بالکل بدل گئے۔ اس تبدیلی کے لیے جو واقعہ نقطۂ آغاز ثابت ہوا وہ یہ تھا: قَالَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ كَثِيرٍ: قُلْتُ لِعُمَرَ بْنِ عَبْدِ الْعَزِيزِ: مَا كَانَ بَدْءُ إِنَابَتِكَ؟ قَالَ: أَرَدْتُ ضَرْبَ غُلَامٍ لِي، فَقَالَ لِي: اذْكُرْ لَيْلَةً صَبِيحَتُهَا يَوْمُ الْقِيَامَةِ۔ (تاریخ دمشق، جلد 45، صفحہ 151)۔ عبد اللہ بن کثیر کہتے ہیں

کہ میں نے عمر بن عبدالعزیز سے پوچھا کہ آپ کی انابت کا آغاز کیسے ہوا۔ انہوں نے کہا کہ میں نے اپنے ایک غلام کو مارنا چاہا تو اس نے کہا کہ اس رات کو یاد کرو جس کی صبح قیامت کا دن ہے۔

جب آدمی کے اندر زندگی ہو، جب آدمی کے اندر قبول کرنے کی صلاحیت موجود ہو تو ایک جملہ اس کو بدلنے کے لیے کافی ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس، جب اس کی روح مردہ ہو جائے۔ جب اس کی قبول کرنے کی صلاحیت زندہ حالت میں باقی نہ رہے تو ہر دلیل اس کے لیے بے کار ہے۔ اس کے بعد کسی بھی قیمت پر وہ حق کو قبول کرنے والا نہیں، خواہ حق کو کتنا ہی زیادہ دلائل کے ساتھ اس کے سامنے بیان کر دیا گیا ہو۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز اپنے غلام کو مارنا چاہتے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غلام سے ان کو کوئی سخت شکایت پیدا ہو گئی تھی۔ اس کے باوجود غلام کی بات نے ان کو ہلا دیا۔ یہ کسی انسان کے لیے انتہائی عظمت کی بات ہے۔ ایک شخص جس سے تکلیف پہنچی ہو۔ جس نے سخت شکایت کا موقع دیا ہو، اس کی بات سے مثبت اثر لینے کے لیے بہت اونچی انسانیت درکار ہے۔ مگر اس دنیا میں وہی لوگ اونچی ایمانی ترقی کرتے ہیں جو اس قسم کی اونچی انسانیت کا ثبوت دے سکیں۔

مردہ انسان کے لیے شکایت کا واقعہ اختتام کی حیثیت رکھتا ہے۔ مگر زندہ انسان کے لیے شکایت کا واقعہ ایک نئے دور کا آغاز بن جاتا ہے۔

ترک تعلق

ایک روایت حدیث کی مختلف کتابوں میں آئی ہے۔ امام بخاری نے اس کو کتاب الادب میں نقل کیا ہے۔ امام مسلم نے کتاب البر والصلہ میں حسب ذیل باب کے تحت اس

کو شامل کیا ہے: بَابُ تَحْرِيمِ الْهِجْرَةِ فَوْقَ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ بِلَا عُذْرٍ شَرْعِيٍّ۔ یعنی، یہ کہ عذر شرعی کے بغیر تین دن سے زیادہ ترک تعلق حرام ہے۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں: عن ابی ایوب الانصاریِ اَنّ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال۔ لَا يَحِلُّ لِرَجُلٍ أَنْ يَهْجُرَ أَخَاهُ فَوْقَ ثَلَاثِ لَيَالٍ، يَلْتَقِيَانِ فَيُعْرِضُ هَذَا وَيُعْرِضُ هَذَا، وَخَيْرُهُمَا الَّذِي يَبْدَأُ بِالسَّلَامِ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 6077)۔ یعنی، ابو ایوب انصاریؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کسی مسلم کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنے بھائی کو تین دن سے زیادہ چھوڑے رکھے۔ وہ ملیں تو یہ اس سے منہ پھیر لے اور وہ اس سے منہ پھیر لے۔ اور دونوں میں بہتر وہ ہے جو سلام میں پہل کرے۔

امام نووی (1233-1277ھ) نے اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ علما نے کہا ہے کہ مسلمانوں کے درمیان تین دن سے زیادہ ترک تعلق حرام ہے اور ابتدائی تین دن تک جائز ہے: قَالَ الْعُلَمَاءُ فِي هَذَا الْحَدِيثِ تَحْرِيمُ الْهَجْرِ بَيْنَ الْمُسْلِمِينَ أَكْثَرَ مِنْ ثَلَاثِ لَيَالٍ وَإِبَاحَتُهَا فِي الثَّلَاثِ الْأُوَلِ (شرح النووی علی مسلم، جلد 16، صفحہ 117)۔

آدمی جب بھی کسی سے ترک تعلق کرتا ہے تو وہ ہمیشہ کسی شکایت کی بنا پر کرتا ہے۔ اس لیے حدیث میں یہ بات اپنے آپ شامل ہے کہ تم کو اپنے بھائی سے خواہ کتنی ہی زیادہ شکایت ہو جائے تمہارے لیے بہرحال ایسا کرنا جائز نہیں کہ تم مستقل طور پر اس سے تعلق توڑ لو اور سلام و کلام بند کر دو۔ شکایت کے موقع پر چونکہ آدمی غصہ کا شکار ہو جاتا ہے، اس لیے فرمایا کہ تم کو تین دن کی رخصت ہے۔ تین دن تک ترک تعلق جائز ہے، اور اس کے بعد ترک تعلق حرام۔

اگر کسی کو کسی سے شکایت ہے اور وہ ختم نہیں ہو رہی ہے تو اس کے لیے دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ بات چیت کے ذریعہ وہ شکایت کو رفع کرنے کی کوشش کرے۔

دوسرے یہ کہ سارے معاملہ کو وہ اللہ کے اوپر ڈال دے۔ مگر جہاں تک ترک تعلق کا معاملہ ہے، وہ کسی بھی حال میں کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں۔

برائی کی قسمیں

عَنْ أَبِي أُمَامَةَ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم يُطْبَعُ الْمُؤْمِنُ عَلَى الْخِلَالِ كُلِّهَا إِلَّا الْخِيَانَةَ وَالْكَذِبَ (مسند احمد، حدیث نمبر 22170)۔ یعنی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مومن میں تمام خصلتیں پائی جا سکتی ہیں، سوا خیانت اور جھوٹ کے۔

انسانی غلطیوں کا سبب عام طور پر دو ہوتا ہے، ایک ہوس، اور دوسرے دنائت۔ ہوس کے تحت ہونے والی غلطی وہ ہے جو کوئی آدمی نفسیاتی جذبہ سے مغلوب ہو کر کر بیٹھتا ہے۔ دنائت کے تحت کی جانے والی غلطی وہ ہے جو کمینہ صفت ہونے کی بنا پر کسی شخص سے صادر ہوتی ہے۔

حدیث میں جو بات کہی گئی ہے اس کی وجہ یہی فرق ہے۔ کوئی شخص جب کسی دوسری اخلاقی برائی میں ملوث ہوتا ہے، مثلاً غصہ میں کوئی سخت کارروائی کرنا، تو اس کا سبب نفس کی کمزوری ہوتی ہے۔ مخصوص حالات میں آدمی کے اوپر نفس کا غلبہ ہو جاتا ہے اور وقتی مغلوبیت کے تحت وہ ایک غلط فعل کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے۔ پھر جب نفسانی مغلوبیت ختم ہوتی ہے تو اس کے اوپر شدت سے ندامت کا احساس طاری ہو جاتا ہے۔ وہ خود اپنے آپ کو ملامت کرنے لگتا ہے کہ میں نے کیوں ایسا کیا۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔

مگر خیانت اور کذب کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ یہ برائی کی وہ قسم ہے جو کمینہ پن کی

بنا پر آدمی سے صادر ہوتی ہے۔ اس کا ارتکاب وہ شخص کرتا ہے جس کی روح گندی ہو گئی ہو۔ اس کا سبب وقتی مغلوبیت نہیں، بلکہ شر پسندی کی مستقل خصلت کی بنا پر آدمی اس کا ارتکاب کرتا ہے۔ ایسا فعل وہ شخص کرتا ہے جس کی روح مسخ ہو گئی ہو۔ اسی لیے وہ خیانت اور جھوٹ جیسی برائی کا مرتکب ہونے کے باوجود مطمئن رہتا ہے۔ اس کو کسی قسم کی بے چینی لاحق نہیں ہوتی اور نہ توبہ اور ندامت کی کیفیت اس کے اندر پیدا ہوتی۔

جو برائی وقتی مغلوبیت کے تحت صادر ہو، اس کے متعلق امید ہے کہ اللہ اسے معاف کر دے گا۔ لیکن جس برائی کا سبب روحانی گندگی ہو اس کے لیے معافی کا کوئی سوال نہیں۔

صبر و ہمدردی

قرآن کی سورہ نمبر 90 میں بتایا گیا ہے کہ وہ کون لوگ ہیں جو خوش نصیب ہیں اور جن کو خدا کی طرف سے بڑے بڑے انعامات دیے جائیں گے۔ اس سلسلہ میں ارشاد ہوا ہے:

> ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ۔ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْمَيْمَنَةِ (90:17-18)۔ یعنی، اور پھر وہ ان لوگوں میں سے ہو جو ایمان لائے اور ایک دوسرے کو صبر کی اور ایک دوسرے کو ہمدردی کی نصیحت کی۔ یہی لوگ نصیب والے ہیں۔

اللہ پر ایمان تمام نیکیوں کا آغاز ہے۔ آدمی جب اللہ پر ایمان لاتا ہے تو ایک طرف وہ اپنے خالق و مالک کے سلسلہ میں بندگی کے تقاضے پورا کرتا ہے۔ اور دوسری طرف وہ اپنے اندر وہ اعلیٰ استعداد پیدا کرتا ہے جس کی مدد سے وہ خدا کے بندوں کے درمیان مطلوب انسان بن کر رہ سکے۔

بندوں کے سلسلہ میں ایک انسان سے جو چیز مطلوب ہے وہ ایک لفظ میں، مرحمت

ہے۔ یعنی سب کے حق میں ہمدردی اور مہربانی۔ سب کے لیے سچا خیر خواہ بن کر ان کے درمیان زندگی گزارنا۔ کسی شخص کا ذکر ہو تو اس کے حق میں وہی کلمات اپنی زبان سے نکالنا جو اس کے لیے موزوں ترین ہوں۔ کسی سے سابقہ پیش آئے تو اس سے ہمیشہ بہترین سلوک کیا جائے۔ کسی سے معاملہ پڑے تو وہی کیا جائے جو اس کی خیر خواہی کے مطابق ہو۔ دوسرے انسانوں کے ساتھ تعلقات کو مہربانی کی بنیاد پر قائم کیا جائے۔

مگر اس دنیا میں لوگوں کے ساتھ ہمدردی اور مہربانی کا سلوک صبر و برداشت کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ اس دنیا میں لازمی طور پر ایسا ہوگا کہ ایک آدمی کو دوسرے آدمی کی طرف سے شکایت پہنچے گی۔ ایک گروہ اور دوسرے گروہ کے درمیان ٹکراؤ کے اسباب پیدا ہوں گے۔ ایک شخص سے ایسا قول یا فعل صادر ہوگا جس سے دوسرے کی انا کو ٹھیس پہنچ جائے۔

اس لیے مرحمت کی روش پر چلنے کے لیے صبر کی طاقت ضروری ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ قرآن کے مطابق آپ مرحمت والے سلوک پر پورے اتریں تو آپ کو یک طرفہ طور پر دوسروں کی فرضی یا حقیقی زیادتیوں کو برداشت کرنا ہوگا۔ آپ کو اپنے اندر سے شکایتی مزاج کا خاتمہ کرنا ہوگا۔ اسی کا نام صبر ہے، اور اس صبر کے بغیر کسی کے لیے نصیبہ والا بننا ممکن نہیں۔

سچی ہوشیاری

حضرت عبداللہ بن عمر کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کی مسجد نبوی میں تھے۔ صحابہ کی ایک تعداد آپ کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ اتنے میں انصار کا ایک نوجوان آیا۔ نوجوان نے آپ سے کچھ سوالات کیے جن کا آپ نے جواب دیا۔ وہ سوال وجواب یہ تھا:

قَالَ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ أَيُّ الْمُؤْمِنِينَ أَفْضَلُ؟ قَالَ: أَحْسَنُهُمْ خُلُقًا، قَالَ: فَأَيُّ الْمُؤْمِنِينَ أَكْيَسُ؟ قَالَ: أَكْثَرُهُمْ لِلْمَوْتِ ذِكْرًا، وَأَحْسَنُهُمْ لِمَا بَعْدَهُ

اسْتِعْدَادًا، أُولَئِكَ الْأَكْيَاسُ (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 4259)۔ اس نے کہا کہ اے خدا کے رسول، مسلمانوں میں سب سے بہتر کون ہے۔ آپ نے فرمایا کہ وہ شخص جس کے اخلاق سب سے بہتر ہوں۔ پھر اس نے پوچھا کہ مسلمانوں میں سب سے زیادہ سمجھ دار کون ہے۔ آپ نے فرمایا کہ وہ شخص جو سب سے زیادہ موت کو یاد کرے اور جو موت آنے سے پہلے سب سے زیادہ اس کی تیاری کرے۔ ایسے ہی لوگ سب سے زیادہ سمجھ دار ہیں۔

جس شخص کا ایمان جتنا زیادہ گہرا ہوگا اتنا ہی زیادہ اس کا اخلاق اچھا ہوگا۔ جس آدمی کے دل میں اللہ کا ڈر پیدا ہو جائے۔ وہ بندوں کے ساتھ سلوک کرنے میں انصاف کرنے والا اور مہربانی کرنے والا بن جاتا ہے۔ اور اسی کا دوسرا نام حسن اخلاق ہے۔

موت کو یاد رکھنا اس بات کا ثبوت ہے کہ آدمی دنیا کو عارضی اور آخرت کو ابدی سمجھتا ہے۔ وہ موجودہ دنیا کی چیزوں میں الجھ کر نہیں رہ گیا ہے بلکہ آنے والی زندگی کو اپنی توجہ کا مرکز بنائے ہوئے ہے۔ پھر اس سے زیادہ عقل مند کون ہوسکتا ہے جو ابدی زندگی کی کامیابی اور ناکامی کے بارے میں سوچے اور اس کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لے۔

موت کی یاد کا یہ نتیجہ بھی ہوتا ہے کہ آدمی موجودہ دنیا میں اپنے عمل کے بارے میں ہوشیار ہو جاتا ہے۔ یہ مزاج اس کے اندر سے بے اعترافی، ناانصافی، فریب، استغلال اور نمود ونمائش کے جذبات ختم کر دیتا ہے۔ اور جس آدمی کے اندر اس قسم کے غلط اور مصنوعی جذبات ختم ہو جائیں، اس کا ہر قدم صحیح سمت میں اٹھے گا، وہ ایک بے پناہ انسان بن جائے گا۔

اعلیٰ ظرفی

مولانا اشرف علی تھانوی (1943-1863) رحمۃ اللہ علیہ نے سرسید مرحوم (1898-1817ھ) کا ایک واقعہ (الافاضات الیومیہ، جلد 1) ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

ایک انگریزی تعلیم یافتہ شخص ملازمت نہ ملنے کی وجہ سے پریشان تھا۔ کیا سوجھی کہ ایک بڑے انگریز افسر کے پاس پہنچا اور کہا کہ میں سرسید کا داماد ہوں مجھ کو ملازمت کی ضرورت ہے۔ وہ انگریز بہت ہی خاطر سے پیش آیا اور کہا کہ آپ ٹھہریں۔ اس کو ٹھہرا کر اس کی لاعلمی میں ایک تار سرسید کو دیا کہ فلاں شخص اس نام کا ہمارے پاس ملازمت کے خیال سے آیا ہے اور اپنے آپ کو آپ کا داماد کہتا ہے کیا یہ واقعہ صحیح ہے؟

جواب میں سرسید نے اس انگریز کو لکھا بالکل صحیح ہے۔ ضرور آپ ملازمت کے لیے کوشش فرمادیں میں آپ کا ممنون ہوں گا۔ اس شخص کو ملازمت مل گئی۔

ایک روز اتفاقاً اس انگریز نے اس شخص سے یہ واقعہ (سرسید سے تحقیق حال کا) بیان کر دیا۔ یہ بہت ہی شرمندہ ہوا اور کچھ عرصہ کے بعد یہ شخص علی گڑھ آیا۔ اور سرسید سے مل کر معافی کی درخواست کی اور کہا میں وہی ہوں جس نے اپنے آپ کو آپ کا داماد بتا کر ملازمت لی ہے۔ یہ گستاخی بضرورت تھی۔

سرسید نے جواب میں کہا کہ گو یہ بات اس وقت غلط تھی۔ مگر اب صحیح ہوجائے گی، داماد کہتے ہیں بیٹی کے شوہر کو۔ اس کی ایک صورت تو یہ تھی کہ میری بیٹی آپ کی بیوی ہوتی، سو یہ تو نہیں ہوسکتا۔ مگر دوسری صورت ممکن ہے وہ یہ کہ آپ کی بیوی کو میں اپنی بیٹی بنالوں، سو میں آپ کی بیوی کو اپنی بیٹی بناتا ہوں اور وہ میری بیٹی اور میں اس کا باپ!

یہ توجیہہ وقتی ہی نہ تھی ۔ بلکہ تازندگی باپ بیٹی اور داماد کا سا برتاؤ رکھا۔ بلانا، لینا دینا سب اسی طرح رکھا۔(تہذیب الاخلاق علی گڑھ)

ساری دنیا کا ہمدرد بننا بہت آسان ہے ۔مگر قوم کا ایک مصیبت زدہ فرد، جس سے ٹھیس بھی پہنچی ہو، اس کے معاملہ کو اپنا معاملہ بنا لینا سخت مشکل ہے ۔ یہ وہی شخص کر سکتا ہے جو قوم کا سچا خیر خواہ ہو اور اسی کے ساتھ بڑے دل والا بھی ۔

مومنانہ طریقہ

مولانا شبلی نعمانی (1914-1857) کی آخر زندگی میں یہ حادثہ پیش آیا کہ گھر میں بھری ہوئی بندوق چل گئی جس کی وجہ سے ان کا ایک پاؤں شدید طور پر زخمی ہوا اور بالآخر اس کو ڈاکٹروں نے کاٹ دیا۔ اس حادثہ پر شاعروں نے طرح طرح کے مضامین باندھے ۔کسی نے کہا" ہمت کا قدم زمیں پہ گاڑ دیا"۔ کسی نے لکھا" سیرت نگار نبوی نے حوروں کی پابوسی کے لیے پہلے ہی سے قدم بھیج دیا" وغیرہ۔مگر خود مولانا شبلی کے جذبات دوسرے تھے ۔انہوں نے اپنے اس حادثہ پر یہ شعر کہا:

شبلی نامہ سیہ را بجزاے عملش پا برید ند وصدا خاست کہ سر می باید

یعنی شبلی کے سیاہ اعمال کی وجہ سے اس کا پاؤں کاٹ دیا گیا تو اوپر سے آواز آئی کہ پاؤں نہیں سر کی ضرورت ہے ۔

یہی مومن کا طریقہ ہے ۔مومن کبھی دوسروں کی تعریف سے غلط فہمی میں نہیں پڑتا۔ عین اس وقت جب کہ لوگ اس کی تعریف کرتے ہیں، اس کی اندرونی نفسیات اس کو اپنی بے حقیقی یاد دلاتی ہے جب اس کے نام پر استقبالیہ پیش کیا جاتا ہے تو وہ برعکس طور پر اپنے ذاتی احتساب میں مشغول ہو جاتا ہے ۔

دوسروں کی تعریف سے اپنی شخصیت کے قد کو ناپنا انتہائی سطحیت کی بات ہے، اور مومن سب سے زیادہ اس سطحیت سے دور ہوتا ہے۔ مومن وہ ہے جو اپنے آپ کو خدا کی نسبت سے جانچے نہ کہ انسان کی نسبت سے۔ اور جو شخص اپنے آپ کو خدا کی نسبت سے جانچے وہ کبھی غلط فہمی کا شکار نہیں ہو سکتا۔

تعریف مومن کی تواضع کو بڑھاتی ہے، اور جو غیر مومن ہو اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ تعریف سے صرف اس کے جھوٹے پندار میں اضافہ ہوتا ہے اپنے کو قابل تعریف سمجھنا، اپنے آپ کو خدا کا ہمسر بنانا ہے۔ اور خدا کا ہمسر بننا، بلاشبہ کسی انسان کا سب سے بڑا جرم ہے۔

مومن کا حال یہ ہوتا ہے کہ اس کو ہر موقع پر خدا یاد آتا ہے۔ مذمت کا پہلو ہو یا تعریف کا، ہمیشہ وہ خدا کی طرف رجوع کرتا ہے۔ جب کوئی شخص اس کی تعریف کرتا ہے تو وہ عین اپنے مزاج کی بنا پر خدا کو یاد کرنے لگتا ہے جو تمام بڑوں سے زیادہ بڑا ہے۔ خدا کی عظمت کا احساس اس سے ذاتی عظمت کے احساس کو چھین لیتا ہے۔ تعریف اس کی تواضع کو بڑھانے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

چھوٹا واقعہ بڑا سبق

مولانا سید امیر علی (1858-1921) ملیح آباد میں پیدا ہوئے اور لکھنؤ میں وفات پائی۔ انہوں نے مڈل اسکول تک تعلیم حاصل کی تھی کہ ان کی تعلیم چھوٹ گئی۔ غربت کی وجہ سے انہیں ملازمت تلاش کرنی پڑی۔ بہرائچ کے ایک سب پوسٹ آفس میں ان کو پوسٹ ماسٹر کی جگہ مل گئی۔ ملازمت کی ضرورت کے تحت انہوں نے معمولی انگریزی سیکھ لی اور کام کرنے لگے۔

گھریلو تربیت کے تحت وہ نماز کے پابند تھے۔ ایک دن وہ جمعہ کی نماز کے لیے مسجد گئے۔ اسی وقت سرکاری افسر ڈاک خانہ کے معائنہ کے لیے آ گیا۔ پوسٹ ماسٹر کو غیر حاضر پا کر وہ بہت غصہ ہوا۔ سید امیر علی صاحب کو مسجد میں اطلاع پہنچی تو وہ وضو کر رہے تھے۔ انہوں نے اس کا کوئی اثر نہیں لیا۔ اطمینان کے ساتھ نماز پڑھ کر واپس آئے۔ افسر مذکور نے پوچھ گچھ کی تو وہ چپ رہے۔ نہ کوئی جواب دیا اور نہ کسی قسم کی معذرت کی۔ خاموشی کے ساتھ ایک کاغذ لیا۔ اس پر اپنا استعفا لکھا اور افسر کو دے کر گھر چلے گئے۔

سید امیر علی صاحب اس وقت تک صرف اردو اور کچھ انگریزی جانتے تھے۔ وہ عربی اور فارسی سے ناواقف تھے۔ استعفا کے بعد انہیں ایک جھٹکا لگا۔ انہوں نے سوچا کہ جس دین کی خاطر میں نے ملازمت سے استعفا دیا ہے، اس کی بابت براہ راست میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ حتیٰ کہ اس سلسلہ میں کوئی شخص سوال کرے تو میں اس کا جواب بھی نہیں دے سکتا۔ میں نماز ضرور پڑھتا ہوں مگر نماز کا مطلب کیا ہے، اس سے میں بے خبر ہوں۔ قرآن و حدیث سے مجھے کوئی واقفیت نہیں۔

اب ان کے اندر ایک نیا جذبہ جاگ اٹھا۔ انہوں نے عربی اور فارسی پڑھنے کا فیصلہ کیا۔ عربی زبان میں انہوں نے اتنی مہارت پیدا کی کہ ماہر علما میں شمار کیے جانے لگے۔ دارالعلوم ندوۃ العلما میں وہ شیخ الحدیث مقرر ہوئے۔ مدرسہ عالیہ کلکتہ میں صدر مدرس رہے۔ منشی نول کشور (وفات 1895) کے مطبع سے وابستہ ہو کر بڑی بڑی عربی کتابوں کے اردو ترجمے کیے، مثلاً صحیح بخاری، فتاویٰ عالمگیر، وغیرہ (قومی آواز 4 فروری 1990)۔ آدمی کے اندر اگر زندگی ہو تو ایک معمولی واقعہ اس کے اندر حرکت پیدا کرنے کا سبب بن جاتا ہے۔ وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ عالی شان کارنامے انجام دے سکے۔ اور جس آدمی کے اندر زندگی نہ ہو

اس کے ساتھ بڑے بڑے واقعات پیش آئیں گے مگر وہ اس طرح پڑا رہے گا جیسے کہ اس نے نہ کچھ جانا اور نہ کوئی سبق لیا۔

دو انسان

ایک بزرگ کا واقعہ ہے۔ کسی مسئلہ پر ان کی گفتگو ایک شخص سے ہوئی۔ گفتگو کے دوران بزرگ کی زبان سے کچھ سخت الفاظ نکل گئے۔ اس کے بعد دونوں الگ ہو گئے۔ یہ شام کا وقت تھا۔ عشاء کی نماز کے بعد جب بزرگ اپنے بستر پر گئے تو انہوں نے محسوس کیا کہ ان کے اندر بے چینی پیدا ہو رہی ہے۔ ان کا دل انہیں ملامت کرنے لگا کہ تم نے خدا کے ایک بندے کے ساتھ سخت کلامی کی۔ تم نے اپنے مقابلہ میں اس کو حقیر سمجھا۔ تمہارے اندر ابھی تک گھمنڈ کا جذبہ چھپا ہوا ہے۔ خدا کے یہاں اگر وہی آدمی بلند مرتبہ ہوا اور تم خدا کے یہاں بے قیمت ٹھہرو تو تم کیا کرو گے۔ تم کو یہ حق تو تھا کہ اپنے بھائی کی رائے سے اختلاف کرو۔ مگر تم کو یہ حق نہ تھا کہ برے الفاظ بول کر اس کو ذلیل کرو۔

اس قسم کے خیالات نے بزرگ کو اتنا بے چین کیا کہ ان کی نیند اڑ گئی، وہ رات بھر اپنے بستر پر کروٹیں بدلتے رہے۔ ایک بار وہ بستر سے اٹھے اور وضو کر کے نماز پڑھنا شروع کیا، مگر انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے خدا ان کی نماز کو ان کے چہرہ پر مار رہا ہے۔ ان کی پریشانی اور زیادہ بڑھ گئی۔ صبح ہوتے ہی انہوں نے فجر کی نماز ادا کی اور اس کے بعد فوراً مذکورہ آدمی کے گھر پہنچے۔ اس سے ملاقات کر کے اس سے معافی مانگی۔ اس وقت حال یہ تھا کہ ایک طرف ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور دوسری طرف زبان سے یہ نکل رہا تھا۔ ”خدا کے واسطے مجھے معاف کر دو“۔

یہ اللہ سے ڈرنے والے شخص کا حال تھا۔ دوسرا آدمی وہ ہے جس کی اگر شام کے وقت کسی سے تکرار ہو جائے تو صبح کو وہ اس کے خلاف مزید سخت کارروائیاں کرنے کے منصوبے بناتا ہے۔ پچھلے دن اگر خود کسی کو برا بھلا کہا تھا تو اگلے دن اپنے ساتھیوں کو بھی اکساتا ہوا نظر آتا ہے کہ وہ اس کو ذلیل کریں۔ اگر ایک بار کسی سے شکایتی باتیں ہو گئیں تو ہمیشہ کے لیے اس کے خلاف کینہ اپنے دل میں رکھ لیتا ہے اور وہ سب کچھ کرتا ہے جو اس کو ذلیل اور برباد کرنے کے لیے وہ کر سکتا ہے۔

جس آدمی کے دل میں اللہ کا ڈر ہو اس کے لیے اللہ کا ڈر اس کا نگہبان بن جاتا ہے۔ وہ شام کی غلطی کی تلافی صبح کو کر لیتا ہے۔ اس کے برعکس، جو آدمی اللہ کے ڈر سے خالی ہو اس کا رہنما صرف اس کا نفس ہوتا ہے۔ وہ اپنے نفس کی رہنمائی میں ایک کے بعد ایک سرکشی کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ جہنم میں پہنچ جاتا ہے۔

دو گواہ

حاجی امداد اللہ صاحب (1899-1817) دیوبند کے بڑے بزرگوں میں سے تھے۔ ان کا طریقہ تھا کہ جب کوئی شخص کسی کے بارے میں کوئی بری بات کہتا تو وہ فوراً کہتے کہ دو گواہ لے آؤ۔ اور جب وہ دو گواہ نہ لاتے تو بات کو وہیں ختم کر دیتے اور کہتے کہ جب تمہارے پاس اپنی بات کے حق میں دو گواہ نہیں ہیں تو تمہاری بات قابل اعتبار نہیں۔

یہ عین شرعی طریقہ ہے۔ اسلام میں معاملات کے اثبات کے لیے شہادت کا اصول رکھا گیا ہے۔ یعنی کوئی شخص کوئی معاملہ کرے یا کسی بات کا دعویٰ کرے تو وہ اپنے دعوے کے حق میں معتبر گواہ پیش کرے۔ زنا کے معاملہ میں چار گواہ کا اصول ہے، اور بقیہ تمام معاملات میں دو گواہ کا اصول۔

ایک شخص کسی کے اوپر کوئی الزام لگائے تو البَیِّنَۃُ عَلَی اَلْمُدَّعِیِّ کے شرعی اصول کے مطابق اس کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس کا ثبوت پیش کرے۔ ضروری ثبوت پیش نہ کرنے کی صورت میں اس کی بات بالکل بے بنیاد قرار دی جائے گی۔

مگر موجودہ زمانہ میں مزاجوں کے بگاڑ کی وجہ سے یہ اصول عملاً ختم ہو گیا ہے۔ خاص طور پر جس شخص سے کسی وجہ سے شکایت یا تلخی ہو جائے اس کے بارے میں تو کسی قسم کے ثبوت کی قطعاً ضرورت نہیں۔ جو بھی الٹی بات اس کے بارے میں کہہ دی جائے اس کو سنتے ہی مان لیا جاتا ہے۔ نہ کوئی ثبوت مانگا جاتا اور نہ دو گواہ طلب کیے جاتے۔

یہ بیماری اتنی بڑھ گئی ہے کہ عوام تو درکنار خواص بھی اس میں ملوث ہیں۔ حتیٰ کہ اکابر تک اس سے مستثنیٰ نہیں۔ کم از کم میں نے اپنی زندگی میں کسی کے بارے میں نہیں سنا یا جانا کہ اس کے سامنے اس کے "مخالف" پر کوئی الزام لگایا جائے اور وہ الزام لگانے والے سے کہے کہ اپنی بات کے ثبوت میں دو گواہ لاؤ، ورنہ تمہاری بات قبول نہیں کی جائے گی۔

قدیم زمانہ میں بزرگی کا مطلب وہ تھا جس کی مثال اوپر کے واقعہ میں نظر آتی ہے۔ مگر آج بزرگی کا مفہوم بالکل بدل گیا ہے۔ آج ایک آدمی گواہ اور ثبوت کے بغیر ایک الٹی بات کو مان لیتا ہے، اس کے باوجود اس کی بزرگی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ پھر بھی وہ اپنے معتقدین کے درمیان بدستور مقدس بنا رہتا ہے۔

کرنے کا کام

امیر تبلیغ مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ (1885-1944ھ) کا طریقہ تھا کہ وہ کسی جماعت کو دین کے راستہ میں بھیجتے تو روانگی کے وقت اس کو یہ نصیحت کرتے:

نیچی نظر، دل میں فکر، زبان پر ذکر،
قدم ملا کر چلو گے تو منزلیں آسان ہوجائیں گی۔

اگر لفظ بدل کر کہا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ — سنجیدگی، احساس ذمہ داری، اللہ کی عظمت کا اقرار اور اتحاد، یہ چیزیں جن لوگوں کے اندر پیدا ہو جائیں، وہ ضرور کامیاب ہوں گے۔

یہ انتہائی اہم بات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ امت کے فرد فرد میں یہ شعور جگانا اور ایک ایک شخص کے اندر یہ جذبہ بھرنا، یہی اصل کام ہے۔ اسی میں آخرت کی بھلائی ہے اور اسی میں دنیا کی بھلائی بھی۔

قوم یا خارجی نظام کا بذات خود کوئی مستقل وجود نہیں۔ اصلی اور مستقل وجود صرف فرد کا ہے۔ فرد کے مجموعہ کا نام قوم ہے۔ اور فرد کی کارکردگی کا نام نظام۔ اس لیے فرد کو بنانا قوم کو بنانا ہے اور فرد کی اصلاح گویا پورے نظام کی اصلاح ہے۔

اس حقیقت کو سامنے رکھیے تو وہی کام کام ہے جو فرد کو نشانہ بنا کر کیا جائے۔ جس کام میں نظام یا حکومت کو نشانہ بنایا گیا ہو وہ صرف ایک ہنگامہ ہے۔ وہ باعتبار حقیقت کوئی کام نہیں۔ جو چیز آپ اجتماع کی سطح پر چاہتے ہیں اس کو آپ اسی وقت حاصل کر سکتے ہیں جب کہ آپ اس کو فرد کی سطح پر حاصل کر چکے ہوں۔ فرد کی اصلاح کے بغیر اصلاح معاشرہ اور انقلاب حکومت کا نعرہ لگانا یا تو لیڈری ہے یا دیوانگی۔ اس کے سوا اس کی کوئی تیسری توجیہ نہیں کی جا سکتی۔

فرد فرد کے اندر وہ گہرا ایمان پیدا کیجیے کہ تواضع سے اس کی نظریں جھک جائیں۔ آخرت کی جواب دہی کا احساس اس کے سینہ میں تڑپ بن کر داخل ہو جائے۔ اللہ کی عظمت اس کے اوپر اتنی چھائے کہ وہ اس کو ہر وقت یاد کرنے والا بن جائے۔ اس کی بےنفسی اس کو لوگوں کے ساتھ متحد کر دے۔ افراد کے اندر اگر یہ اوصاف آجائیں تو اس کے بعد بقیہ چیزیں اسی طرح لازمی طور پر آئیں گی جس طرح ایک زندہ درخت کے اوپر پھل۔

مسافر کی زندگی

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا کندھا پکڑ کر فرمایا: دنیا میں اس طرح رہو گویا کہ تم اجنبی ہو تم یہاں ایک مسافر ہو (كُنْ فِي الدُّنْيَا كَأَنَّكَ غَرِيبٌ أَوْ عَابِرُ سَبِيلٍ)۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہا کرتے تھے کہ جب تم شام کرو تو تم صبح کا انتظار نہ کرو۔ اور جب تم صبح کرو تو تم شام کا انتظار نہ کرو۔ اور تم اپنی صحت سے اپنے مرض کے لیے لو اور تم اپنی زندگی سے اپنی موت کے لیے حاصل کرو۔ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 6416)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس نصیحت اور صحابی کی اس تشریح میں زندگی کا راز بتا دیا گیا ہے۔ انسان جب اپنے گھر پر اور اپنے وطن میں ہو تو وہ سمجھتا ہے کہ میں اپنے مستقل مقام پر ہوں۔ یہ احساس اس کی پوری زندگی کو ایک خاص ڈھنگ پر ڈھال دیتا ہے، اس کے برعکس جو آدمی کسی اجنبی علاقہ میں سفر کر رہا ہو وہ سمجھتا ہے کہ میں ایک عارضی مقام پر ہوں۔ یہ احساس اس کی پوری زندگی کو بالکل دوسرا رُخ دیدیتا ہے — مومن کی زندگی ایک اعتبار سے اسی دوسرے انسان کی مانند ہوتی ہے۔

مومن موجودہ دنیا میں اپنے آپ کو وقتی مسافر سمجھتا ہے۔ یہ احساس اس کے اندر اس کی توجہ اور اس کی دلچسپیوں کو دنیا میں لگنے نہیں دیتا۔ وہ بظاہر دنیا میں رہتا ہے، مگر اپنی یاد اور سوچ کے اعتبار سے وہ آخرت کا باسی بنا رہتا ہے۔ یہ ذہن اس کے اندر بے پناہ صبر پیدا کر دیتا ہے۔ وہ ہر تلخی کو برداشت کر لیتا ہے، کیونکہ ہر تلخی اس کو وقتی دکھائی دیتی ہے۔ بڑے بڑے نقصان کو وہ سہہ لیتا ہے، کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ دنیا کا فائدہ بھی عارضی ہے اور یہاں کا نقصان بھی عارضی۔ شدید انتقامی جذبات بھی اس کے اندرونی سرد خانہ میں پہنچ کر بجھ جاتے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ انتقام لینے والا بھی بالآخر موت کی گرفت میں آنے والا ہے اور انتقام نہ لینے والا بھی۔

یہ چیز اس کو حد درجہ وقت کا احساس کرنے والا (time-conscious) بنا دیتی ہے۔ اس کو یقین نہیں ہوتا کہ وہ اگلی صبح تک جئے گا اور اس لیے وہ اپنی موجودہ شام کو آخری حد تک استعمال کر لینا چاہتا ہے۔ وہ اپنے ایک لمحہ کو بھی ضائع کرنا پسند نہیں کرتا۔

حدیث دعا

- إِنَّ الدُّعَاءَ هُوَ الْعِبَادَةُ (مسند احمد، حدیث نمبر 18386)۔ یعنی، دعا ہی عبادت ہے۔
- الدُّعَاءُ مُخُّ العِبَادَةِ (سنن الترمذی، حدیث نمبر 3371)۔ یعنی، دعا عبادت کا مغز ہے۔
- مَنْ لَمْ يَسْأَلِ اللّٰهَ يَغْضَبْ عَلَيْهِ (سنن الترمذی، حدیث نمبر 3373)۔ یعنی، جو شخص اللہ سے نہیں مانگتا اللہ اس پر غضب ناک ہوتا ہے۔
- لَا يَرُدُّ الْقَضَاءَ إِلَّا الدُّعَاءُ (سنن الترمذی، حدیث نمبر 2276)۔ یعنی، قضا کو صرف دعا ہی ٹال سکتی ہے۔
- مَا مِنْ أَحَدٍ يَدْعُو بِدُعَاءٍ إِلَّا آتَاهُ اللّٰهُ مَا سَأَلَ أَوْ كَفَّ عَنْهُ مِنَ السُّوءِ مِثْلَهُ، مَا لَمْ يَدْعُ بِإِثْمٍ أَوْ قَطِيعَةِ رَحِمٍ (سنن الترمذی، حدیث نمبر 3381)۔ یعنی، کوئی شخص جب اللہ سے دعا کرتا ہے تو اللہ یا تو اس کو وہ چیز دے دیتا ہے جو اس نے مانگی تھی یا اس کے برابر کوئی بلا اس سے روک دیتا ہے جب تک کہ وہ کسی گناہ کی یا قطع رحمی کی دعا نہ کرے۔
- لَيْسَ شَيْءٌ أَكْرَمَ عَلَى اللّٰهِ سُبْحَانَهُ مِنَ الدُّعَاءِ (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 3829)۔ یعنی، اللہ کے نزدیک دعا سے زیادہ بہتر کوئی چیز نہیں۔

- سَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهِ، فَإِنَّ اللّٰهَ عز وجل يُحِبُّ أَنْ يُسْأَلَ (سنن الترمذی، حدیث نمبر 3571)۔ یعنی، اللہ سے اس کا فضل مانگو۔ کیونکہ اللہ پسند کرتا ہے کہ اس سے مانگا جائے۔
- إِنَّ الدُّعَاءَ يَنْفَعُ مِمَّا نَزَلَ وَمِمَّا لَمْ يَنْزِلْ، فَعَلَيْكُمْ عِبَادَ اللّٰهِ بِالدُّعَاءِ (سنن الترمذی، حدیث نمبر 3548)۔ یعنی، دعا ان چیزوں کے لیے بھی مفید ہے جو اُتر چکی ہیں اور ان چیزوں میں بھی جو ابھی نہیں اُتریں۔ تو اے اللہ کے بندو، تم ضرور دعا مانگو۔
- لِيَسْأَلْ أَحَدُكُمْ رَبَّهُ حَاجَتَهُ كُلَّهَا حَتَّى يَسْأَلَ شِسْعَ نَعْلِهِ إِذَا انْقَطَعَ (سنن الترمذی، حدیث نمبر 3604)۔ یعنی، تم میں سے ہر ایک کو اپنے رب سے اپنی تمام حاجت مانگنا چاہیے، یہاں تک کہ اگر اس کے جوتے کا تسمہ ٹوٹ جائے تو اس کو بھی وہ خدا سے مانگے۔

دعا کرنے والا اپنے آپ کو عاجز مطلق کے مقام پر رکھتا ہے اور خدا کو قادر مطلق کے مقام پر۔ دعا ایک طرف اپنی حیثیت واقعی کا اقرار ہے اور دوسری طرف خدا کی حیثیت واقعی کا اعتراف۔ یہ حقیقت پسندی کی آخری شکل ہے اور حقیقت پسندی بلاشبہ اس دنیا کا سب سے بڑا عمل ہے۔ حقیقت واقعہ کے اعتراف سے بڑا کوئی عمل اس امتحان کی دنیا میں نہیں۔

بعضکم من بعض

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ جو عورت اور مرد آسمان اور زمین کی نشانیوں میں غور کرتے ہیں وہ تخلیق کے اس نظام میں خالق کے وجود کو پا لیتے ہیں۔ وہ پکار اٹھتے ہیں کہ کائنات کے خالق

نے اس کو بے مقصد نہیں بنایا۔ پھر خالق کی دریافت ان کو داعی حق کی دریافت تک پہنچاتی ہے۔ وہ اس کا اعتراف کرکے اس کا ساتھ دیتے ہیں تاکہ آخرت میں ان کو نجات یافتہ گروہ میں شامل ہونے کی سعادت حاصل ہو۔ اس کے بعد قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

ان کے رب نے ان کے حق میں ان کی دعا قبول فرمائی اور کہا کہ: میں تم میں سے کسی کا عمل ضائع کرنے والا نہیں، خواہ مرد ہو یا عورت، تم سب ایک دوسرے سے ہو (بَعۡضُكُمۡ مِنۢ بَعۡضٍ)۔ پس جن لوگوں نے ہجرت کی اور جو اپنے گھروں سے نکالے گئے اور میری راہ میں ستائے گئے اور وہ لڑے اور مارے گئے، ان کی خطاؤں کو ضرور میں ان سے دور کردوں گا۔ اور ان کو ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ یہ ان کا بدلہ ہے اللہ کے یہاں اور بہترین بدلہ اللہ ہی کے پاس ہے (3:195)۔

قرآن کے اس بیان میں مرد اور عورت کے لیے (بَعۡضُكُمۡ مِنۢ بَعۡضٍ) کا لفظ آیا ہے۔ یعنی تم آپس میں ایک دوسرے کا جزء ہو:

You are members, one of another.

دوسرے لفظوں میں یہ کہ عورت مرد کا نصف آخر ہے، اور مرد عورت کا نصف ثانی۔ گویا قرآن کے مطابق، مرد اور عورت دونوں ایک دوسرے کے شریک حیات ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے یکساں حصہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے برابر کے ساتھی ہیں۔ انسانی مرتبہ کے لحاظ سے دونوں میں کوئی فرق و امتیاز نہیں۔ جو درجہ ایک کا ہے وہی درجہ دوسرے کا ہے۔

فرق کی دو قسمیں ہیں۔ ایک جسمانی فرق، دوسرا ہے انسانی فرق۔ جسمانی فرق مرد اور مرد، عورت اور عورت میں بھی ہوتا ہے۔ اسی طرح عورت اور مرد کے درمیان بھی جسمانی فرق

پایا جاتا ہے۔ مگر جس طرح مرد اور مرد یا عورت اور عورت میں جسمانی فرق سے انسانی فرق واقع نہیں ہوتا۔ اسی طرح عورت اور مرد کے درمیان جسمانی فرق کا مطلب یہ نہیں کہ دونوں جنسوں کے درمیان انسانی فرق کیا جائے۔ میدان کار کے اعتبار سے دونوں میں تقسیم ہے مگر انسانی مرتبہ کے اعتبار سے دونوں میں کوئی تقسیم نہیں۔

جیسا کہ قرآن میں بتایا گیا ہے، دنیا کی طرح آخرت میں بھی مرد اور عورت کا معاملہ یکساں ہے۔ دونوں کا یکساں طور پر حساب لیا جائے گا۔ دونوں کے قول وعمل کو ایک ہی معیار پر جانچا جائے گا۔ جو چیز مرد کے لیے نجات کا ذریعہ ہوگی، وہی عورت کے لیے بھی نجات کا ذریعہ ہوگی۔ اور جو چیز عورت کی فلاح وکامیابی کا فیصلہ کرے گی وہ مرد کے لیے بھی فلاح و کامیابی کی ضامن ہوگی۔

جانچ کا وہ معیار کیا ہے، مذکورہ آیتوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ معیار یہ ہے — کائنات میں غور وفکر سے معرفت حاصل کرنا، خداوند عالم کا اقرار، خدا کے پیغمبر پر ایمان، آخرت کی تڑپ، خدا کے لیے ہجرت۔ خدا کی راہ میں جدوجہد، تقوی، خشوع اور صبر۔

کائنات معرفت کا خزانہ ہے۔ مرد اور عورت جب اس میں گہرائی کے ساتھ غور کرتے ہیں تو ان کو اس سے روحانی غذا ملتی ہے، ان کو اس میں حق کی تجلیاں دکھائی دیتی ہیں۔ اس طرح کائنات میں غور کرکے وہ خالق کائنات کو پالیتے ہیں۔

کائنات کی معنویت اور خدا کی موجودگی کی دریافت ان کو بتاتی ہے کہ کوئی مرد یا عورت اس دنیا میں آزاد نہیں ہوسکتا۔ ضروری ہے کہ ہر ایک سے اس کے قول وعمل کا حساب لیا جائے۔ اور اس کے ریکارڈ کے مطابق اس کو اس کا بدلہ دیا جائے۔ وہ خدا پر ایمان کے ساتھ پیغمبر خدا پر ایمان کے لیے بھی مجبور ہوجاتا ہے کیونکہ پیغمبر کی رہنمائی کے بغیر خدا کی عبادت واطاعت نہیں کی جاسکتی۔

ہجرت سے مراد محض ترک وطن نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی مرد یا عورت اللہ کی خاطر ان چیزوں کو چھوڑ دے جن سے اللہ نے منع کیا ہے۔نا مطلوب کو چھوڑ نا اور مطلوب کو لینا، یہ ایک مستقل عمل ہے جو مومن اور مومنہ کی پوری زندگی میں ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ اس طرح ان کی زندگی سراپا جدو جہد کی زندگی بن جاتی ہے۔اس عمل کے دوران وہ بار بار تقوی اور خشوع کی کیفیات کا تجربہ کرتے ہیں۔وہ اللہ کی خاطر صبر کرنے والے بن جاتے ہیں۔

خاتون جنت

اسلام میں خواتین کا مقام

عورت، مرد

اسلام کے مطابق، عورت اور مرد یکساں درجہ میں عزت اور تکریم کے مستحق ہیں۔ قرآن (3:195) میں فرمایا کہ میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع نہیں کروں گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔ تم آپس میں ایک دوسرے کا جزء ہو (You are members, one of another)۔

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مرد کی طہارت کا مسئلہ دریافت کیا گیا۔ آپ نے مسئلہ بیان کیا تو ایک عورت نے پوچھا: فَلِلْمَرْأَةِ تَرَى ذٰلِكَ أَعَلَيْهَا غُسْلٌ؟۔ یعنی، عورت کے ساتھ بھی ایسا ہی پیش آئے تو کیا اس پر غسل ہے۔ آپ نے جواب دیا: نَعَمْ، إِنَّمَا النِّسَاءُ شَقَائِقُ الرِّجَالِ (سنن ابو داؤد، حدیث نمبر 236)۔ یعنی، عورتیں مردوں کا نصفِ ثانی ہیں۔

شقیق یا شقیقہ کے معنی ہیں دو برابر کے حصوں میں پھٹی ہوئی چیز کا آدھا حصہ۔ اسی لیے بھائی کو شقیق اور بہن کو شقیقہ کہتے ہیں۔ اس حدیث کا صحیح ترجمہ یہی ہے کہ عورتیں مردوں کا دوسرا نصف ہیں۔ اس کو دوسرے لفظوں میں اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں کہ عورت مرد کی شریک حیات ہے، اور اسی طرح مرد عورت کا شریک حیات۔ دونوں یکساں طور پر ایک دوسرے کے ساتھی ہیں۔

کسی ایک فرد کے اندر تمام مطلوب صفات نہیں ہوسکتیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے صفات انسانی کو دو ہستیوں میں بانٹ دیا ہے۔ عورت کے اندر نرمی والی صفات رکھ دیں تا کہ وہ مرد کے لیے سکون کا باعث ہو (الروم، 30:21)، اور دوسری طرف مرد کے اندر قوامیت والی صفات رکھ دیں تا کہ عورت اس سے اعتماد حاصل کر سکے (النساء، 4:34)۔

صفات کے اس فرق کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اکثر حالات میں دونوں کا میدان کار الگ الگ ہوجاتا ہے۔ اس علیحدگی کا مزید فائدہ یہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے لیے بہترین مشیر بن جاتے ہیں۔ اپنے دائرہ کار کے اعتبار سے ان میں کا ایک جن باتوں کے درمیان گھرا ہوا ہوتا ہے، دوسرا اس سے غیر متعلق رہ کر آزادانہ طور پر سوچنے کے قابل ہوجاتا ہے۔ اس طرح دونوں کے لیے یہ ممکن ہوجاتا ہے کہ جب ان میں کا ایک متاثر ذہن کے تحت سوچے تو ان میں کا دوسرا غیر متاثرہ ذہن کے تحت اس کی رہنمائی کرسکے۔

خاتون جنت

قرآن میں وہ تمام بنیادی صفات بتائی گئی ہیں جو جنتی خاتون میں ہونا ضروری ہیں۔ یہ صفتیں کسی عورت کو مغفرت اور اجر عظیم کا مستحق بناتی ہیں۔ وہ اس کے لیے آخرت کے عذاب سے نجات کو یقینی بنانے والی ہیں۔ (الاحزاب، 33:35) اور (التحریم، 66:5) کے مطابق وہ صفات حسب ذیل ہیں:

ایمان، اسلام، قنوت، صدق، صبر، خشوع، صدقہ، صوم، حفظ فروج، ذکر اللہ، توبہ، عبادت، سیاحت۔

1۔ ایمان سے مراد معرفت رب ہے۔ یعنی اپنے خالق ومالک کو اس طرح شعوری طور پر دریافت کرنا کہ وہ آپ کی سوچ پر چھا جائے۔ وہ آپ کے دل کے اندر سما جائے۔ آپ کی پوری شخصیت خدا کے نور سے نہا اٹھے۔

2۔ اسلام کے معنی اطاعت کے ہیں۔ اس سے مراد اپنے آپ کو اللہ کے تابع بنانا ہے۔ یعنی آپ کا نفس اللہ کی اطاعت پر پوری طرح قائم ہوجائے۔ آپ اللہ کی پیروی میں اپنی زندگی گزارنے لگیں۔ آپ کی مرضی کا ہر قولی یا عملی اظہار عین اس کے مطابق ہو جس کا اللہ نے حکم فرمایا ہے۔

3۔قنوت کا مطلب مخلصانہ فرماں برداری ہے۔اس سے مراد یہ کہ ذہن کی پوری یکسوئی اور دل کی پوری آمادگی کے ساتھ اس طریقہ کو اختیار کرلیا جائے جو خدا اور رسولؐ نے بتایا ہے۔ تعمیل حکم میں جب قلب کا جھکاؤ اور خضوع شامل ہوجائے تو اسی کو قنوت کہا جاتا ہے۔

4۔صدق کے معنی سچائی کے ہیں۔اس سے مراد قول اور عمل کی مطابقت ہے، یعنی وہی کہنا جو آپ کو کرنا ہے اور وہی کرنا جو آپ نے اپنی زبان سے کہا ہے۔لوگوں کے درمیان آپ ایک صاحب کردار خاتون کی حیثیت سے زندگی گزاریں۔

5۔صبر ایک بہادرانہ صفت ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ دین کے احکام پر چلنے کے لیے اگر تکلیف اٹھانا پڑے تب بھی اس سے نہ ہٹنا۔نفس اور شیطان کا مقابلہ کرتے ہوئے دینی تقاضوں پر جمے رہنا۔مخالفانہ محرکات کے باوجود خدائی راستہ کو نہ چھوڑنا۔

6۔خشوع سے مراد تواضع اور خاکساری ہے۔خدا کی بڑائی اور اس کے کامل اختیار کے تصور سے کسی کے اندر جو کیفیت پیدا ہوتی ہے اسی کو خشوع کہا جاتا ہے۔یہ احساس مومن اور مومنہ کو خدا کے آگے بالکل جھکا دیتا ہے۔خدا کے خوف سے ان کے دل لرزا ٹھتے ہیں اور ان کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔

7۔صدقہ کا مطلب خیرات ہے۔یعنی آپ اپنے مال میں سے دوسرے ضرورت مندوں کا حق نکالیں۔جس طرح اپنی ضرورت کا احساس آپ کو اپنے اوپر خرچ کرنے کے لیے مجبور کرتا ہے اسی طرح دوسرے حاجت مندوں کی امداد سے بھی بے پروانہ رہیں۔

8۔صوم کا مطلب اللہ کے لیے روزہ رکھنا ہے۔روزہ شکر کی تربیت ہے۔روزہ رکھنا گویا اپنے آپ کو اس حالت کی طرف لے جانا ہے جب کہ آپ خدا کے مقابلہ میں اپنی محتاجی کا تجربہ کریں۔اور پھر آپ کے اندر اس رزق کے اوپر خدا کے شکر کا جذبہ بیدار ہو جو اس نے اپنے خزانہ رحمت سے آپ کو عطا کیا ہے۔

9۔ حفظ فروج کا لفظی مطلب شرمگاہوں کی حفاظت ہے۔ یعنی دنیا کی زندگی میں عفت اور پاک دامنی کا طریقہ اختیار کرنا اور بے حیائی والے اعمال سے بچنا۔ حیا کا فطری پردہ جو خدا نے پیدا کیا ہے اس کا پورا لحاظ رکھنا۔

10۔ ذکر اللہ کا مطلب اللہ کی یاد ہے۔ خدا کو بہت زیادہ یاد کرنا خدا کی معرفت کا لازمی نتیجہ ہے۔ جو کوئی خدا کو حقیقی طور پر پالیتا ہے اس کا حال یہ ہوجاتا ہے کہ ہر موقع پر اس کو خدا کی یاد آتی ہے۔ اس کی روح خدا کے تصور سے اس طرح سرشار ہوجاتی ہے کہ بار بار اس کو خدا کی یاد آتی رہے۔

11۔ توبہ کے لفظی معنی ہیں پلٹنا۔ یعنی غلطی کرنے کے بعد پھر صحیح روش کی طرف لوٹ آنا۔ یہ کسی مومنہ کی خاص صفت ہے۔ امتحان کی اس دنیا میں ہر ایک سے بار بار غلطیاں ہوتی ہیں۔ ایسے موقع پر یہ ہونا چاہیے کہ نفس کے غلبہ سے جب وقتی طور پر کسی سے غلطی ہوجائے تو اس کے بعد خدا کی پکڑ کا احساس اس پر طاری ہو اور وہ فوراً پلٹ کر خدا سے معافی مانگنے لگے۔

12۔ عبادت سے مراد پرستش ہے۔ یعنی وہ خاشعانہ عمل جو خدا کی عظمت اور برتری کو مان کر اس کے سامنے کیا جائے۔ اس قسم کی پرستش اللہ کے سوا کسی اور کے لیے جائز نہیں۔ جنتی خاتون کی پہچان یہ ہے کہ وہ صرف ایک خدا کی پرستار بن گئی ہو۔

13۔ سیاحت سے مراد روزہ جیسے ریاضتی اعمال ہیں۔ اس کی روح زہد ہے۔ کسی مومنہ پر جب آخرت کی فکر اتنی زیادہ غالب آجائے کہ وہ دنیا سے بے رغبت ہوجائے اور دنیا کی چیزوں میں اس کا شوق باقی نہ رہے تو اس وقت اس کی جو زاہدانہ زندگی بنتی ہے اسی کو یہاں سیاحت کہا گیا ہے۔

فطرت کا نظام

قرآن میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں ہر چیز کو جوڑے جوڑے کی صورت میں بنایا ہے: وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ (51:49)۔
اسی اصول فطرت کے مطابق انسان کو بھی دو حصوں کی صورت میں تخلیق کیا گیا ہے۔ اس کا ایک حصہ مرد ہے اور اس کا دوسرا حصہ عورت۔ یہ خود خالق فطرت کا تخلیقی منصوبہ ہے۔ ہر مرد اور عورت پر لازم ہے کہ وہ اس منصوبہ کو تسلیم کرے۔ اس کو رد کرکے زندگی کا کوئی اور نقشہ بنانا کسی کے لیے ممکن نہیں۔ اس فطری منصوبہ کو ماننے ہی کا نام کامیابی ہے اور اس کو نہ ماننے کا نام ناکامی۔

زوجین کی اس تقسیم کا تقاضا ہے کہ اس کا ہر فریق اپنی حیثیت کو اور اپنے کارمنصبی کو جانے۔ مرد کو یہ جاننا ہے کہ اس کے حقوق اور اس کی ذمہ داریاں کیا ہیں۔ اسی طرح عورت کو یہ جاننا ہے کہ اس کے حدود کار کیا ہیں۔ زندگی کے نظام میں خالق فطرت نے اس کو کیا درجہ عطا فرمایا ہے۔

ایک لفظ میں اس کا جواب یہ ہے کہ مرد باہر کا منتظم کار ہے اور عورت گھر کی سردار ہے۔ اصولی تقسیم کے مطابق، مرد کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ باہر کے معاملات کو سنبھالے، اور عورت کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ گھر کے امور کو سنوارے اور ان کو درست کرے۔

تاہم اس تقسیم کار کو خوش اسلوبی کے ساتھ چلانے کے لیے ضروری ہے کہ دونوں ایک دوسرے کی نزاکتوں کو سمجھیں، دونوں ایک دوسرے کے ساتھ کامل تعاون کریں۔

مثلاً مرد جو ماہانہ رقم کماتا ہے، عورت اگر گھر کے اخراجات کا بجٹ اس سے زیادہ بنائے

تو گھر کے نظام کا خوش اسلوبی کے ساتھ چلنا ناممکن ہو جائے گا۔ اسی طرح مرد اپنے جن رشتہ داروں کو عزیز رکھتا ہے، عورت ان کے ساتھ رقابت قائم کر لے۔ مرد جن لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کرنا چاہتا ہے، عورت ان کو اپنا دشمن سمجھ لے۔ مرد سماج کے اندر جن تعلقات کو نبھانا چاہتا ہے، عورت ان کو توڑنے کے درپے ہو جائے۔ مرد وسیع تر مفاد کی خاطر جن لوگوں کو دوست رکھنا چاہتا ہے، عورت ان سے قطع تعلق کی وکیل بن جائے۔

اس قسم کی تمام باتیں فطرت کے نظام میں خلل ڈالنے کے ہم معنی ہیں۔ جب بھی کوئی عورت ایسا کرے گی تو وہ صرف ایک مرد سے عدم موافقت کرنے والی نہیں ہوگی بلکہ وہ خود نظام فطرت سے عدم موافقت کی مجرم قرار پائے گی۔

عورت پر لازم ہے کہ وہ صرف اپنے جذبات کو رہنما نہ بنائے، بلکہ خالق فطرت کے منصوبہ پر نظر رکھے۔ وہ اس حقیقت کا اعتراف کرے کہ وہ انسانیت کے وجود کا نصف ہے، نہ کہ کل۔ اس کو اپنے جذبات کے ساتھ نظام فطرت کو بھی دیکھنا ہے، اور جہاں اس کے ذاتی احساسات اور فطرت میں ٹکراؤ ہو وہاں اپنے احساسات کو دبانا ہے، اور فطرت کے نظام کو خوش دلی کے ساتھ اختیار کر لینا ہے۔

کائنات کا نظام اسی موافقت باہمی کے اصول پر چل رہا ہے۔ کائنات کا ہر جزء پورے جذبہ اطاعت کے ساتھ دوسرے اجزاء کائنات کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر اپنا وظیفہ ادا کر رہا ہے۔ یہی معاملہ گھر کے نظام میں بھی مطلوب ہے۔ یہاں بھی عورت کو گھر کے مجموعی نظام سے ہم آہنگی اختیار کرتے ہوئے اپنی زندگی کا نقشہ بنانا ہے۔ اسی ہم آہنگی میں اس کے لیے ہر قسم کی سعادت اور ترقی کا راز چھپا ہوا ہے۔

گھر کے نظام کو خوش اسلوبی کے ساتھ چلانے کے لیے عورت کو اپنے ساتھ دوسروں کے

جذبات کی رعایت کرنا ہے۔ اس کو اپنے حقوق کے ساتھ اپنی ذمہ داریوں سے بھی آگاہ ہونا ہے۔ اس کو اپنے خونی رشتوں کے احترام کے ساتھ اپنے غیر خونی رشتوں کا بھی پورا لحاظ رکھنا ہے۔ اور یہ سب کچھ یہ سمجھ کر کرنا ہے کہ وہ کسی مرد یا کسی عورت کے سامنے نہیں جھک رہی ہے، بلکہ خالق فطرت کے آگے جھک رہی ہے، کیوں کہ خالق فطرت کی مرضی یہی ہے۔

زوجین کے اصول کا ابتدائی مطلب یہ ہے کہ مرد کے ساتھ عورت ہے اور عورت کے ساتھ مرد۔ مگر وسیع تر معنی میں وہ پوری زندگی کو سموئے ہوئے ہے۔ وسیع تر انطباق کے اعتبار سے اس اصول کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں ہر مرد اور عورت ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ زندگی عالمی انسانی اشتراک کا ایک نظام ہے۔ کوئی مرد یا کوئی عورت اس عمومی زنجیر کی صرف ایک کڑی ہے۔ ایک کڑی کے ٹوٹنے سے پوری زنجیر ٹوٹ جاتی ہے۔ اس لیے ہر کڑی کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی سالمیت کو آخری حد تک باقی رکھے تا کہ فطرت کا قائم کردہ نظام حیات شکست وریخت کا شکار نہ ہونے پائے۔

تقسیم کار

ابن ماجہ کی ایک روایت کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دنیا کی چیزوں میں سے کوئی چیز بھی صالح بیوی سے بہتر نہیں: لَيْسَ مِنْ مَتَاعِ الدُّنْيَا شَيْءٌ أَفْضَلَ مِنَ الْمَرْأَةِ الصَّالِحَةِ (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 1855)۔ عورت کی اس خصوصیت کے بہت سے پہلو ہیں۔ ان میں سے ایک پہلو یہ ہے کہ صالح عورت اپنی مخصوص حیثیت کی بنا پر مرد کی بہترین ساتھی اور بہترین مشیر ہے۔ اس معاملہ کو سمجھنے کے لیے یہاں اس نوعیت کے دو واقعے نقل کیے جاتے ہیں۔

1۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی وحی مکہ کے قریب غار حرا میں اتری۔ یہ آپ کے لیے ایک غیر متوقع تجربہ تھا۔ آپ غار سے نکل کر اپنے گھر میں واپس آئے تو روایات کے مطابق آپ کانپ رہے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے کمبل اڑھاؤ۔ حضرت خدیجہؓ نے آپ کو کمبل اڑھا دیا۔ کچھ دیر کے بعد جب آپ کی دہشت کم ہوئی تو آپ نے حضرت خدیجہؓ سے وہ پورا قصہ بیان کیا جو غار حرا کی تنہائی میں آپ کے ساتھ پیش آیا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ یہ واقعہ اتنا سخت تھا کہ مجھ کو اپنی جان کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ حضرت خدیجہؓ نے آپ کو تسلی دیتے ہوئے اس وقت یہ الفاظ کہے: كَلَّا وَاللّٰهِ مَا يُخْزِيكَ اللّٰهُ أَبَدًا، إِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ، وَتَحْمِلُ الْكَلَّ، وَتَكْسِبُ الْمَعْدُومَ، وَتَقْرِي الضَّيْفَ، وَتُعِينُ عَلَى نَوَائِبِ الْحَقِّ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 3)۔ ہرگز نہیں، خدا کی قسم، اللہ آپ کو کبھی رسوا نہ کرے گا، آپ رشتہ داروں کے حقوق ادا کرتے ہیں، کمزوروں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، گمنام لوگوں کو کماتے ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں اور قدرتی آفتوں کے شکار لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔

حضرت خدیجہؓ نے آپ کو تسلی دینے کے لیے جو کلمات کہے وہ بلاشبہ اپنے موقع کے لحاظ سے بہترین کلمات تھے۔ یہاں یہ سوال ہے کہ حضرت خدیجہؓ کے لیے کیسے یہ ممکن ہوا کہ اس نازک موقع پر ایسے پر اعتماد الفاظ کہہ سکیں۔ اس کی خاص وجہ آپ کا مذکورہ طوفان خیز تجربہ سے الگ رہنا ہے۔ زندگی کی سرگرمیوں میں بار بار ایسے گمبھیر مسائل آتے ہیں جن میں بعض اوقات وہ شخص غیر متاثر رائے قائم نہیں کر پاتا جو خود مسئلہ کے اندر گھرا ہوا ہو۔ ایسے وقت میں ضرورت ہوتی ہے کہ آدمی کے پاس ایک ایسا مشیر ہو جو خود مسئلہ سے متعلق نہ ہو تا کہ اس کی بابت وہ غیر متاثر ذہن کے تحت رائے قائم کر سکے۔ حضرت خدیجہؓ کا مذکورہ قول اسی کی ایک مثال ہے۔

اسلام نے عورت اور مرد کے درمیان تقسیم کار کا اصول رکھا ہے، اس تقسیم سے جو فوائد

حاصل ہوتے ہیں ان میں سے ایک فائدہ یہ بھی ہے۔عورت اپنے شعبہ میں مصروف ہوتی ہے اور مرد اپنے شعبہ میں۔ اس طرح دونوں ایک دوسرے کے معاملات سے براہ راست طور پر غیر متعلق ہو جاتے ہیں۔ ہر فریق اس پوزیشن میں ہوتا ہے کہ دوسرے فریق کے معاملہ میں غیر متاثر ذہن کے ساتھ سوچے۔ اور اپنے بے لاگ مشورہ سے اس کی مدد کر سکے۔ اس تقسیم کار کے نتیجہ میں عورت اور مرد دونوں کو ایسے قابل اعتماد ساتھی مل جاتے ہیں جو ایک دوسرے کے لیے بہترین مشیر بن سکیں۔

2۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب قریش مکہ سے وہ معاہدہ کیا جو معاہدہ حدیبیہ کے نام سے مشہور ہے، تو صحابہ میں سخت بے چینی پھیل گئی۔ کیونکہ یہ معاملہ بظاہر دب کر کیا گیا تھا اور اس میں کئی باتیں صریح طور پر مخالفین کے حق میں تھیں۔لوگوں میں اس قدر غم وغصہ تھا کہ معاہدہ کی تکمیل کے بعد جب آپ نے لوگوں کو حکم دیا کہ قربانی کے جانور جو تم اپنے ساتھ لائے ہو، یہیں ذبح کر دو اور سر منڈالو تو ایک شخص بھی اس کے لیے نہ اٹھا۔آپ نے تین بار اپنے حکم کو دہرایا پھر بھی سب لوگ خاموش رہے۔آپ رنج کی حالت میں وہاں سے لوٹ کر اپنے خیمہ میں گئے جہاں آپ کی اہلیہ ام سلمہؓ موجود تھیں۔ انہوں نے آپ کو غم گین دیکھ کر پوچھا تو آپؐ نے فرمایا کہ آج وہ ہوا جو اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ میں نے مسلمانوں کو حکم دیا مگر ان میں سے کوئی بھی میرے حکم کی تعمیل کے لیے نہ اٹھا۔

ام سلمہؓ نے کہا۔ اے اللہ کے رسولؐ۔ اگر آپ کی رائے یہی ہے تو آپ میدان میں تشریف لے جائیں اور کسی سے کچھ کہے بغیر اپنا قربانی کا جانور ذبح کریں اور سر منڈا لیں۔ آپ خیمہ سے باہر نکلے اور کسی سے کچھ کہے بغیر اپنی قربانی ذبح کی اور نائی کو بلا کر سر منڈایا۔ جب صحابہ نے یہ دیکھا تو سب نے اٹھ کر اپنی اپنی قربانیاں ذبح کر دیں۔ کیونکہ انہوں نے

محسوس کرلیا کہ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے (مسند احمد، حدیث نمبر 18910)۔

حضرت خدیجہؓ کی طرح ام سلمہؓ کو اس نازک مواقع پر جو قیمتی بات سوجھی، وہ اس لیے سوجھی کہ وہ اصل معاملہ سے الگ تھیں۔ اور اس بنا پر وہ اس پوزیشن میں تھیں کہ غیر متاثر ذہن کے تحت اس کے بارے میں رائے قائم کرسکیں۔ بصورت دیگران کے لیے ایسا کرنا شاید ممکن نہ ہوتا۔

بہترین خزانہ

قرآن میں ہے کہ: اے ایمان والو، اہل کتاب کے اکثر علما اور مشائخ لوگوں کے مال باطل طریقوں سے کھاتے ہیں اور لوگوں کو اللہ کے راستہ سے روکتے ہیں۔ اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور ان کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ان کو ایک دردناک عذاب کی خوشی خبری دے دو۔ اس دن اس مال پر دوزخ کی آگ دہکائی جائے گی۔ پھر اس سے ان کی پیشانیاں اور ان کے پہلو اور ان کی پیٹھیں داغی جائیں گی — یہی ہے وہ جس کو تم نے اپنے واسطے جمع کیا تھا۔ پس اب چکھو جو تم جمع کرتے رہے (9:34-35)۔

یہ آیت قرآن میں اتری تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بُرا ہو سونے کا اور بُرا ہو چاندی کا (مسند احمد، حدیث نمبر 23101)۔ یہ بات صحابہ پر بہت شاق گزری۔ انہوں نے آپس میں کہا کہ پھر اور کون سا مال ہم اپنے پاس رکھیں۔ حضرت عمر فاروق ؓ نے کہا کہ اگر تم چاہو تو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جا کر اس کی بات دریافت کروں۔ لوگوں نے کہا کہ ضرور۔

اس کے بعد حضرت عمر فاروق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے اور کہا کہ آپ کے اصحاب پر یہ بات بہت شاق ہو رہی ہے، وہ کہہ رہے ہیں کہ پھر ہم کون سا مال اکٹھا

کریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نَعَمْ! فَيَتَّخِذَ أَحَدُكُمْ لِسَانًا ذَاكِرًا، وَقَلْبًا شَاكِرًا، وَزَوْجَةً تُعِينُ أَحَدَكُمْ عَلَى إِيمَانِهِ (مسند احمد، حدیث نمبر 829)۔ ہاں تم میں سے جس شخص کو اپنانا ہے وہ خدا کو یاد کرنے والی زبان کو اپنائے، وہ شکر کرنے والا دل اپنائے اور ایک ایسی بیوی کو اپنائے جو اس کے دین میں، اس کی آخرت کے معاملہ میں اس کی مدد کرے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا میں تم کو بتاؤں کہ بہترین خزانہ کیا ہے جس کو آدمی اپنے لیے جمع کرے۔ بہترین خزانہ وہ صالح عورت ہے کہ جب مرد اس کی طرف دیکھے تو وہ اس کو خوش کر دے اور جب وہ اس سے کوئی بات کہے تو وہ اس کی تعمیل کرے۔ اور جب وہ گھر میں موجود نہ ہو تو نفس اور مال میں اس کی حفاظت کرے:

أَلَا أُخْبِرُكَ بِخَيْرِ مَا يَكْنِزُ الْمَرْءُ؟ الْمَرْأَةُ الصَّالِحَةُ، إِذَا نَظَرَ إِلَيْهَا سَرَّتْهُ، وَإِذَا أَمَرَهَا أَطَاعَتْهُ، وَإِذَا غَابَ عَنْهَا حَفِظَتْهُ (سنن ابو داؤد، حدیث نمبر 1664)

وفي رواية□ فِي نَفْسِهَا وَمَالِهِ (المعجم الاوسط للطبرانی، حدیث نمبر 2115)۔

اس حدیث میں عورت کو کسی مرد کے لیے سب سے اچھا خزانہ کہا گیا ہے۔ اور یہ بات صد فیصد درست ہے۔ سونا اور چاندی یا مال صرف مادی ضرورت پورا کرتے ہیں۔ مگر ایک صالح خاتون گھر کو اور خاندان کو خوشی اور سکون اور محبت کا گہوارہ بناتی ہے۔

ایک صالح خاتون اپنے میٹھے بول سے گھر میں مٹھاس بکھیرتی ہے۔ وہ اپنے اچھے اخلاق سے پورے ماحول کو انسانیت کا ماحول بناتی ہے۔ اس کا شریفانہ برتاؤ ہر ایک کو شرافت کی تربیت دینے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ اس کی پیدائشی نرمی اس کو نرم گفتار اور نرم کردار بناتی ہے، اور پھر گھر کی پوری فضا اسی رنگ میں رنگ جاتی ہے۔

عورت اپنی فطری صلاحیت اور اپنے فطری حالات کے اعتبار سے گھر کی انچارج ہے۔

گھر کے نظام میں اس کو مرکزی شخصیت کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔ اس لیے گھر کے بننے یا بگڑنے میں اس کا رول بے حد اہم ہے۔ ایک عورت کے بننے سے گھر بنتا ہے اور ایک عورت کے بگڑنے سے گھر بگڑ جاتا ہے۔ اسی لیے عورت کو بہترین خزانہ کہا گیا ہے۔

عورت کی کامیابی کا معیار یہ ہے کہ وہ گھر کو مسرتوں کا باغ بنائے۔ اس کے شوہر کو اور گھر کے دوسرے افراد کو اس سے خوشی کا تحفہ مل رہا ہو۔ ہر ایک کے لیے اس کا وجود نفع بخشی اور فیض رسانی کا ذریعہ بن گیا ہو۔ شوہر کو اور گھر کے افراد کو یہ یقین ہو کہ خواہ وہ موجود ہوں یا غیر موجود ہوں۔ ہمیشہ گھر کے اندر ان کا ذکر خیر خواہی کے ساتھ کیا جائے گا۔ ہمیشہ ان کو وہ سلوک ملے گا جو ان کی دنیا و آخرت کے لیے سب سے بہتر ہو۔

عورت گھر کا خزانہ ہے، بلکہ سب سے اچھا خزانہ، عورت گھر کے باغ کا پھول ہے، بلکہ سب سے اچھا پھول۔ عورت گھر کی دنیا کی روشنی ہے، بلکہ سب سے اچھی روشنی۔ مگر کوئی عورت اپنا یہ فطری کردار اسی وقت ادا کر سکتی ہے جب کہ وہ باشعور ہو، جب کہ وہ اپنے احساسات کے ساتھ دوسروں کے احساسات کو بھی جانے۔ جب کہ اس کے اندر یہ عزم ہو کہ وہ بہر حال اس انسانی کردار کو ادا کرے گی جو خالق نے اس کے لیے مقرر کیا ہے، خواہ اس کے لیے اسے صبر و برداشت کی قربانی کیوں نہ دینا پڑے۔

خیر کثیر

قرآن کی سورۃ نمبر 4 میں ایک مقام پر مردوں کو اس پر تنبیہ کی گئی ہے کہ وہ عورت کی کسی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اس پر ظلم و زیادتی کریں۔ اس سلسلہ میں ضروری احکام دینے کے بعد ایک اصولی اور جامع تعلیم دی گئی ہے جو یہ ہے:

وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَى أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئاً وَيَجْعَلَ اللهُ فِيهِ خَيْراً كَثِيراً (4:19) ۔یعنی، اوران کے ساتھ اچھی طرح گزر بسر کرو۔ اگر وہ تم کو ناپسند ہوں تو ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تم کو پسند نہ ہو مگر اللہ نے اس میں تمہارے لیے بہت بڑی بھلائی رکھ دی ہو۔

اس آیت کا ابتدائی خطاب مردوں سے ہے۔ مگر وسیع تر انطباق کے اعتبار سے اس کا تعلق مرد اور عورت دونوں سے ہے۔ اس میں دونوں ہی کے لیے یکساں رہنمائی موجود ہے۔ نکاح کے بعد خوش اسلوبی کے ساتھ نباہ کرنا، جس طرح مردوں کے لیے ضروری ہے، اسی طرح وہ عورتوں کے لیے بھی ضروری ہے۔

مرد اگر محسوس کرے کہ اس کی ہونے والی بیوی میں کوئی جسمانی یا مزاجی کمزوری ہے تو اس کی بنا پر اسے دل برداشتہ نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ اس کو برداشت کرتے ہوئے عورت کو موقع دینا چاہیے کہ وہ اللہ کی دی ہوئی اپنی دوسری خصوصیات کو بروئے کار لائے اور اس طرح گھر کی تعمیر میں اپنا حصہ ادا کرے۔ شوہر کو چاہیے کہ وہ ظاہری ناپسندیدگی کو بھلا کر باہمی تعلق کو نبھائے۔

یہی معاملہ عورت کا بھی ہے۔ عورت کے ساتھ بھی یہ صورت پیش آسکتی ہے کہ نکاح کے بعد اس کو احساس ہو کہ اس کے شوہر میں فلاں کمزوری ہے۔ وہ سمجھے کہ میری قسمت خراب ہوگئی۔ مگر یہ صحیح نہیں۔ اس کو جاننا چاہیے کہ اس دنیا میں یہ ممکن نہیں کہ کوئی عورت ایسا کامل مرد پالے جس میں اس کے نقطہ نظر سے کسی قسم کی کوئی کمی نہ ہو۔ اس لیے عورت کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ نباہ کے اصول کو اختیار کرے۔ جب وہ ایسا کرے گی تو وہ پائے گی کہ اس کے شوہر میں اگر ایک اعتبار سے کمی تھی تو دوسرے اعتبار سے اس کے اندر ایسی خوبیاں تھیں جن کے ہوتے ہوئے کمی کی کوئی اہمیت نہیں۔

ایسا کرنا کسی عورت یا کسی مرد سے موافقت کرنا نہیں ہے بلکہ وہ خود فطرت کے نظام سے موافقت کرنا ہے۔ اور جب معاملہ کس عورت یا کسی مرد کا نہ ہو بلکہ فطرت کا ہو تو آدمی کے لیے اس کے سوا کوئی اور صورت ممکن ہی نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں کسی خاندان اور اسی طرح کسی معاشرہ کی ترقی و استحکام کا راز یہ ہے کہ اس کے افراد ایک دوسرے کی کمیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے انکی خوبیوں کو ظہور میں آنے کا موقع دیں۔ جو لوگ اللہ کی خاطر موجودہ دنیا میں اس صبر کا ثبوت دیں وہی وہ لوگ ہیں جو آخرت کی جنتوں میں داخلہ کا پروانہ حاصل کریں گے۔

مذکورہ اصول اس سورہ میں اگرچہ شوہر اور بیوی کے تعلق کے بارے میں آیا ہے۔ مگر اس کے اندر ایک عمومی تعلیم بھی موجود ہے۔ قرآن کا یہ عام اسلوب ہے کہ ایک متعین معاملہ کا حکم دیتے ہوئے اس کے درمیان ایسی کلی ہدایت دے دی جاتی ہے جس کا تعلق پوری انسانی زندگی سے ہو۔

دنیا کی زندگی میں انسان کے لیے مل جل کر رہنا بالکل ضروری ہے۔ کوئی عورت یا مرد دوسروں سے الگ تھلگ زندگی نہیں گزار سکتے۔ اب چونکہ لوگوں کی صلاحیتیں مختلف ہیں۔ ہر ایک کی طبیعت الگ الگ ہے اس لیے جب بھی کچھ لوگ مل کر رہیں گے تو ان کے درمیان لازماً اختلاف اور شکایت والی باتیں پیدا ہوں گی، ایسی حالت میں زندگی گزارنے کی قابل عمل صورت صرف یہ ہے کہ شکایتوں کو نظر انداز کیا جائے۔ اور خوش اسلوبی کے ساتھ تعلق کو نبھانے کا اصول اختیار کیا جائے۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اپنے ساتھی کی ایک کمی یا خرابی دوسرے کے سامنے آتی ہے۔ وہ فوراً اس سے دل برداشتہ ہو جاتا ہے اور بس اسی کو لے کر اپنے ساتھی سے روٹھ جاتا ہے۔

حالانکہ اگر وہ سوچے تو وہ پائے گا کہ ہر ناموافق صورت حال میں ایک یا ایک سے زیادہ موافق پہلو موجود ہے۔

مثلاً کسی عورت یا مرد میں اگر ظاہری کشش کم ہو تو اس کے اندر عملی صلاحیت زیادہ ہوگی۔ اگر اس کے مزاج میں کوئی پہلو ناپسندیدہ ہو تو عین ممکن ہے کہ اس کے اندر ذہنی اعتبار سے اعلیٰ صلاحیت موجود ہوں۔ اگر کوئی شخص ابتدائی مرحلہ میں کم پیسہ والا ہے تو اس کے اندر یہ استعداد ہوسکتی ہے کہ وہ محنت کر کے آئندہ بڑی بڑی ترقیاں حاصل کر لے۔

یہ فطرت کا نظام ہے، اور فطرت کے نظام میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔

اخلاق نسواں

اخلاق اس اجتماعی سلوک کا نام ہے جو دوسروں سے معاملات اور تعلقات کے دوران کوئی مرد یا عورت انجام دیتا ہے۔ اسلام کا حکم ہے کہ ایسے ہر موقع پر لوگوں کے ساتھ اچھا اخلاقی سلوک کیا جائے۔ یہ حکم عورت سے بھی اتنا ہی متعلق ہے جتنا کہ وہ مرد سے متعلق ہے۔

آپ کے لیے فرض کے درجہ میں ضروری ہے کہ جب آپ اپنی زبان کھولیں تو جھوٹ کے لیے نہ کھولیں بلکہ سچ کے لیے کھولیں۔ ہمیشہ انصاف کی بات بولیں۔ کسی کے خلاف الزام تراشی نہ کریں۔ بلکہ وہ بات کہیں جس میں دوسروں کے لیے خیر خواہی پائی جاتی ہو۔آپ کا بولنا سچائی کے اظہار کے لیے ہو، نہ کہ سچائی کو چھپانے کے لیے۔ جب کوئی حق آپ کے سامنے پیش کیا جائے تو فوراً اس کا اعتراف کرلیں، آپ کی زبان سے کبھی پست بات نہ نکلے بلکہ جب بھی نکلے تو اعلیٰ انسانیت کی بات نکلے۔ آپ کا کلام تواضع، شرافت، شکر گزاری، خیر پسندی اور اعتراف حق کے احساسات سے بھرا ہوا ہو۔

قرآن میں ہے کہ: مَنۡ عَمِلَ صالِحاً مِنۡ ذَكَرٍ أَوۡ أُنۡثٰى وَهُوَ مُؤۡمِنٌ فَلَنُحۡيِيَنَّهُ حَياةً طَيِّبَةً (16:97)۔ یعنی، جو کوئی نیک عمل کرے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ وہ مومن ہو، تو ہم اس کو جلائیں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ صالح اعمال یا اچھے اخلاق کا تعلق صرف دوسروں سے نہیں ہے، جو لوگ ایسا کریں خود ان کی ذات کو اس کا یقینی فائدہ سب سے پہلے پہنچتا ہے۔

جب آپ سچ بولیں تو اس سے آپ کو ایک خاص قسم کا روحانی سکون ملتا ہے۔ آپ کے اندر ایک بے تضاد شخصیت پرورش پانے لگتی ہے۔ جب خاندان کے ایک فرد سے آپ کو تکلیف پہنچے اور آپ اللہ کی خاطر اس کو بھلا دیں اور اس کے حق میں نیک دعا کریں تو آپ کے اندر انسانی خیر خواہی کا ایک چشمہ ابل پڑتا ہے جس کی ٹھنڈک آپ کے دل و دماغ تک پہنچتی ہے۔ اگر آپ کے لڑکے اور کسی دوسرے لڑکے کے درمیان تکرار ہوتی ہے، اس وقت آپ کا رویہ بیٹے کی طرف داری کا نہیں ہوتا بلکہ حق کی طرف داری کا ہوتا ہے تو ایسی روش سے آپ کو ایک ایسا ذہنی سکون حاصل ہوتا ہے جو بھاری قیمت دے کر بھی خریدا نہیں جا سکتا۔

اوپر کی آیت میں جس چیز کو حیات طیبہ (اچھی زندگی) کہا گیا ہے۔ وہی دنیا میں ضمیر کے اطمینان اور دل کے سکون کا ذریعہ ہے۔ اور یہی حیات طیبہ کسی کو اس قابل بناتی ہے کہ آخرت میں اس کے لیے جنت کے ابدی دروازے کھولے جائیں۔

جنت کس کو ملے گی، اس عورت یا مرد کو جسے یہاں حیات طیبہ ملی۔ جس کا دماغ نور الٰہی سے روشن ہوا۔ جس کے دل میں ربانی کیفیات کے چشمے پھوٹے۔ جس کا سینہ یاد خداوندی کے طوفان سے آشنا ہوا۔ جس کی آنکھوں نے خدائی منظر کے سوا ہر دوسرے منظر کو دیکھنے سے انکار کر دیا۔ جس کے ہاتھ اٹھے تو خدا کے لیے اٹھے۔ جس کے قدم متحرک ہوئے تو خدا کے

لیے متحرک ہوئے۔ جس کی زبان گویا ہوئی تو لوگوں کو اس سے خدائی محبت اور انسانی خیر خواہی کی باتیں سننے کو ملیں۔

حدیث میں ہے کہ تم دوسروں کے ساتھ وہی سلوک کرو جو سلوک اپنے لیے پسند کرتے ہو (صحیح البخاری، حدیث نمبر 13)۔ یہ اصول مومن عورت کے لیے بھی ہے اور مومن مرد کے لیے بھی۔ یہ نہایت سادہ کسوٹی ہے جس سے کوئی عورت یا مرد ہر لمحہ جان سکتا ہے کہ اس کو دوسروں کے ساتھ کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔

ہر ایک کو معلوم ہے کہ بدگوئی اسے پسند نہیں، اس لیے وہ دوسروں کے خلاف بھی بدگوئی نہ کرے اور ہمیشہ میٹھے کلام سے دوسروں کا استقبال کرے۔ اسی طرح ہر ایک کو معلوم ہے کہ اس کے ساتھ خیر خواہی کا معاملہ کیا جائے تو اس کو پسند آئے گا، اب اس کو چاہیے کہ وہ ہر ایک کے ساتھ خیر خواہی برتے، کسی کے ساتھ بھی بدخواہی کا معاملہ نہ کرے۔ ہر ایک کو معلوم ہے کہ کوئی اس کو نفع پہنچائے تو اس کو خوشی ہوتی ہے۔ اب ہر ایک کو چاہیے کہ وہ دوسروں کے لیے نفع بخش بنے، وہ اپنی ذات سے کبھی کسی کو نقصان نہ پہنچائے۔ ہر ایک کو معلوم ہے کہ کوئی شخص اس کی راہ میں رکاوٹ بنے تو ایسی روش اس کو ناپسند ہوتی ہے، اب اس کو سخت احتیاط کرنا چاہیے کہ اس کی کوئی روش کسی کی راہ روکنے کے ہم معنی بن جائے۔

برے اخلاق کی جڑ عام طور پر دو چیزیں ہوتی ہیں — حرص اور غصہ۔ حرص کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنے واجبی حق سے زیادہ کا خواہش مند بن جائے۔ جب بھی کوئی مرد یا عورت اس طرح حرص کا شکار ہو جائیں تو اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر ایسا ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کے لیے تکلیف کا سبب بن جاتے ہیں۔ غصہ یہ ہے کہ آدمی اپنے مزاج کے خلاف باتوں کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہ ہو۔ یہ بہت برا مزاج ہے۔ اس کی بھاری قیمت دینی پڑتی ہے، اور وہ خدا کی رحمت سے محرومی ہے۔

روزمرہ کی زندگی

عورت کی زندگی صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک کیسی ہونی چاہیے۔ اس کا نقشہ شریعت میں مکمل طور پر دیا گیا ہے۔ اس کا ایک خلاصہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

سب سے پہلا کام صبح کو سویرے اٹھنا ہے۔ جو خواتین صبح کو سویرے نہیں اٹھتیں وہ ہر دن کم از کم اپنا بہترین دو گھنٹہ ضائع کرتی ہیں۔ یہ ضائع شدہ وقت ایک دن میں صرف دو گھنٹہ ہوتا ہے۔ لیکن اگر اسی طرح 10 سال ہوتا رہے تو ضائع شدہ گھنٹوں کی مقدار سات ہزار گھنٹوں سے بھی زیادہ ہو جائے گی۔ یہ خاندان کے صرف ایک ممبر کے ضائع شدہ گھنٹے ہیں۔ اسی طرح تمام افرادِ خاندان کے ضائع شدہ گھنٹوں کا شمار کیا جائے تو وہ کتنا زیادہ ہو جائے گا۔

گھر کی خاتون جب سویرے اٹھیں تو دوسرے لوگ بھی سویرے اٹھیں گے۔ پھر سب لوگ وضو کر کے فجر کی نماز ادا کریں گے۔ اس طرح سویرے اٹھنا ایک طرف جسم کو اور دوسری طرف روح کو پاک کرنے کا ذریعہ بن جائے گا۔ اسی طرح صبح کو سویرے اٹھنے کے نتیجہ میں دن بھر کے سارے پروگرام اپنے وقت پر انجام پائیں گے، کیونکہ جب آغاز درست ہو تو انجام بھی یقینا درست رہتا ہے۔

صبح کو سویرے اٹھنے کی صورت میں دن بھر کے تمام پروگرام ٹھیک وقت پر انجام پائیں گے۔ بچے تیار ہو کر وقت پر اسکول پہنچیں گے۔ مرد تیار ہو کر وقت پر اپنے معاشی کام میں لگ جائے گا۔ صبح سویرے گھر کی صفائی ہو جائے گی۔ باورچی خانہ سے لے کر مارکیٹ تک ہر چیز کا نظام ٹھیک طور پر انجام پائے گا۔ گھر کے پورے ماحول میں چستی، باقاعدگی

اور ذمہ داری کی فضا دکھائی دے گی۔ پانچ وقت کی نماز جو ہر مومن اور مومنہ پر فرض ہے، وہ صحیح وقت پر انجام دی جاتی رہے گی۔

مزید آپ کو جاننا چاہیے کہ گھر کا انتظام اور نماز، یہ دونوں الگ الگ چیزیں نہیں ہیں بلکہ نہایت شدت کے ساتھ ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہیں۔

قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ: أَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِي (20:14)۔ یعنی، میری یاد کے لیے نماز قائم کرو۔ اس سے معلوم ہوا کہ پانچ وقت کی نماز دراصل ہر وقت کی نماز کی یاد دہانی ہے۔ یہ ہر وقت کی نماز کیا ہے۔ وہ ذکر ہے، یعنی اللہ کی یاد۔ آپ کو یہ کرنا ہے کہ دن بھر کی تمام سرگرمیوں میں اللہ کو یاد کرتے رہیں۔

صبح کو آپ سو کر اٹھیں تو اس احساس کے ساتھ اٹھیں کہ نیند کیسی عجیب نعمت ہے۔ اس نے کل دن بھر کی میری تھکن دور کر دی۔ اس نے نیا دن شروع کرنے کے لیے مجھے دوبارہ تازہ دم کر دیا۔ یہ احساس آپ کی زبان سے شکر کے کلمات کی صورت میں نکل پڑے۔

اسی طرح دن بھر آپ جو کام کریں وہ سب آپ کو خدا کی یاد دلانے والا بن جائے۔ مثلاً آپ اپنے بچہ کو اسکول جانے کے لیے تیار کر رہی ہیں، اس وقت بچے کو دیکھ کر اگر آپ یہ کہہ اٹھیں کہ ایک انسانی بچہ کیسا عجیب معجزہ ہے، کیسا عجیب رحمت اور عظمت والا ہے وہ خدا جس نے انسانی بچہ جیسی عجیب چیز کی تخلیق کی۔ آپ کا بچہ اگر آپ کے اندر اس قسم کے تصورات جگانے کا ذریعہ بن جائے تو یہ سونے اور چاندی کے تمام ڈھیر سے زیادہ قیمتی ہے۔

آپ باورچی خانہ میں روٹی اور سالن پکا رہی ہیں۔ آپ کو یاد آیا کہ یہ گیہوں، یہ چاول، یہ سبزی قدرت کے کیسے عجیب نمونے ہیں۔ خدا نے کروڑوں سال کے عمل کے دوران زمین کی اوپری تہہ کو زرخیز بنایا۔ اس نے ہائیڈروجن اور آکسیجن کے ایٹموں کو ملا کر حیرت انگیز طور پر

پانی جیسی نعمت پیدا کی۔ اس طرح کے بے شمار اسباب کو وجود دینے کے بعد یہ ممکن ہوا کہ زمین میں کسی چیز کا بیج ڈالا جائے اور وہ پودے اور درخت کی صورت اختیار کرکے انسان کے لیے غذا کی فراہمی کا ذریعہ بن جائے۔ جب آپ اس طرح سوچیں گی تو آپ کا باورچی خانہ اور پورا گھر آپ کے لیے عبادت خانہ بن جائے گا۔ آپ کی نماز صرف پانچ وقت کی نماز نہیں ہوگی بلکہ وہ ذکر کی صورت میں سارے دن اور ساری رات جاری رہے گی۔

اس طرح دن گزارتے ہوئے ظہر کا وقت آتا ہے اور گھر کے تمام افراد نماز ادا کرتے ہیں۔ اسی طرح آپ عصر، مغرب اور عشاء کی نمازیں اپنے اپنے وقت پر پڑھتی ہیں۔ پھر رات کا کھانا کھا کر اللہ کا شکر ادا کرتی ہیں کہ اس نے کائناتی انتظام کے تحت آپ کے لیے پانی اور کھانے کا انتظام کیا۔

عشاء کی نماز اور گھر کے ضروری کاموں کی تکمیل کے بعد وہ وقت آجاتا ہے جب کہ آپ سو جائیں۔ اب آپ معوذتین (قرآن کی آخری دو سورتیں) پڑھ کر اپنے بستر پر سو جائیے۔ جب آپ نے سارا دن پاک خیالات میں گزارا ہے تو اب آپ کو نہایت سکون کی نیند آئے گی۔ رات گزار کر صبح کو اٹھنا آپ کے لیے ایسا بن جائے گا جیسے دوبارہ نئی اور تروتازہ زندگی حاصل کرلینا۔

حسن معاشرت

قرآن کی سورۃ نمبر 49 میں مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کو ایک جامع ہدایت دی گئی ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے: مسلمان سب بھائی بھائی ہیں۔ پس اپنے بھائیوں کے درمیان اصلاح کراؤ اور اللہ سے ڈرو تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔ اے ایمان والو، نہ مرد دوسرے

مردوں کا مذاق اڑائیں، ہوسکتا ہے کہ وہ اس سے بہتر ہوں۔ اور نہ عورتیں دوسروں کا مذاق اڑائیں، ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ اور نہ ایک دوسرے کو طعنہ دو اور نہ ایک دوسرے کو برے لقب سے پکارو۔ ایمان لانے کے بعد گناہ کا نام لگنا برا ہے۔ اور جو باز نہ آئیں تو وہی لوگ ظالم ہیں۔ اے ایمان والوں، بہت سے گمانوں سے بچو، کیونکہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔ اور ٹوہ میں نہ لگو۔ اور تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے۔ کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرے گا کہ وہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے، اس کو تم خود ناگوار سمجھتے ہو۔ اور اللہ سے ڈرو۔ بے شک اللہ معاف کرنے والا، رحم کرنے والا ہے (49:10-12)۔

ان قرآنی آیتوں کا خطاب مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں دونوں سے ہے۔ دونوں ہی کی فلاح کا طریقہ وہ ہے جو ان آیتوں میں بتایا گیا ہے۔

مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں آپس میں کس طرح رہیں، اس کا جواب ایک لفظ میں یہ ہے کہ وہ اس طرح رہیں جس طرح بھائی اور بہن آپس میں رہتے ہیں۔ بھائی اور بہن خونی رشتہ کی بنا پر باہم محبت کے ساتھ مل کر رہتے ہیں۔ اسی طرح دینی بھائیوں اور دینی بہنوں کو بھی محبت اور خیر خواہی کے ساتھ باہم مل کر رہنا چاہیے۔

کوئی عورت یا مرد دوسرے کا مذاق کیوں اڑاتا ہے، اس لیے کہ وہ دوسرے کی بڑائی کو ماننا نہیں چاہتا۔ ہر آدمی کے اندر پیدائشی طور پر بڑا بننے کا جذبہ چھپا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی عورت یا مرد کو جب کسی دوسرے کی کوئی نازک بات مل جائے تو وہ اس کو خوب نمایاں کرتا ہے تاکہ اس طرح دوسرے کو چھوٹا ثابت کرے اور اپنی بڑائی کی تسکین حاصل کر سکے۔

ایسے عورت اور مرد دوسروں کا مذاق اڑاتے ہیں۔ وہ دوسروں پر عیب لگاتے ہیں، وہ

دوسروں کو برے نام سے یاد کرتے ہیں تا کہ اس کے ذریعہ سے اپنے اس جذبہ کو تسکین حاصل کریں کہ وہ دوسروں سے بڑے ہیں۔

مگر اچھا اور برا، یا بڑا اور چھوٹا ہونے کا معیار وہ نہیں ہے جو کوئی عورت یا مرد بطور خود مقرر کرلے۔ اچھا دراصل وہ ہے جو خدا کی نظر میں اچھا ہو، اور برا وہ ہے جو خدا کی نظر میں برا ٹھہرے۔

اگر کسی عورت یا کسی مرد کے اندر فی الواقع اس کا احساس پیدا ہو جائے تو اس کے بعد اس سے بڑائی کا جذبہ چھن جائے گا۔ دوسروں کا مذاق اڑانا، دوسروں کو طعنہ دینا، دوسروں پر عیب لگانا، دوسروں کو برے لقب سے یاد کرنا، اس قسم کی تمام چیزیں ان کو بے معنی معلوم ہونے لگیں گی۔ کیونکہ وہ جانیں گے کہ لوگوں کے درجہ اور مرتبہ کا اصل فیصلہ خدا کے یہاں ہونے والا ہے۔ ایسی حالت میں اگر میں کسی کو حقیر سمجھوں اور آخرت کی حقیقی دنیا میں وہ باعزت قرار پائے تو میرا اس کو حقیر سمجھنا کس قدر بے معنی ہوگا۔

ایک عورت یا مرد کو کسی کے خلاف بدگمانی ہو جائے تو اس کی ہر بات اس کو غلط معلوم ہونے لگتی ہے۔ اس کے بارے میں اس کا ذہن منفی رخ پر چل پڑتا ہے۔ وہ اس کی خوبیوں سے زیادہ اس کے نقائص تلاش کرنے لگتا ہے۔ اس کی برائیوں کو بیان کر کے اسے بے عزت کرنا اس کا محبوب مشغلہ بن جاتا ہے، یہ طریقہ انتہائی حد تک ایمان اور تقویٰ کے خلاف ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اکثر معاشرتی خرابیوں کی جڑ بدگمانی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہر ایک اس معاملہ میں چوکنا رہے، وہ کسی بھی حال میں بدگمانی کو اپنے ذہن میں داخل نہ ہونے دے (مسند احمد، حدیث نمبر 21354)۔

آپ کو کسی کے بارے میں الٹی خبر ملے تو اس کی تحقیق کیجیے۔ آپ کو کسی سے بدگمانی ہو

جائے تو اس سے مل کر اس کے بارے میں اس سے گفتگو کیجیے۔ یہ سخت غیر اسلامی اور غیر اخلاقی بات ہے کہ کسی کی غیر موجودگی میں اس کو برا کہا جائے جب کہ وہ اپنی صفائی دینے کے لیے وہاں موجود نہ ہو۔ وقتی طور پر کبھی کسی عورت یا مرد سے اس قسم کی ایک غلطی ہوسکتی ہے۔لیکن اگر وہ اللہ سے ڈرنے والے ہیں تو وہ اپنی غلطی پر ڈھیٹ نہ ہوں گے۔ ان کا خوف خدا ان کو فوراً اپنی غلطی پر متنبہ کر دے گا۔ پھر وہ اپنی غلط روش کو چھوڑ دیں گے اور اللہ سے معافی کے طالب بن جائیں گے۔(60:8)

مومن کا گھر

قرآن کی سورۃ نمبر 33 میں ازواج مطہرات (پیغمبرؐ کی بیویوں) کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ: اور تم لوگ اپنے گھروں میں قرار سے رہو اور سابقہ جاہلیت کا سا انداز اختیار نہ کرو۔ اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو۔ اللہ تو چاہتا ہے کہ تم اہل بیت سے آلودگی کو دور کرے اور تم کو پوری طرح پاک کر دے اور تمہارے گھروں میں اللہ کی آیات اور حکمت کی جو تعلیم ہوتی ہے اس کو یاد رکھو۔ بے شک اللہ باریک بیں ہے، خبر رکھنے والا ہے (33:33-34)۔

ابتدائی مفہوم کے اعتبار سے ان آیات میں یہ بتایا گیا ہے کہ ازواج رسولؐ کو اپنے گھروں میں کس طرح رہنا چاہیے۔ انہیں جاہلی نمائش کا طریقہ چھوڑ کر متانت کے ساتھ گھر میں قیام کرنا چاہیے۔ ان کے گھر کو ذکر و نماز اور زکوٰۃ و صدقات کی ادائیگی کا مرکز ہونا چاہیے۔ معاملات زندگی میں ان کی روش خدا و رسول کی اطاعت پر مبنی ہونا چاہیے۔ ان کے گھر میں قرآن کی تعلیمات کا چرچا ہونا چاہیے۔ ان کے گھر میں حکمت اور معرفت کی باتوں کا ماحول دکھائی دینا چاہیے۔

پیغمبر اسلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی جس طرح تمام مسلمانوں کی زندگی کے لیے نمونہ تھی، اسی طرح آپ کا گھر بھی تمام گھروں کے لیے نمونہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ قیامت تک تمام مسلم مردوں اور تمام مسلم عورتوں پر لازم ہے کہ وہ اپنے گھروں کو اسی خاص نمونہ پر ڈھالیں جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات میں قائم فرمایا ہے۔

1۔ مسلم خواتین کو اپنے گھروں کو اپنے عمل کا مرکز بنانا چاہیے۔ گھر گویا سماجی زندگی کی ابتدائی اکائی ہے، اور عورت کا کام یہ ہے کہ وہ اس اکائی کو درست کرے۔ کیوں کہ مختلف اکائیوں کا درست ہونا آخر کار پورے سماج کا درست ہونا ہے۔

2۔ مسلم خاتون کے گھر کے ماحول کو سادہ اور بے تکلف ہونا چاہیے، نہ کہ زرق برق اور چمک دمک والا۔ زرق برق گھر میں مادی فضا ہوتی ہے، اور سادہ گھر میں روحانی فضا۔ زرق برق گھر دنیا کی یاد دلاتا ہے، اور سادہ گھر آخرت کی یاد دلاتا ہے۔ زرق برق گھر میں مادی ذہن پرورش پاتا ہے، اور سادہ گھر میں دعوتی اور مقصدی ذہن۔ زرق برق گھر میں ادنیٰ شخصیت کی نشوونما ہوتی ہے، اور سادہ گھر میں اعلیٰ شخصیت پروان چڑھتی ہے۔

3۔ مومن خاتون کا گھر عبادت کا گھر ہوتا ہے — پانچ وقت کی نماز، روزہ اور زکوٰۃ کی ادائیگی، اللہ اور رسولؐ کا چرچا، فضول چیزوں میں مشغولیت کے بجائے دین میں مشغولیت، یہ وہ چیزیں ہیں جو مومنہ و مسلم کے گھر میں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں۔

4۔ اہل اسلام کے گھر میں خدا اور رسولؐ کی اطاعت کا چرچا ہوتا ہے۔ ہر چھوٹے بڑے معاملہ میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس معاملہ میں اللہ کا حکم کیا ہے، اور رسول خدا کی سنت کیا ہے۔ صحابہ کی زندگی میں کیا نمونہ ملتا ہے۔ اس طرح خدائی احکام اور رسولؐ اور صحابہ رسول کے نمونہ سے ہدایت لیتے ہوئے گھر کو ایمان و اسلام کا گھر بنا دیا جاتا ہے۔

5۔مومن کا گھر پاکیزگی کا گھر ہوتا ہے۔جس طرح غسل خانہ میں آدمی نہاتا ہے اور اس سے اس کا مادی جسم پاک ہو جاتا ہے۔ اسی طرح مومن کا گھر روح کی پاکیزگی کا مرکز ہوتا ہے۔اس کی سرگرمیوں میں شرافت، انسانیت، سنجیدگی، اصول پسندی اوراعتراف حق کی خوشبو بسی ہوئی ہوتی ہے۔ جو لوگ اس ماحول میں رہتے ہیں، ان کی شخصیت مسلسل نکھرتی رہتی ہے، یہاں تک کہ وہ اس سے نکلتے ہیں تو وہ ایک ربانی انسان بن چکے ہوتے ہیں۔

لوگ اپنے گھر کو اس لحاظ سے بناتے ہیں کہ دیکھنے والے لوگ اس کو اچھا سمجھیں۔مومن عورت اور مومن مرد اپنا گھر اس لحاظ سے بناتا ہے کہ وہ اللہ کی پسند کے مطابق ہو اور اللہ کے فرشتے وہاں آکر اس کو برکت دیں اور اس کو دنیا وآخرت کی سعادت سے بھر دیں۔

یہاں ازواجِ رسولؐ کو خطاب کرتے ہوئے مسلم عورتوں کو یہ عام ہدایت دی گئی ہے کہ وہ اپنے گھروں میں کس طرح رہیں۔ اور اپنے گھروں کو کس نمونہ پر ڈھالیں۔مسلم خاتون کو عام حالات میں اپنے گھر کے دائرہ میں رہنا چاہیے۔ دنیادار عورتوں کی طرح زیب وزینت کی نمائش کا طریقہ انہیں اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ ان کی توجہ کا مرکز یہ ہونا چاہیے کہ وہ اللہ کی عبادت گزار بن جائیں۔ وہ اپنے اثاثہ کو اللہ کے لیے خرچ کریں۔زندگی کے معاملات میں اللہ اور رسولؐ کا جو حکم ملے اس کو فوراً اختیار کرلیں۔ وہ اللہ اور رسولؐ کی باتوں کو سننے اور سمجھنے میں اپنا وقت گزاریں۔ یہ طرز زندگی وہ ہے جو بندوں کو پاک باز بناتا ہے، اور پاک باز بندے ہی اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں۔

تربیت اولاد

ابوعیسیٰ الترمذی نے اپنی سنن میں اور ابوبکر البیہقی نے شعب الایمان میں ایوب بن موسیٰ کی ایک روایت نقل کی ہے، جس کو انہوں نے اپنے والد سے سنا اور والد نے اپنے

دادا سے سنا۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ باپ کی طرف سے اپنے بیٹے کے لیے اس سے بہتر کوئی عطیہ نہیں کہ وہ اس کو اچھے آداب سکھائے — مانَحَلَ وَالِدٌ وَلَدًا مِنْ نَحْلٍ أَفْضَلَ مِنْ أَدَبٍ حَسَنٍ (سنن الترمذی، حدیث نمبر 1952؛ شعب الإیمان للبیہقی، حدیث نمبر 1554)۔

اس حدیث میں بظاہر صرف والد کا ذکر ہے مگر تبعاً اس سے مراد والد اور والدہ دونوں ہیں۔ نیز ادب کا لفظ یہاں تعلیم وتربیت کے تمام پہلوؤں کے لیے جامع ہے، خواہ وہ مذہبی نوعیت کی چیزیں ہوں یا دنیاوی نوعیت کی چیزیں۔

عورت اور مرد کو فطری طور پر اپنی اولاد سے غیر معمولی محبت ہوتی ہے۔ اس حدیث میں بتایا گیا کہ اس محبت کا بہترین استعمال کیا ہے یا کیا ہونا چاہیے۔ وہ استعمال یہ ہے کہ والدین اپنے بچوں کو آداب زندگی سکھائیں۔ وہ اپنے بچوں کو بہتر انسان بنا کر دنیا کے کارزار میں داخل کریں۔

یہ دیکھا گیا ہے کہ والدین اپنی محبت کا استعمال زیادہ تر اس طرح کرتے ہیں کہ وہ اپنے بچوں کی ہر خواہش پوری کرنے میں لگے رہتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ بچہ جو چاہے وہ اس کے لیے حاضر کر دیا جائے، یہی بچہ کے لیے محبت کا سب سے زیادہ بڑا استعمال ہے، مگر یہ بچوں کے حق میں خیر خواہی نہیں۔

چھوٹا بچہ اپنی خواہشوں کے سوا کچھ اور نہیں جانتا۔ اس کی سوچ بس یہ ہوتی ہے کہ اس کے دل میں جو خواہش آئے وہ فوراً پوری ہو جائے۔ مگر یہ طفلانہ سوچ ہے۔ کیونکہ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ بچہ ایک دن بڑا ہوگا۔ وہ بڑا ہو کر دنیا کے میدان میں داخل ہوگا۔ زندگی کے اس اگلے مرحلہ میں کامیاب ہونے کے لیے بچہ کو جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہ کہ وہ آداب حیات سے مسلح ہو کر وہاں پہنچا ہو۔

بچہ جب بالکل چھوٹا ہو اسی وقت سے اس کی تعلیم وتربیت کا سلسلہ شروع کر دینا چاہیے تا کہ یہ چیزیں عادت بن کر اس کی زندگی میں داخل ہو جائیں۔ زندگی کے ان آداب کے تین خاص پہلو ہیں — دین، اخلاق، ڈسپلن۔

دین کے اعتبار سے بچہ کی تربیت کا آغاز پیدائش کے فوراً بعد ہو جاتا ہے جب کہ اس کے کان میں اذان کی آواز داخل کی جاتی ہے۔ یہ علامتی انداز میں اس بات کا اظہار ہے کہ بچہ کو دین دار بنانے کا عمل آغاز عمر ہی سے شروع کر دینا ہے۔ یہ کام ماں اور باپ دونوں کو کرنا ہے۔

والدین کی یہ کوشش ہونی چاہیے کہ بچہ کے اندر توحید اور اسلامی عقائد خوب پختہ ہو جائیں۔ ذکر اور عبادت اس کی زندگی کے لازمی اجزاء بن کر اس کی شخصیت میں شامل ہو جائیں۔ وہ نماز، روزہ کا پابند ہو۔ صدقہ اور خیرات کا شوق اس کے اندر پیدا ہو جائے۔ قرآن اور حدیث سے اس کو اس قدر شغف ہو جائے کہ وہ روزانہ اس کا کچھ نہ کچھ حصہ مطالعہ کرنے لگے۔ اس کو دیکھ کر ہر آدمی یہ کہہ دے کہ یہ بچہ ایک دین دار بچہ ہے۔

اخلاق کی تربیت کی صورت یہ ہے کہ ہر موقع پر بچہ کو سکھایا جائے۔ اگر وہ غلطی کرے تو اس کو ٹوکا جائے۔ حتیٰ کہ اگر ضرورت ہو تو اس کی تنبیہہ کی جائے۔ بھائی بہنوں میں لڑائی ہو تو فوراً سمجھایا جائے۔ اگر کبھی بچہ جھوٹ بولے یا کسی کو گالی دے۔ یا کسی کی چیز چرا لے تو نہایت سختی کے ساتھ اس کا نوٹس لیا جائے۔ اور یہ سب بالکل بچپن سے کیا جائے تا کہ بچہ کی زندگی میں یہ چیزیں مستقل کردار کے طور پر شامل ہو جائیں۔

یہی طریقہ ڈسپلن کے بارے میں اختیار کرنا ہے۔ بچہ کو اوقات کی پابندی سکھائی جائے۔ چیزوں کو صحیح جگہ رکھنے کی عادت ڈالی جائے۔ کھانا پینا باقاعدہ وقت کے ساتھ ہو۔ اگر وہ کوئی کاغذ یا تھیلی سڑک پر پھینک دے تو فوراً اسی سے اس کو اٹھوایا جائے۔ شور کرنے سے روکا جائے، ہر ایسی چیز سے بچنے کی تلقین کی جائے جس سے دوسروں کو تکلیف پہنچتی ہو۔

بچہ کی حقیقی تربیت کے لیے خود ماں باپ کو اپنا طرز زندگی اس کے مطابق بنانا ہوگا۔ اگر آپ اپنے بچہ سے کہیں کہ جھوٹ نہ بولو، اسی کے ساتھ آپ یہ کریں کہ جب کوئی شخص دروازہ پر دستک دے تو کہلوا دیں کہ وہ اس وقت گھر پر نہیں ہیں تو ایسی حالت میں بچہ کو جھوٹ سے روکنا بے معنی ہوگا۔ اگر آپ سگرٹ پیتے ہوں تو بچہ کے سامنے اسموکنگ کے خلاف تقریر کرنا بے معنی ہے۔ اگر آپ وعدہ پورا نہ کرتے ہوں اور بچہ سے کہیں کہ بیٹے ہمیشہ وعدہ پورا کرو، تو بچہ کبھی ایسی نصیحت کو نہیں پکڑے گا۔

بچہ اپنے والدین کو ماڈل کے روپ میں دیکھتا ہے۔ اسی طرح بڑا بچہ چھوٹے بچوں کے لیے ماڈل ہوتا ہے۔ اگر والدین اور بڑا بچہ ٹھیک ہو تو بقیہ بچے اپنے آپ سدھرتے چلے جائیں گے۔

صلح بہتر ہے

عورت اور مرد کے درمیان مختلف قسم کے جھگڑے پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ بعض اوقات ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ جھگڑا ختم ہونے والا ہی نہیں۔ اس طرح کے معاملات میں دونوں کیا کریں، اس کے بارے میں قرآن میں مختلف قسم کی ہدایات دی گئی ہیں۔ ایک جگہ نہایت اصولی رہنمائی دی گئی ہے جو اس قسم کے ہر معاملہ پر چسپاں ہوتی ہے۔ وہ ہدایت یہ ہے:

وَإِنِ امْرَأَةٌ خافَتْ مِنْ بَعْلِها نُشُوزاً أَوْ إِعْراضاً فَلا جُناحَ عَلَيْهِما أَنْ يُصْلِحا بَيْنَهُما صُلْحاً وَالصُّلْحُ خَيْرٌ وَأُحْضِرَتِ الْأَنْفُسُ الشُّحَّ وَإِنْ تُحْسِنُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ اللّٰهَ كانَ بِما تَعْمَلُونَ خَبِيراً (4:128)۔ یعنی، اور اگر کسی عورت

کو اپنے شوہر کی طرف سے بدسلوکی یا بے رخی کا اندیشہ ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں کہ دونوں آپس میں کوئی صلح کرلیں، اور صلح بہتر ہے۔ اور حرص انسان کی طبیعت میں بسی ہوئی ہے۔ اور اگر تم اچھا سلوک کرو اور خدا ترسی سے کام لو تو جو کچھ تم کروگے اللہ اس سے باخبر ہے۔

گھریلو زندگی میں یا رشتہ داروں کے درمیان ہمیشہ جھگڑے پیدا ہوتے ہیں۔ کبھی یہ نزاع صرف جذباتی نوعیت کی ہوتی ہے اور کبھی کسی واقعی معاملہ کے بارے میں ہوتی ہے۔ کبھی عورت سمجھتی ہے کہ مرد کی زیادتی ہے، اور کبھی مرد کا خیال ہوتا ہے کہ زیادتی کرنے والی عورت ہے۔

ایسے مواقع پر ہمیشہ دو طریقے ہوتے ہیں۔ ایک قرآن کے الفاظ میں، شح (حرص) کا طریقہ ہے، اور دوسرا صلح کا طریقہ۔ دونوں طریقوں کی نفسیات ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔ ایک طریقہ کا رخ صرف اپنی طرف ہوتا ہے اور دوسرا طریقہ کا رخ دونوں کی طرف۔

جس عورت یا مرد کے اوپر حرص کی سوچ غالب ہو وہ معاملہ کو صرف اپنی نسبت سے دیکھے گا۔ اپنے جذبات کی رعایت، اپنے مفاد کا تحفظ، اپنے وقار کی بحالی، اپنی ضد کو پورا کرنے پر اصرار، بس انہیں دائروں میں اس کا ذہن چلے گا۔ ایسے لوگ اپنے کو جانیں گے مگر وہ دوسرے کے نقطہ نظر سے بے خبر رہیں گے۔ اس قسم کا مزاج ہمیشہ صرف جھگڑے کو بڑھاتا ہے، وہ کبھی جھگڑے کو ختم کرنے والا ثابت نہیں ہوتا۔

دوسرا طریقہ صلح کا طریقہ ہے۔ یعنی دونوں فریقوں کی رعایت کرتے ہوئے تصفیہ کی کوشش کرنا۔ یا کچھ لے کر اور کچھ دے کر معاملہ کو ختم کرنا۔ اس طریقہ میں سنجیدگی ہے۔ اس میں انصاف ہے۔ پہلا طریقہ اگر خود پسندی کا طریقہ ہے تو یہ دوسرا طریقہ انسانیت دوستی کا طریقہ۔

اس دنیا میں صلح کا طریقہ ہی کامیاب ہوتا ہے۔ نزاعات کا خاتمہ اگر ممکن ہوتا ہے تو اسی کے ذریعہ ہوتا ہے۔ جہاں تک حرص کے طریقہ کا معاملہ ہے، وہ صرف نزاع کو بڑھانے میں مددگار ہے۔ یہ طریقہ نزاع کو بڑھا کر اس کو ایسا فساد بنا دیتا ہے جہاں حریص اپنے ملتے ہوئے فائدے سے بھی محروم ہو کر رہ جائے۔

حرص اور صلح کے طریقوں کا تعلق صرف بیوی اور شوہر کے مخصوص معاملات سے نہیں ہے، اس کا تعلق تمام نزاعات سے ہے، خواہ وہ گھر کے محدود ماحول میں پیدا ہوں یا باہر کے وسیع تر ماحول میں۔ اور ساری تاریخ کا تجربہ ہے کہ اس دنیا میں کوئی معاملہ کبھی حرص کے اصول پر چل کر نہیں ہوتا۔ یہاں جب بھی کوئی معاملہ حل ہوتا ہے تو وہ صلح کے اصول کو اختیار کر کے ہی حل ہوتا ہے۔

یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ جب آپ یک طرفہ طور پر صرف اپنی خواہشات کو جانیں اور صرف اپنے حق پر اصرار کریں تو یہی مزاج فریق ثانی کے اندر بھی پیدا ہوگا۔ ایک ضد کے بعد جوابی ضد پیدا ہو کر معاملہ کو مزید پیچیدہ بنا دے گی، لیکن اگر آپ دوطرفہ انداز میں سوچیں۔ آپ دوسرے سے کہیں کہ میں صلح اور امن چاہتا ہوں۔ آؤ ہم دونوں ضد کو چھوڑ دیں اور مفاہمت کے اصول پر چلتے ہوئے ادھر یا اُدھر معاملہ کو ختم کر دیں۔ جب آپ اس قسم کا مصالحانہ رویہ ظاہر کریں گے تو فریق ثانی کا ضمیر جاگ اٹھے گا۔ وہ بھی اپنی ضد کو چھوڑ دے گا اور کم سے کم پر راضی ہوتے ہوئے آپ سے صلح کر لے گا، جب کہ اس سے پہلے وہ زیادہ سے زیادہ کے لیے اصرار کر رہا تھا۔

خواہ گھر کا معاملہ ہو یا وسیع تر دائرہ میں سماج کا معاملہ، جب بھی کچھ مرد اور کچھ عورتیں مل جل کر رہیں تو لازماً ان میں نزاع کی صورتیں پیدا ہوں گی۔ ایسے مواقع پر آپ کو یہ کرنا چاہیے

کہ قرآن کی ہدایت کے مطابق احسان اور تقویٰ کی روش اختیار کرتے ہوئے اسے جلد از جلد ختم کر دیں۔

حرص انسانی روح کو گندہ کرتی ہے، اور صلح کا طریقہ انسان کو غیر حقیقی جھگڑوں سے اوپر اٹھا کر اس کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ اعلیٰ افکار میں جی سکے۔ حرص دنیا اور آخرت دونوں کی تباہی ہے، اس کے برعکس صلح دنیا اور آخرت دونوں کی کامیابی۔

انتظار کیجیے

قرآن کی سورۃ نمبر 65 میں طلاق اور اس سے پیدا شدہ مسائل کا ذکر ہے۔ اس ذیل میں یہ نصیحت کی گئی ہے کہ باہمی معاملات کو ہمدردی اور فراخ دلی کے ساتھ طے کرو۔ جب دو آدمیوں میں تفریق ہوتی ہے تو ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ چیز اپنے لیے سمیٹے۔ کیونکہ اس کا خیال یہ ہوتا ہے کہ جو میرے پاس ہے وہی میرا ہے، اور جو دوسرے کے پاس چلا گیا وہ میرا نہیں رہا۔ اس لیے اپنے فائدہ کو محفوظ رکھنے کے لیے دوسرے کے ساتھ وہ تنگ نظری کا معاملہ کرنے لگتا ہے۔

اس سلسلہ میں دونوں فریقوں کو یہ حکم دیا گیا کہ: وَأْتَمِرُوا بَيْنَكُم بِمَعْرُوفٍ (65:6)۔ یعنی، اور تم آپس میں ایک دوسرے کو نیکی سکھاؤ۔ اس روش میں بظاہر اپنے لیے گھاٹے کی صورت دکھائی دے رہی تھی، چنانچہ فرمایا کہ حوصلہ سے کام لو، اللہ تمہارے لیے مشکل کے بعد آسانی پیدا فرمائے گا: يَجْعَل لَّهُ مِنْ أَمْرِهِ يُسْرًا (65:7)۔

اس ہدایت کا تعلق صرف طلاق کے معاملہ سے نہیں ہے بلکہ زندگی کے تمام نزاعی معاملات سے ہے۔ جب بھی کسی مرد اور کسی عورت کے درمیان لین دین پر جھگڑا پیدا ہو تو ہر

ایسے معاملہ میں لینے کے ساتھ دینے کے لیے بھی تیار رہنا چاہیے۔ اس روش کے نتیجہ میں اگر کچھ نقصان دکھائی دے تو اس کو وقتی سمجھ کر اس پر راضی ہو جانا چاہیے اور یہ یقین رکھنا چاہیے کہ مستقبل میں اضافہ کے ساتھ اس کے نقصان کی تلافی کی جائے گی۔

اس سے معلوم ہوا کہ اس دنیا میں انتظار بھی ایک مستقل پالیسی ہے۔ دنیا کا نظام جس قانون الٰہی کی بنیاد پر چل رہا ہے وہ یہ ہے کہ یہاں لازماً ہر شام کے بعد نئی صبح نمودار ہو۔ لوگ شر پھیلائیں تب بھی اس میں سے خیر برآمد ہو۔ کسی کو نقصان کا تجربہ ہو تب بھی زمانہ کی گردش دوبارہ اس کے لیے نفع کی صورتیں پیدا کر دے۔

اس دنیا میں انتظار سادہ طور پر محض انتظار نہیں ہے، وہ شام کے بعد صبح کے انتظار کے ہم معنی ہے۔ وہ خدائی نظام سے اس چیز کو پانے کی امید کرنا ہے جس کو آدمی اپنی طاقت سے حاصل نہیں کر سکا تھا۔ انتظار بے عملی نہیں، انتظار خود ایک عمل ہے۔ اگرچہ یہ ذہنی عمل زیادہ تر سوچ کی سطح پر انجام پاتا ہے۔

صبح کو کوئی کھینچ کر نہیں لاتا۔ وہ کسی کو صرف انتظار کے نتیجہ میں حاصل ہوتی ہے۔ کھیت اور باغ کی فصل جو ایک کسان کو ملتی ہے وہ بھی انتظار کی پالیسی کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ کسان صرف یہ کرتا ہے کہ وہ زمین میں بیج ڈال دیتا ہے۔ اس کے بعد ہزاروں ہزار ضروری عمل ہیں جن کو فطرت بطور خود انجام دیتی ہے۔ کسان گویا زرخیز زمین میں بیج ڈال کر انتظار کرتا ہے کہ کب وہ وقت آئے جب زمین و آسمان کا نظام اپنے عمل کو مکمل کرے اور قیمتی فصل اگا کر اس کے دامن میں ڈال دے۔

یہی اصول زندگی کے تمام معاملات کے لیے ہے۔ قرآن کا یہ ارشاد کہ اللہ مشکل کے بعد آسانی پیدا فرمائے گا (65:7)۔ ایک عام قانون فطرت کا اعلان ہے، ایک ایسا قانون فطرت جو ہمیشہ اپنا کام کرتا ہے، جس میں کبھی تغیر واقع نہیں ہوتا۔

فطرت کے اس نظام پر آدمی کو اگر یقین ہو تو اس کے اندر جھنجلاہٹ اور مایوسی کا مکمل خاتمہ ہو جائے، وہ سراپا امید اور یقین میں جینے لگے۔

اگر آپ کو اس حقیقت کا یقین ہو جائے تو آپ کو کسی کی ضد کے مقابلہ میں اپنا فائدہ چھوڑنا گھاٹے کا سودا معلوم نہیں ہوگا، کیونکہ آپ جانیں گے کہ اس کی حسن تلافی عنقریب خدا کی طرف سے کی جانے والی ہے۔ وقار کی قربانی آپ کو قربانی معلوم نہیں ہوگی۔ کیونکہ آپ کو یقین ہوگا کہ بہت جلد اس کا معاوضہ اضافہ کے ساتھ ملنے والا ہے۔ کسی کی اشتعال انگیزی پر صبر کرنا آپ کے لیے مشکل نہیں رہے گا۔ کیوں کہ آپ کو دکھائی دے گا کہ اس صبر کے پیچھے خدا کی عظیم نصرت میری طرف چلی آرہی ہے۔

انتظار بے عملی نہیں، انتظار خدا کی اس دنیا میں ایک مثبت پالیسی ہے۔ انتظار ہمت ہارنا نہیں ہے، انتظار اس بلند ہمتی کا ثبوت دینا ہے کہ آپ وقتی ہیجان سے اوپر اٹھ گئے ہیں اور مستقبل بینی کی بصیرت کے حامل ہیں۔ انتظار فریق ثانی کے مقابلہ میں ہتھیار نہیں ہے۔ انتظار یہ ہے کہ فریق ثانی سے مقابلہ کے لیے آپ نے اپنی ذات کو ہٹا دیا اور خداوند عالم کو اپنی جگہ کے اوپر کھڑا کر دیا۔

پیغمبرانہ نصیحت

صحیح مسلم (باب الوصیۃ بالنساء) میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی مومن کسی مومنہ سے بغض نہ رکھے، اگر اس کی کوئی خصلت اس کو ناپسند ہوگی تو کوئی دوسری خصلت اس کی پسند کے مطابق ہوگی: لَا يَفْرَكْ مُؤْمِنٌ مُؤْمِنَةً. إِنْ كَرِهَ مِنْهَا خُلُقًا رَضِيَ مِنْهَا آخَرَ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 1469)۔

یہ حدیث بظاہر عورت کے بارے میں ہے۔ مگر اسی کے ساتھ وہ خود مرد کے بارے میں بھی ہے۔ یہ ایک فطری اصول ہے جس کا تعلق مرد اور عورت دونوں سے ہے۔ مرد کو بھی عورت کے ساتھ اسی اصول کے مطابق معاملہ کرنا ہے اور عورت کو بھی مرد کے معاملہ میں اسی اصول کو اختیار کرنا ہے۔

یہ فطرت کا نظام ہے کہ کسی بھی مرد یا عورت کو ہر صفت نہیں دی جاتی۔ اس دنیا میں نہ کوئی ہر اعتبار سے بے صلاحیت پیدا ہوتا ہے اور نہ کوئی ہر اعتبار سے کامل۔ کسی کے اندر اگر ایک خصوصیت پائی جا رہی ہے تو اس کے اندر دوسری صفت مفقود ہوگی۔ ایسی حالت میں کوئی اگر ایسی چیز چاہے جو فطرت کے نظام میں موجود نہیں ہے تو اس کا ایسا چاہنا بے معنی ہے۔ کیونکہ وہ ایک ایسی چیز کا طالب ہے جو یہاں قابل حصول ہی نہیں۔

ایک شخص کو اگر ایسی بیوی ملے جس میں ظاہری کشش کم ہو تو اس کو ایسی خاتون سے نفرت نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ یقینی ہے کہ اس کے اندر عملی خصوصیات بہت زیادہ ہوں گی۔ کوئی خاتون اگر جلد غصہ میں آجاتی ہوں تو اس سے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ یہ دیکھا گیا ہے کہ جس کے اندر غصہ زیادہ ہوتا ہے اس کے اندر اصول پسندی، اخلاص اور دیانت داری کی صلاحیت بڑی مقدار میں موجود ہوتی ہے۔

اگر آدمی بیزار ہونے کے بجائے قدردانی کی نگاہ سے دیکھے تو وہ پائے گا کہ اس کی رفیقۂ حیات میں کچھ ایسی خصوصیات موجود ہیں جو غیر موجود خصوصیت کے مقابلہ میں زیادہ قیمتی ہیں۔ وہ اپنی بیوی میں سطحی صفت دیکھنا چاہتا تھا، جب کہ قدرت نے اس کے اندر گہری صفت پیدا کر رکھی تھی۔ وہ اس کے اندر تفریحی پہلو کی تلاش کر رہا تھا، جب کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر ایسے پہلو رکھ دیے تھے جو زندگی کو بنانے اور گھر کو آباد کرنے کے اعتبار سے

غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں۔ اس کو شوق تھا کہ اس کی بیوی ظاہر کے اعتبار سے پر کشش ہو، مگر خداوند عالم نے اس کے لیے ایسی بیوی مقدر کر دی جو باطن کے اعتبار سے پر کشش تھی، اور اول الذکر کے مقابلہ میں ثانی الذکر یقینا زیادہ اہم ہے۔

یہی معاملہ دوسری صورت میں عورت کے لیے بھی ہے۔ عورت کی بھی مختلف خواہشیں ہوتی ہیں وہ چاہتی ہے کہ میرا رفیق ایسا ہو اور ویسا نہ ہو۔ مگر اس کو بھی تقدیر کے اوپر راضی ہونا ہے۔ کیونکہ عین ممکن ہے کہ جو شخصیت اسے ملی ہے وہ اس سے زیادہ قیمتی ہو جس کو وہ چاہتی تھی۔

مثلاً ایک عورت کی خواہش تھی کہ اس کا شوہر دولت مند ہو، مگر تقدیر نے اس کو دولت مند شوہر نہیں دیا۔ مگر اس پر غم زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ ایک شخص کے پاس اگر زیادہ دولت نہ ہو تو کچھ اور چیزیں اس کے پاس دولت مندوں سے زیادہ ہوتی ہیں۔ مثلاً سنجیدگی، حساسیت، تواضع، ہمدردی، جد و جہد کا جذبہ، وغیرہ۔ اور یہ دوسری چیزیں یقینی طور پر دولت سے زیادہ قیمتی ہیں۔

اسی طرح مثلاً ایک عورت کو ایسا خاوند ملا ہے جو نسب کے اعتبار سے زیادہ اونچا نہیں ہے۔ جب کہ عورت کی خواہش تھی کہ اس کو عالی نسب خاوند ملے۔ اس فرق کی بنا پر عورت اگر اپنے خاوند کو کم سمجھنے لگے تو وہ بہت بڑی نادانی کرے گی۔ کیونکہ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ عالی نسب ہوتے ہیں وہ اخلاق اور انسانیت میں زیادہ اونچے نہیں ہوتے۔ وہ اپنے کو دوسروں سے اونچا سمجھنے لگتے ہیں۔ ان کا یہ احساس ان کے اندر طرح طرح کی برائیاں پیدا کر دیتا ہے۔ اس کے برعکس، جو آدمی اس فخر سے خالی ہو کہ وہ اعلیٰ حسب و نسب والا ہے، وہ نسبتاً زیادہ حقیقت پسند اور فرض شناس اور دوسروں کی رعایت کرنے والا ہوتا ہے۔

اس دنیا میں کوئی بھی اچھی چیز خرابیوں سے پاک نہیں، اسی طرح کوئی بھی معمولی چیز

خوبیوں سے خالی نہیں۔ اس لیے عورت اور مرد کو چاہیے کہ اپنی ملی ہوئی چیز ہی میں خوبیاں تلاش کریں، نہ کہ اس کو چھوڑ کر کسی اور چیز کی طرف دوڑنا شروع کردیں۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کو کبھی مایوسی میں نہیں پڑنا چاہیے۔ کیونکہ ہر بظاہر مایوسی کے واقعہ میں اللہ نے امید کا ایک پہلو چھپا دیا ہے۔

جنت کا استحقاق

دنیا امتحان گاہ ہے۔ یہاں مرد بھی امتحان کی حالت میں ہے اور عورت بھی امتحان کی حالت میں۔ کسی عورت یا مرد کو جو کچھ اس دنیا میں ملتا ہے وہ سب اس کے لیے امتحان کا پرچہ ہے۔ اور ہر ایک کا سب سے بڑا امتحان یہ ہے کہ لوگوں کی طرف سے ٹھیس پہنچنے کے باوجود وہ لوگوں کے درمیان محبت کے ساتھ رہ سکے۔

عورت کے امتحان کا سب سے زیادہ اہم پرچہ اس کی سسرال ہے۔ عورت جب میکے میں ہوتی ہے تو وہاں وہ خونی رشتوں کے درمیان ہوتی ہے۔ ماں، باپ، بھائی، بہن، ہر ایک اس کے لیے خونی رشتہ دار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہر ایک کو وہ اپنا سمجھتی ہے۔ اس لیے جب کوئی ناخوشگواری کی بات پیش آتی ہے تو وہ سنگین بات بننے نہیں پاتی۔

میکہ میں بھی بار بار ایسے حالات پیدا ہوتے ہیں جب کہ عورت کو گھر والوں سے کسی ناخوش گوار بات کا تجربہ ہو۔ شکایت اور تلخی اجتماعی زندگی کا حصہ ہے۔ وہ ہمیشہ اور ہر جگہ پیش آتی ہے۔ لیکن میکہ میں جب عورت کو گھر کے کسی فرد سے اس قسم کا ناموافق تجربہ ہوتا ہے تو وہ ہمیشہ وقتی ہوتا ہے۔ کیونکہ خون کا تعلق غالب آکر تلخی کے احساس کو ختم کر دیتا ہے۔

لیکن عورت کی جب شادی ہو جاتی ہے اور وہ رخصت ہو کر سسرال میں آتی ہے تو

یہاں کی فضا بالکل مختلف ہوتی ہے۔ یہاں ہر رشتہ دار غیر خونی رشتہ دار ہوتا ہے۔ اس لیے یہاں جب کوئی تلخی یا شکایت کی بات ہوتی ہے تو اگرچہ وہ عام فطری قانون کے تحت ہوتی ہے۔ مگر چونکہ میکہ کی طرح سسرال میں خون کا تعلق اس پر غالب آنے کے لیے موجود نہیں ہوتا، اس لیے یہاں ہر بات اس کے لیے سنگین بات بن جاتی ہے۔ جو بات میکہ میں بھول کے خانہ میں چلی جاتی تھی وہ سسرال میں یاد کے خانہ میں مسلسل زندہ رہتی ہے۔ اس بنا پر ایسا ہوتا ہے کہ جو عورت اپنے میکہ میں بے مسئلہ خاتون بن کر رہتی تھی، وہ سسرال میں مسائل کا مجموعہ بن کر رہ جاتی ہے۔

یہی عورت کے امتحان کا پرچہ ہے۔ وہ سسرال میں بھی اسی طرح رہے جس طرح وہ میکہ میں رہتی تھی۔ جس طرح میکہ میں شکایت کے باوجود وہ افراد خاندان سے حسن تعلق باقی رکھتی تھی۔ اسی طرح وہ سسرال میں بھی شکایت کے باوجود خاندان کے افراد سے خوش گوار تعلقات کو باقی رکھے۔ وہی عورت آخرت کی جنت کی مستحق ہے جو اپنے حسن عمل سے اپنے شوہر کے گھر کو جنت کا نمونہ بنا دے۔

اس دنیا میں کوئی عورت یا مرد جب اپنے امتحان میں ناکام ہوتا ہے تو اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ قریبی ماحول کے افراد سے وہ کسی نہ کسی نفسیاتی پیچیدگی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہ نفسیاتی پیچیدگی بعض اوقات اس کے اوپر اتنا زیادہ چھا جاتی ہے کہ اس سے اوپر اٹھنا اس کے لے ممکن نہیں ہوتا۔ وہ نفسیاتی پیچیدگی کے اس طوفان میں گھر کر رہ جاتا ہے۔ عورت اور مرد دونوں کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ وہ اس نزاکت کا شعوری ادراک کرے اور اس سے غیر متاثر رہ کر اپنا مفوضہ کردار ادا کر سکے۔

ایک عورت کو ایک پورے ماحول میں رہنا پڑتا ہے جہاں اس کا سابقہ بار بار بہت سے مردوں اور عورتوں سے پیش آتا ہے۔ اس عمل کے دوران کبھی کسی کی بات پر اس کو غصہ

آجاتا ہے۔ کبھی کسی کی بات اس کو اپنے حق میں توہین آمیز معلوم ہوتی ہے۔ کبھی کسی کی ترقی کو دیکھ کر اس کے اندر جلن اور حسد کا جذبہ ابھر آتا ہے۔ کبھی اس کو یہ شبہ ہوجاتا ہے کہ فلاں کی موجودگی میں میں ترقی کی منازل طے نہیں کرسکتی۔ کبھی اس کو یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ فلاں مرد یا عورت خواہ مخواہ میرے راستہ کی رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ کبھی اپنے بچوں کی بے جا محبت اور حمایت اس کو طرح طرح کی نادانیوں میں مبتلا کردیتی ہے۔

یہ تمام چیزیں عورت کی دنیا اور آخرت کو تباہ کرنے والی ہیں۔ عورت کو ان تمام چیزوں کو نظر انداز کرنا ہے، اس کو ان تمام جذبات سے اوپر اٹھنا ہے، ورنہ عورت اپنا وہ عظیم کردار ادا کرنے میں ناکام رہے گی جس کا سنہری موقع نظام فطرت نے اس کے لیے مہیا کیا ہے۔

تاریخ میں بہت سی ایسی خواتین گزری ہیں جنہوں نے نہایت اعلیٰ کارنامے انجام دیے، گھر کے اندر بھی اور گھر کے باہر بھی۔ مگر یہ تمام وہی خواتین تھیں جن کے اندر بلند نظری کی صفت تھی۔ جو اپنے آپ کو نفسیاتی پیچیدگیوں سے اوپر اٹھانے میں کامیاب ہوگئی تھیں۔

شکایت کی باتوں میں الجھنا آپ کی ترقی کے سفر کو روکتا ہے۔ اور شکایت کو نظر انداز کرکے لوگوں سے اچھا معاملہ کرنا آپ کو اعلیٰ درجات تک پہنچا دیتا ہے۔

سب سے زیادہ

صحیح بخاری میں ایک حدیث آئی ہے۔ مؤلف کتاب نے اپنے طریقہ کے مطابق اس کو کئی ابواب میں نقل کیا ہے۔ کتاب الکسوف میں جو روایت آتی ہے اس کا ایک حصہ یہ ہے: وَرَأَيْتُ النَّارَ فَلَمْ أَرَ كَالْيَوْمِ مَنْظَرًا قَطُّ، وَرَأَيْتُ أَكْثَرَ أَهْلِهَا النِّسَاءَ قَالُوا: لِمَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ؟ قَالَ: بِكُفْرِهِنَّ. قِيلَ: يَكْفُرْنَ بِاللّٰهِ؟ قَالَ: يَكْفُرْنَ الْعَشِيرَ، وَيَكْفُرْنَ

الْإِحْسَانَ، لَوْ أَحْسَنْتَ إِلَى إِحْدَاهُنَّ الدَّهْرَ، ثُمَّ رَأَتْ مِنْكَ شَيْئًا، قَالَتْ: مَا رَأَيْتُ مِنْكَ خَيْرًا قَطُّ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 5197)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھ کو جہنم دکھائی گئی تو میں نے اس سے زیادہ قبیح منظر کبھی نہیں دیکھا۔ اور میں نے دیکھا کہ اس میں زیادہ تر عورتیں ہیں۔ لوگوں نے پوچھا کہ کیوں اے خدا کے رسولؐ، آپ نے فرمایا کہ اپنے کفر کی وجہ سے۔ پوچھا گیا کہ کیا وہ اللہ کا کفر کرتی ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ وہ اپنے شوہر (قریبی فرد) کا انکار کرتی ہیں۔ وہ احسان کا انکار کرتی ہیں۔ اگر تم ان میں سے کسی سے زمانہ بھر احسان کرو، پھر وہ تم سے کوئی خلافِ مزاج بات دیکھے تو وہ کہہ دے گی کہ میں نے تم سے کبھی کوئی خیر نہیں دیکھا۔

عورت کی یہ کمزوری دراصل اس کی ایک فطری صلاحیت کا غلط استعمال ہے۔ عورت فطری طور پر زیادہ جذباتی (emotional) ہوتی ہے۔ اسی بنا پر ایسا ہے کہ اس کو جب کسی سے کوئی خلاف مزاج بات پہنچتی ہے تو وہ بہت جلد بے قابو ہو جاتی ہے۔ اس وقت وہ پچھلی تمام اچھی باتوں کو بھلا بیٹھتی ہے اور ایسے سخت کلمات بولنے لگتی ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ کبھی خیر یا مہربانی کا معاملہ ہی نہیں کیا گیا۔

اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت کو دو الگ الگ کام کے لیے پیدا کیا ہے۔ مرد دنیا کے کاروبار کو سنبھالنے کے لیے ہے۔ اور عورت بچوں کی پرورش اور تربیت کے لیے۔ اسی کے مطابق دونوں کی سرشت بنائی گئی ہے۔ چنانچہ مرد میں عزم کی خصوصی صلاحیت ہے۔ تاکہ وہ باہر کے طوفانی حالات کے مقابلہ میں ٹھہر سکے۔ اور عورت کے اندر جذبہ یا عاطفہ زیادہ رکھا گیا ہے، تاکہ بچوں کو سنبھالنے کا نازک کام اس کے لیے آسان ہو جائے۔

مرد اور عورت دونوں اس دنیا میں حالت امتحان ہیں۔ البتہ دونوں کے لیے امتحان کے

پر چے کسی قدر الگ الگ ہیں۔ اس اعتبار سے مرد اور عورت دونوں میں انحراف پیدا ہوتا ہے مگر دونوں کے انحراف کی صورتیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

مرد کا انحراف انانیت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور عورت کا انحراف، مذکورہ حدیث کے مطابق، بے اعترافی کی صورت میں، انانیت بھی ایک فطری صلاحیت کا غلط استعمال ہے اور بے اعترافی بھی ایک فطری صلاحیت کا غلط استعمال۔

یہ حدیث عورت کو متنبہ کررہی ہے کہ وہ کون سا مقام ہے جہاں عورت سب سے زیادہ نازک پوزیشن میں ہے اور کس معاملہ میں اس کو سب سے زیادہ چوکنا رہنا چاہیے۔ یہ مقام وہ ہے جب کہ اس کا شوہر (یا اس کے خاندان کا کوئی قریبی فرد) کوئی ایسی چیز کرے یا کوئی ایسی بات کہہ دے جس سے عورت کے دل کو ٹھیس پہنچے۔ ایسے موقع پر عورت کے اندر شدید جذبات ابھر آتے ہیں، حتیٰ کہ وہ بھول جاتی ہے کہ اس سے پہلے ہزاروں بار اسی شوہر (یا اسی فرد خاندان) سے اس کو بھلائی اور مہربانی ملی ہے۔

ایسے جذباتی موقع پر عورت جنت اور جہنم کے عین درمیان پہنچ جاتی ہے۔ اگر وہ جذبات کے وقتی جھٹکے کو برداشت کر لے اور وہ بات کہے جو انصاف کا تقاضا ہے تو اس کی یہ صابرانہ روش اس کے لیے جنت میں داخلہ کا ٹکٹ بن جائے گی۔ اس کے برعکس، اگر ایسا ہو کہ جذبات اس کے اوپر غالب آجائیں، وہ احسان فراموشی کے کلمات بولنے لگے یا قطع تعلق کر بیٹھے تو ایسی روش اس کو جہنم کی آگ میں داخل کرنے کا سبب بن جائے گی۔

اس دنیا میں ہر عورت اور ہر مرد امتحان کی حالت میں ہے۔ یہاں ہر ایک کو سب سے زیادہ اس بات کے لیے چوکنا رہنا چاہیے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کے لیے امتحان کا لمحہ آئے اور وہ اس امتحانی لمحہ پر فیل ہوجائے، وہ اپنی کامیابی کا ثبوت نہ دے سکے۔

اس امتحان کا سب سے زیادہ نازک لمحہ وہ ہے جب کہ کسی عورت یا مرد پر جذبات کا غلبہ ہوجائے اور وہ جذبات کے زیر اثر صحیح روش پر قائم رہنے میں ناکام رہے۔

غلط فہمی

صحیح مسلم کتاب الصلاۃ (باب مایقال فی الرکوع والسجود) میں ایک واقعہ نقل کیا گیا ہے۔ ابن ابی ملیکہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ محترمہ عائشہؓ نے بتایا کہ ایک رات کو میں نے رسول اللہؐ کو اپنے پاس نہ پایا۔ میں نے گمان کیا کہ آپ اپنی کسی اور بیوی کے پاس گئے ہیں۔ چنانچہ میں نے آپ کو ڈھونڈا۔ پھر میں لوٹی تو آپ رکوع یا سجدہ میں تھے اور یہ کہہ رہے تھے کہ خدایا، تو پاک ہے اور تیری ہی تعریف ہے، تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔ یہ دیکھ کر میں نے کہا کہ میرے باپ اور ماں آپ پر قربان، میں کس خیال میں تھی اور آپ کسی اور حال میں ہیں: عَنْ عَائِشَةَ قَالَتِ. افْتَقَدْتُ النَّبِيَّ صلى الله عليه وسلم ذَاتَ لَيْلَةٍ، فَظَنَنْتُ أَنَّهُ ذَهَبَ إِلَى بَعْضِ نِسَائِهِ. فَتَحَسَّسْتُ ثُمَّ رَجَعْتُ فَإِذَا هُوَ رَاكِعٌ - أَوْ سَاجِدٌ - يَقُولُ: سُبْحَانَكَ وَبِحَمْدِكَ، لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ. فَقُلْتُ: بِأَبِي أَنْتَ وَأُمِّي، إِنِّي لَفِي شَأْنٍ وَإِنَّكَ لَفِي آخَرَ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 485)۔

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ غلط فہمی کتنی خطرناک چیز ہے۔ حضرت عائشہؓ ہر لحاظ سے ایک افضل خاتون تھیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت پیغمبر اعظم کی تھی، اس کے باوجود حضرت عائشہؓ کو آپ کے بارے میں ایک ایسی غلط فہمی ہوگئی جس کا سرے سے کوئی وجود نہ تھا۔

حضرت عائشہؓ نے رات کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے حجرہ میں نہیں پایا تو انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ آپ کسی اور بیوی کے یہاں چلے گئے ہیں، حالانکہ آپ اس وقت مسجد

میں تھے۔ چونکہ یہ رات کا وقت تھا، حضرت عائشہؓ نے رسول اللہؐ کی غیر موجودگی سے یہ قیاس کیا کہ آپ کو اپنی کسی زوجہ کی یاد آئی اور آپ وہاں چلے گئے۔ حالانکہ اصل بات یہ تھی کہ آپ کو خدا کی یاد آئی تھی اور آپ خدا کے آگے رکوع وسجود کے لیے مسجد میں چلے گئے تھے۔

غلط فہمی ہمیشہ کسی ظاہری مشابہت کی وجہ سے ہوتی ہے۔ مگر مذکورہ واقعہ بتاتا ہے کہ بظاہر مشابہت کے باوجود، غلط فہمی کتنی زیادہ بے اصل ہو سکتی ہے۔

گھریلو زندگی میں جو بگاڑ پیدا ہوتے ہیں اور جو کبھی اتنا بڑھتے ہیں کہ پورا خاندانی نظام منتشر ہو جاتا ہے، ان کا سبب بیشتر حالات میں غلط فہمی ہوتا ہے۔ غلط فہمی پیدا ہونے کے بعد اگر سنجیدگی کے ساتھ اس کی تحقیق کی جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ محض بے بنیاد تھی۔ اس طرح پہلے ہی مرحلہ میں اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔ لیکن اکثر لوگ غلط فہمی کی تحقیق نہیں کرتے۔ اس طرح ایک بے بنیاد چیز بڑھ کر بگاڑ کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

مذکورہ واقعہ ہر عورت اور ہر مرد کے لیے ایک چشم کشا واقعہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک مقدس خاتون جب غلط فہمی میں پڑ سکتی ہے تو عام عورت اور عام مرد کیوں غلط فہمی میں نہیں پڑیں گے۔ اس لیے جب بھی کسی کے خلاف کوئی برا خیال ذہن میں آئے تو کبھی اس کو دل میں بٹھانا نہیں چاہیے۔ بلکہ اس کی تحقیق کرنا چاہیے۔ اور تحقیق کے بعد جو بات سامنے آئے اس کو فوراً مان لینا چاہیے۔ اس طرح گھر کی زندگی بگاڑ اور انتشار سے بچی رہے گی۔

غلط فہمی کا صرف یہی نقصان نہیں ہے کہ وہ گھر کے نظام کو بگاڑنے والی ہے، اسی کے ساتھ وہ ایک سخت گناہ بھی ہے۔ کسی کے بارے میں ایسا گمان کر لینا جو فی الواقع درست نہ ہو، وہ اللہ کو بے حد ناپسند ہے۔ حتی کہ یہ بھی اندیشہ ہے کہ اس کے نتیجہ میں عورت یا مرد کے سارے اعمال ضائع ہو جائیں۔

غلط فہمی کو ماننے کا مزاج آدمی کی شخصیت کو بھی سخت نقصان پہنچاتا ہے۔ جو عورت یا مرد اس کمزوری کا شکار ہوں کہ وہ آسانی سے کسی کے بارے میں غلط فہمی میں پڑ جائیں اور پھر اپنے ذہن کی صفائی نہ کریں وہ دھیرے دھیرے نہایت سطحی ہو جائیں گے۔ انسانوں کے لیے ان کے دل میں خیر خواہی نہیں ہوگی۔ وہ ایک غیر حقیقی دنیا میں جینے لگیں گے۔ اور جن لوگوں کا یہ حال ہو جائے وہ خدا کی اس دنیا میں کبھی کوئی بڑی کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔

غلط فہمی انسانی تعلقات کے لیے قاتل ہے۔ غلط فہمی سے دشمنیاں پیدا ہوتی ہے۔ غلط فہمی دو گروہوں کو لڑا دیتی ہے۔ غلط فہمی عظیم بربادیوں کا سبب بن جاتی ہے۔ تاہم اس ہولناک برائی کا علاج نہایت آسان ہے۔ اور وہ تحقیق ہے۔ جب بھی آپ کو کسی کے بارے میں غلط فہمی پیدا ہو تو آپ فوراً اس کو مان نہ لیں بلکہ براہ راست ذرائع سے اس کی تحقیق کریں۔ اس کے بعد یقینی ہے کہ آپ کی غلط فہمی رفع ہو جائے گی اور آپ کی حفاظت گناہ سے بھی ہو جائے گی اور غلط اقدام سے بھی۔

غیبت نہیں

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيراً مِنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ وَلَا تَجَسَّسُوا وَلَا يَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضاً أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَنْ يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتاً فَكَرِهْتُمُوهُ وَاتَّقُوا اللّٰهَ إِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَحِيمٌ (49:12)۔ **اے ایمان والو،** بہت سے گمانوں سے بچو۔ کیونکہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔ اور ٹوہ میں نہ لگو۔ اور تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے۔ کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرے

گا کہ وہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے۔ اس کو تم خود نا گوار سمجھتے ہو۔
اور اللہ سے ڈرو۔ بے شک اللہ معاف کرنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

غیبت کا مطلب ہے، کسی کی غیر موجودگی میں اس کو برا کہنا۔ مذکورہ آیت میں غیبت کو مرے ہوئے انسان کا گوشت کھانے کے برابر بتایا گیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ فعل اللہ کے نزدیک کتنا زیادہ برا اور کتنا زیادہ ناپسندیدہ ہے۔

موطأ امام مالک (کتاب الجامع) میں باب ماجاء فی الغیبۃ کے تحت ایک روایت آئی ہے۔ راوی کہتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ غیبت کیا ہے۔ آپ نے فرمایا، یہ کہ تم کسی آدمی کا ذکر اس طرح کرو جس کو وہ ناپسند کرے اگر وہ سنے۔ اس نے دوبارہ پوچھا کہ اے خدا کے رسولؐ، اگرچہ بری بات واقعہ کے مطابق ہو۔ آپ نے فرمایا کہ اگر تمہاری بات واقعہ کے خلاف ہو تو وہ بہتان ہے: أَنَّ رَجُلًا سَأَلَ رَسُولَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم: مَا الْغِيبَةُ؟ فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم: أَنْ تَذْكُرَ مِنَ الْمَرْءِ مَا يَكْرَهُ أَنْ يَسْمَعَ، قَالَ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ، فَإِنْ كَانَ حَقًّا؟ قَالَ: إِذَا قُلْتَ بَاطِلًا فَذَلِكَ الْبُهْتَانُ (موطا مالک، حدیث نمبر 2083)۔

موجودہ زمانہ میں خواتین میں اور گھروں میں جو برائی سب سے زیادہ عام ہے وہ یہی ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ جہاں چند عورتیں اکٹھا ہوں گی وہ فوراً دوسروں کی شکایت کرنا شروع کر دیں گی، اس قسم کی شکایتوں ہی کا نام غیبت ہے، کسی کی غیر موجودگی میں اس کے خلاف اس کی برائی بیان کرنا، جب کہ وہ خود اس کی صفائی کرنے کے لیے موجود نہ ہو، یہی غیبت ہے اور یہ غیبت خواتین میں اتنا زیادہ پھیلی ہوئی ہے کہ بہت ہی کم ایسی خواتین ہوں گی جو اس برائی سے بچی ہوئی ہوں۔

مولانا شبیر احمد عثمانی اس آیت کے تحت اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں: اختلاف وتفریق باہمی کے بڑھانے میں ان امور کوخصوصیت سے دخل ہے۔ ایک فریق دوسرے فریق سے ایسا بدگمان ہوجاتا ہے کہ حسن ظن کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑتا۔ مخالف کی کوئی بات ہوتو اس کا محمل اپنے خلاف نکال لیتا ہے۔ اس کی بات میں ہزار ہا احتمال بھلائی کے ہوں اور صرف ایک پہلو برائی کا نکلتا ہوتو ہمیشہ اس کی طبیعت برے پہلو کی طرف چلے گی۔ اور وہ اسی برے اور کمزور پہلو کو قطعی اور یقینی قرار دے کر فریق مقابل پر تہمتیں اور الزام لگانا شروع کردے گا۔ پھر نہ صرف یہ کہ ایک بات اتفاق سے پہنچ گئی تو بدگمانی سے اس کو غلط معنی پہنادیے گئے۔ نہیں، وہ اس جستجو میں رہتا ہے کہ دوسری طرف کے اندرونی بھید معلوم ہوں جس پر ہم خوب حاشیے چڑھائیں اور اس کی غیبت سے اپنی مجلس گرم کریں۔ ان تمام خرافات سے قرآن منع کرتا ہے۔ اگر مسلمان اس پر عمل کریں تو جو اختلافات بدقسمتی سے پیش آجاتے ہیں وہ اپنی حد سے آگے نہ بڑھیں اور ان کا ضرر بہت محدود ہوجائے۔ بلکہ چند روز میں نفسانی اختلافات کا نام و نشان باقی نہ رہے (تفسیر عثمانی، صفحہ 671)۔

سورہ احزاب کی اس آیت کا خطاب عورتوں اور مردوں دونوں سے ہے کہ وہ گمان کی بنیاد پر ہرگز کسی کے بارے میں کوئی بری رائے قائم نہ کریں۔ کسی کے بارے میں اچھی رائے قائم کرنے میں اگر آپ غلطی کرجائیں تو اس سے خاندان یا سماج میں کوئی برائی پیدا نہیں ہوگی۔ لیکن اگر کسی کے بارے میں بری رائے قائم کرلی جائے تو وہ عظیم شر کا سبب بن سکتی ہے۔

اسی طرح غیبت اور شکایت کا نقصان بہت زیادہ ہے۔ جس گھر یا جس سماج میں لوگوں کا حال یہ ہو کہ وہ اپنی مجلسوں میں دوسروں کی برائی بیان کرتے ہوں وہاں لوگوں کے دل ایک

دوسرے سے پھٹے ہوئے ہوں گے۔ باہمی خیر خواہی کا ماحول وہاں باقی نہیں رہے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ خود اپنی ذات کی نجات کے لیے بھی ضروری ہے کہ آپ کی زبان غیبت اور شکایت اور برائی جیسے تذکروں سے پاک ہو۔ جو انسان مردار گوشت کو اپنی غذا بنائے اس کا جسم فاسد جسم بن جائے گا۔ اسی طرح جو عورت یا مرد اپنی زبان کو بار بار غیبت سے آلودہ کریں ان کے اندر گندی شخصیت پرورش پائے گی۔ ان کا وجود انسانی خوشبو سے محروم ہو کر رہ جائے گا۔

ہاجرہؓ —— امِ اسماعیلؑ

زندگی کے نظام میں عورت کی حیثیت بظاہر نصف حصہ کی ہے۔ مگر عملی اعتبار سے عورت کلیدی کردار کی حامل ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ ہر بڑے آغاز کے پیچھے ایک عورت ہوتی ہے:

There is a woman at the beginning of all great Things.

قدیم تاریخ میں اس کی ایک شاندار مثال وہ خاتون ہیں جن کو ہاجرہ (Hagar) کہا جاتا ہے۔ ان کا زمانہ بیسویں صدی قبل مسیح ہے۔ ان کی غیر معمولی قربانی سے عرب کے صحرا میں ایک اعلیٰ درجہ کی نسل تیار ہوئی۔ اس نسل نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت کو قبول کر کے وہ جدو جہد کی جس کے نتیجہ میں تاریخ کا عظیم ترین انقلاب برپا ہوا۔

حج کے ارکان میں سے ایک رکن وہ ہے جس کو صفا اور مروہ کے درمیان سعی کہا جاتا ہے۔ یہ دو پہاڑیاں ہیں جن کے درمیان تقریباً 395 میٹر کا فاصلہ ہے۔ اس کے علاوہ ہر روز دنیا بھر سے عمرہ کرنے والے عمرہ کرنے کے لیے مکہ پہنچتے ہیں اور وہ بھی طواف کعبہ کے بعد صفا و مروہ کے درمیان سعی کرتے ہیں۔ اس طرح صفا و مروہ کے درمیان سعی کا یہ سلسلہ سارے سال جاری رہتا ہے۔

یہ سعی کیا ہے جس کو تمام مسلمان، خواہ وہ چھوٹے ہوں یا بڑے، پوری وفاداری کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔ یہ اسی عظیم خاتون ہاجرہ کے نقش کی پیروی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے ہاجرہ کو ان کے چھوٹے بچہ کے ساتھ مکہ کے پاس صحرا میں ڈال دیا تھا۔ اس وقت ان کے پاس صرف ایک مشک پانی تھا۔ مشک جب خالی ہوگئی تو پانی کی تلاش میں وہ اس پہاڑی سے اس پہاڑی تک سات بار دوڑی تھیں۔ ان کی یہ دوڑ ان کی عظیم قربانی کا ایک حصہ تھی۔ اللہ تعالیٰ کو یہ قربانی اتنا زیادہ پسند آئی کہ اس کو حج کے ارکان میں شامل کردیا گیا اور دنیا بھر کے تمام مسلمانوں پر لازم کردیا گیا کہ وہ جب حج یا عمرہ کے لیے مکہ آئیں تو اس خاتون کی تقلید میں صفا و مروہ کے درمیان دوڑیں۔

حضرت ہاجرہ کی قربانی سے ایک تاریخ کا آغاز ہوا۔ انھوں نے تاریخ کے سب سے بڑے انقلاب کی ابتدائی بنیاد رکھی۔ گویا کہ انسانی تاریخ میں ان کی حیثیت بانی انقلاب کی ہے۔ ان کی اسی قربانی کی بنا پر تمام انسانوں کو ان کے نقش قدم کی پیروی کا حکم دے دیا گیا۔

دورِ قدیم میں شرک کا رواج اتنا بڑھا کہ وہ تہذیب انسانی میں شامل ہوگیا۔ تمام لوگوں کی سوچ مشرکانہ سوچ بن گئی۔ یہی وجہ ہے کہ ایک کے بعد ایک ہزاروں پیغمبر آئے جنھوں نے لوگوں کو توحید کی طرف بلایا۔ مگر انسانیت کا قافلہ اپنا راستہ بدلنے کے لیے تیار نہیں ہوا۔ اس سلسلہ میں آخری تجربہ حضرت ابراہیم کا تھا، انھوں نے قدیم عراق میں توحید کی دعوت دی۔ مگر لوگ فکری کنڈیشننگ کی وجہ سے شرک کے خلاف سوچنے کے لیے تیار نہ ہوسکے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قدیم زمانہ میں توحید کی دعوت فکری مرحلہ میں باقی رہی، وہ انقلاب کے مرحلہ تک نہ پہنچ سکی۔ کیونکہ موحدانہ انقلاب برپا کرنے کے لیے انسانوں کی ایک ٹیم مطلوب تھی، اور لوگوں کے عدم ایمان کی وجہ سے ٹیم بننے کی نوبت نہیں آئی۔

اب حضرت ابراہیم نے، وحی الٰہی کے مطابق، ایک نیا منصوبہ بنایا۔ وہ منصوبہ یہ تھا کہ کسی غیر آباد علاقہ میں ایک نسل تیار کی جائے۔ یہ نسل مشرکانہ تہذیب سے دور خالص فطرت کے ماحول میں پرورش پائے۔ تاکہ اس کی فطرت اپنی اصل حالت میں باقی رہے۔ اور پھر اس کے اندر توحید کی دعوت دے کر اس میں سے افراد کار تیار کیے جائیں جو توحید کی بنیاد پر عالمی انقلاب برپا کریں۔

اسی خاص منصوبہ کے تحت چار ہزار سال پہلے حضرت ہاجرہ کو ان کے شیر خوار بچہ اسماعیل کے ساتھ عرب کے صحرا میں بسایا گیا۔ اسماعیل جب بڑے ہوئے تو انہوں نے ایک مناسب لڑکی تلاش کر کے اس سے نکاح کیا۔ پھر ان کی اولاد کے ذریعہ یہاں ایک نسل بننا شروع ہوئی۔ توالد و تناسل کی صورت میں یہ سلسلہ صدیوں تک جاری رہا۔ اس طرح صحرا کے فطری ماحول میں جو انسانی نسل تیار ہوئی اسی کو بنو اسماعیل کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد اپنے وقت پر ان کے درمیان محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب پیدا ہوئے۔ آپ نے ان لوگوں سے ایک طاقتور ٹیم تیار کی جس نے جدوجہد کر کے توحید کو فکری مرحلہ سے نکال کر انقلاب کے مرحلہ تک پہنچا دیا۔

اس عظیم منصوبہ کی ابتدا ایک مومنہ کی قربانی سے ہوتی ہے۔ حضرت ہاجرہؓ نے اپنے بچہ کے ساتھ مکہ کے صحرا میں آباد ہو کر اس خدائی منصوبہ کو واقعہ بنایا۔ حضرت ہاجرہؓ کے اسی عظیم رول کی بنا پر ایسا ہے کہ حج اور عمرہ میں تمام دنیا کے مسلمان اس عظیم خاتون کے نقش قدم پر چل کر صفا اور مروہ کے درمیان سعی کا عمل انجام دیتے ہیں۔ اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ عورت اگر عزم کر لے تو وہ کتنا بڑا رول ادا کر سکتی ہے۔

حضرت خدیجہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجموعی طور پر گیارہ خواتین سے نکاح کیا۔ ان کو امہات المومنین کہا جاتا ہے۔ آپ کی پہلی اہلیہ حضرت خدیجہ بنت خُویلدؓ تھیں۔ حضرت خدیجہ آپ کی پہلی بیوی بھی ہیں اور اسی کے ساتھ پہلی مسلمان بھی۔

حضرت خدیجہ ایک مالدار خاتون تھیں۔ وہ مکہ میں بیوہ کی حیثیت سے زندگی گزار رہی تھیں۔ اسی اثناء میں انہوں نے آنحضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا مال تجارت دے کر شام بھیجا۔ یہ معاملہ قدیم رواج کے مطابق کچھ معاوضہ کی بنیاد پر ہوا تھا۔ آپ سفر سے واپس آئے تو آپ نے دوسروں سے زیادہ نفع کا حساب دیا۔ حضرت خدیجہ نہایت شریف خاتون تھیں، ان کے اندر اعتراف کا غیر معمولی مادہ تھا، چنانچہ وہ دوسروں کو ایک اونٹ معاوضہ دیتی تھیں اور آپ کو انہوں نے دو اونٹ معاوضہ میں پیش کیا۔

اس تجربہ کے بعد وہ آنحضرتؐ کی طرف راغب ہوگئیں۔ انہوں نے مکہ کی ایک بوڑھی خاتون کے ذریعہ آپ کے پاس نکاح کا پیغام بھیجا۔ اس وقت آپ کے چچا ابو طالب آپ کے سر پرست تھے، آپ نے ان سے مشورہ کے بعد اس پیغام کو قبول کرلیا۔ ابو طالب نے خاندانی افراد کی موجودگی میں آپ کا نکاح خدیجہ سے کر دیا۔ نکاح کے وقت خدیجہ کی عمر چالیس سال اور آپؐ کی عمر 25 سال تھی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر چالیس سال ہوئی تو غار حراء میں فرشتہ جبریل آئے اور پہلی وحی آپ تک پہنچائی اور بتایا کہ آپ کو اللہ نے اپنا رسول مقرر فرمایا ہے۔ واپس آ کر آپ نے اپنے اس تجربہ کو سب سے پہلے حضرت خدیجہ سے بیان فرمایا۔ حضرت خدیجہ بے حد ذہین اور نہایت نیک بخت خاتون تھیں۔ ان کی سوچ میں کسی قسم کی کوئی کجی نہ تھی۔ انہوں نے فوراً آپ کے بیان کی تصدیق کی۔

اس کے بعد حضرت خدیجہ اٹھیں۔ اپنے اوپر ایک چادر ڈالی اور اپنے چچا زاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس گئیں۔ ورقہ نے مسیحی مذہب اختیار کرلیا تھا اور تورات اور انجیل کا مطالعہ کیا تھا۔ حضرت خدیجہ نے جب ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا غار حرا کا قصہ بتایا تو ورقہ نے فوراً کہا: اے خدیجہ، اگر تو نے سچ کہا تو یہ آنے والا وہی ناموس اکبر تھا جو اس سے پہلے موسیٰ کے پاس آیا تھا۔ بیشک محمدؐ اس امت کے پیغمبر ہیں (سیرت ابن ہشام، جلد 1، صفحہ 238؛ صحیح مسلم، حدیث نمبر 160)۔

خدیجہ اب تک صرف آپ کی بیوی تھیں۔ اب وہ نبوت کے کام میں آپ کی ساتھی بن گئیں۔ انہوں نے ہر طرح آپ کی مدد کی۔ اپنی ساری دولت آپ کے حوالے کر دی۔ آپ کے ساتھ ہر قسم کی مصیبتیں برداشت کیں۔ شعب ابی طالب میں آپ کے ساتھ تین سال گزارے جو ناقابل بیان حد تک تکلیف دہ تھے۔ مگر ان سب کے باوجود کبھی ایک بار بھی اف کا کلمہ آپ کی زبان سے نہیں نکلا۔

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ مکہ میں ایک دن حضرت جبریلؑ آپ کے پاس آئے اور کہا کہ اے خدا کے رسولؐ، یہ خدیجہ آپ کے پاس آرہی ہیں۔ ان کے ساتھ ایک برتن ہے جس میں کچھ کھانا ہے۔ جب وہ آپ کے پاس آجائیں تو ان کو ان کے رب کی طرف سے سلام پہنچا دیجیے اور میری طرف سے بھی۔ اور ان کو جنت میں ایک ایسے گھر کی بشارت دیجیے جو موتی کا بنا ہوا ہوگا، اس میں نہ کوئی شور ہوگا اور نہ کوئی تکلیف: بَشِّرَهَا بِبَيْتٍ فِي الْجَنَّةِ مِنْ قَصَبٍ لَا صَخَبَ فِيهِ وَلَا نَصَبَ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 3820؛ صحیح مسلم، حدیث نمبر 2433)۔

اس بشارت کا پس منظر یہ ہے کہ اس وقت مکہ میں قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو،

اسی کے ساتھ حضرت خدیجہ کو سخت پریشان کررکھا تھا، آپ کے مکان کے پاس آکر شور کرتے۔ آپ کے راستہ میں کانٹا ڈالتے۔ آپ کو مختلف قسم کی تکلیفیں پہنچاتے۔ اس کے نتیجہ میں حضرت خدیجہ کی پرسکون اور پرمسرت زندگی بالکل برباد ہوگئی تھی۔ رسول اللہ سے نکاح ان کے لیے سادہ طور پر نکاح نہیں تھا بلکہ اپنے آپ کو مصیبتوں کے طوفان میں ڈال دینے کے ہم معنی تھا۔

اس وقت آپ کو مذکورہ بشارت دی گئی۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے براہ راست آپ کو یہ خوش خبری دی گئی کہ دنیا میں لوگ اگر تم کو پریشان کررہے ہیں تو اس سے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ آخرت کی ابدی زندگی میں ہم نے تمہارے لیے ایسا پرراحت محل تیار کررکھا ہے جو موتیوں اور جواہرات سے بنایا گیا ہوگا اور اس میں ہمیشہ کے لیے ایک ایسی پرسکون زندگی حاصل ہوگی جہاں نہ کسی کا شور داخل ہوگا اور نہ کوئی تکلیف دینے والا کبھی تم کو کوئی تکلیف پہنچا سکے گا۔

حضرت خدیجہ کو یہ انعام اس لیے دیا گیا کہ انہوں نے آنحضورؐ کے ساتھ اس طرح وفادارانہ زندگی گزاری کہ کبھی کسی چیز کے لیے شکایت نہیں کی۔ آپ نے نبوت کا اعلان کیا تو کسی ہچکچاہٹ کے بغیر فوراً آپ کی تصدیق کی۔ آپ کے مشن میں آخر وقت تک وہ آپ کی ساتھی بنی رہیں۔

حضرت عائشہ

حضرت عائشہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی تھیں۔ ہجرت سے آٹھ سال پہلے مکہ میں پیدا ہوئیں۔ 66 سال کی عمر میں 58ھ میں انتقال کیا۔ حضرت خدیجہؓ کے انتقال کے بعد خولہ بنت حکیم نے آپ کی طرف سے حضرت ابوبکر کو نکاح کا پیغام دیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے

کہا کہ اس سے پہلے مطعم بن عدی اپنے بیٹے جُبیر سے عائشہ کے نکاح کا پیغام دے چکے ہیں۔ اس کو میں نے منظور بھی کرلیا ہے۔ اور خدا کی قسم ابوبکر نے کبھی کسی وعدہ کے خلاف نہیں کیا (وَاللّٰهِ مَا أَخْلَفَ وَعْدًا قَطُّ)۔

حضرت ابوبکر صدیق اس کے بعد مطعم کے یہاں جا کر اس سے ملے۔ اس سے پوچھا کہ عائشہ سے اپنے بیٹے کے نکاح کی بابت تمہارا کیا خیال ہے۔ مطعم نے اپنی بیوی سے کہا کہ اس معاملہ میں تم کیا کہتی ہو۔ بیوی نے حضرت ابوبکر سے مخاطب ہو کر کہا کہ تم سے رشتہ کرنے میں مجھ کو یہ اندیشہ ہے کہ کہیں میرا لڑکا صابی (بے دین) ہو جائے اور اپنا آبائی مذہب چھوڑ کر تمہارے مذہب (اسلام) میں داخل ہو جائے۔ ابوبکر دوبارہ مطعم بن عدی سے مخاطب ہوئے اور پوچھا کہ اے مطعم، تم کیا کہتے ہو۔ مطعم نے جواب دیا کہ میری بیوی نے جو کچھ کہا وہ آپ نے سن لیا۔

اس طرح مطعم اور اس کی بیوی دونوں نے رشتہ سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد حضرت ابوبکر نے سمجھ لیا کہ وعدہ کی ذمہ داری ان کے اوپر نہیں ہے۔ اب حضرت ابوبکر نے خولہ سے کہہ دیا کہ تمہارا پیغام مجھے منظور ہے (دلائل النبوۃ للبیہقی، جلد 2، صفحہ 412-411)۔ اس کے بعد مقررہ وقت پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکرؓ کے مکان پر گئے، وہاں عائشہ سے آپ کا نکاح ہوا۔ مہر چار سو درہم مقرر ہوا (الطبقات الکبریٰ لابن سعد، جلد 8، صفحہ 63)۔

اس واقعہ میں یہ سبق ہے کہ معاشرتی معاملات میں اگر کبھی کوئی بات ٹوٹ جائے تو اس سے دل گرفتہ نہیں ہونا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے بعد کوئی نیا خیر نکلنے والا ہو۔ چنانچہ سردار مکہ کے لڑکے سے عائشہ کا رشتہ ٹوٹا، مگر اس کے بعد انہیں پیغمبر اعظم کی بیوی بننے کا شرف حاصل ہوا۔

حضرت عائشہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت چھوٹی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی وفات کے بعد وہ تقریباً 50 سال تک زندہ رہی۔ اس نامساوی نکاح کی مصلحت یہ تھی کہ عائشہؓ بے حد ذہین تھیں۔ ان کے اندر اخذ (grasp) کی بے پناہ صلاحیت تھی۔ اس نکاح نے ان کی خداداد صلاحیت کو سارے عالم کے لیے مفید بنا دیا۔

حضرت عائشہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تقریباً دس سال رہیں۔ اس مدت میں انہوں نے رات دن آپ کو دیکھا اور آپ کی تمام باتیں سنیں۔ اس طرح علم دین اور حکمت اسلام کا بہت بڑا ذخیرہ ان کے دماغ میں جمع ہو گیا۔ رسول اللہ کی وفات کے بعد انہوں نے اس علم نبوی کو امت تک پہنچایا۔ وہ تقریباً نصف صدی تک زندہ ٹیپ ریکارڈ بنی رہیں۔

حافظ ابن حجر (1449-1372ھ) ان کی بابت لکھتے ہیں کہ عائشہ کی پیدائش ہجرت سے تقریباً آٹھ سال پہلے ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو وہ تقریباً 18 سال کی تھیں۔ انہوں نے آپ سے بہت سی باتیں یاد رکھیں اور آپ کے بعد تقریباً 50 سال تک زندہ رہیں۔ لوگوں نے ان سے بہت زیادہ باتیں اخذ کیں۔ اور احکام وآداب میں سے بہت سی چیزیں ان سے نقل کیں۔ یہاں تک کہ کہا جاتا ہے کہ احکام شریعت کا چوتھائی حصہ ان سے نقل کیا گیا ہے۔ ان کی وفات امیر معاویہ کی خلافت کے زمانہ میں 58ھ میں ہوئی (فتح الباری جلد 7، صفحہ 134)۔

حضرت عائشہؓ سے اقوال رسولؐ بہت زیادہ منقول نہیں ہیں۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر بات کو نہایت غور سے سنا۔ آپ کے ہر عمل کو نہایت توجہ سے دیکھا اور پھر اپنی خداداد ذہانت سے اس کی حکمتیں معلوم کیں۔ ان کا کلام اسلامی حکمت اور معرفت کا خزانہ ہے۔ مثال کے طور پر انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم کو جب بھی دو میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہوتا تو آپ ہمیشہ دونوں میں سے آسان کا انتخاب فرماتے تھے: مَا خُيِّرَ رَسُولُ اللَّهِ صلى الله عليه وسلم بَيْنَ أَمْرَيْنِ فِي الْإِسْلَامِ إِلَّا اخْتَارَ أَيْسَرَهُمَا (صحیح البخاری، حدیث نمبر 3560؛ مسند احمد، حدیث نمبر 24549)۔ ان کے اس ایک قول میں معانی کا خزانہ چھپا ہوا ہے۔

حضرت عائشہؓ نے اپنی ذہانت کو خالص اسلام کے لیے استعمال کیا۔ اسی کے ساتھ انہوں نے زہد کو اپنا شعار بنایا۔ بعد کے زمانہ میں آپ کے پاس کثرت سے مال آتا تھا۔ مگر آپ سارا مال لوگوں کے درمیان تقسیم کر دیتی تھیں اور خود نہایت سادہ زندگی گزارتی تھیں۔ ایک بار حضرت عبداللہ بن زبیر نے ان کے پاس ایک لاکھ 80 ہزار درہم بھیجے۔ آپ نے سارا درہم شام تک خیرات کر دیا۔ جبکہ اس دن آپ روزہ سے تھیں اور گھر میں روٹی اور زیتون کے تیل کے سوا کوئی اور چیز موجود نہ تھی۔ خادمہ نے کہا کہ آپ کچھ درہم بچا کر گوشت منگا لیتیں تو اچھا ہوتا۔ فرمایا کہ تم نے پہلے یاد دلایا ہوتا تو منگا لیتی (طبقات ابن سعد، جلد 10، صفحہ 66)۔

یہ زہد ہی حکمت کا دروازہ ہے۔ جو یہ چاہتا ہو کہ خدائی معرفت اور اسلامی حکمت کا چشمہ ان کے ذہن میں جاری ہو اس کو اس دنیا میں مادی چیزوں سے بے رغبت ہو کر رہنا ہوگا۔

ایمان کی طاقت

شیخ حمید الدین ابو حاکم قریشی (737-570ھ) ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوئے جو کیچ اور مکران کے علاقہ پر حکومت کر رہا تھا۔ اپنے والد سلطان بہاء الدین کے انتقال کے بعد وہ تخت سلطنت پر بیٹھے اور 21 سال تک شان وشوکت کے ساتھ حکومت کی۔

''ذکر کرام'' میں ان کے واقعات کے ذیل میں لکھا ہے کہ شیخ حمید الدین کے ساتھ

ایک چھوٹا سا واقعہ پیش آیا جس نے ان کی زندگی کا رخ بدل دیا اور ”سلطان“ کے بجائے ان کو ”شیخ“ بنا دیا۔

شیخ حمید الدین اپنی حکومت کے زمانہ میں دوپہر کو اپنے ایک باغ میں قیلولہ کیا کرتے تھے۔ اس باغ میں ان کا ایک محل تھا۔ اس محل کی نگرانی نونیت نامی ایک مسلم خادمہ کے سپرد تھی۔ اس مسلم خادمہ کے ذمہ یہ کام تھا کہ ہر روز وقت پر وہ بستر بچھا دے تا کہ شیخ حمید الدین آ کر اس پر آرام کرسکیں۔

بیان کیا جاتا ہے کہ ایک روز شیخ کے آنے سے پہلے خادمہ نے بستر بچھایا تو اس کو بستر بہت اچھا لگا۔ وہ اس پر کچھ دیر کے لیے لیٹ گئی۔ ابھی وہ بستر سے اٹھی نہیں تھی کہ اس کو نیند آ گئی۔ شیخ حمید الدین جب معمول کے مطابق آرام کرنے کے لیے محل پہنچے تو دیکھا کہ خادمہ نونیت بستر پر پڑی سو رہی ہے۔ سلطان کے بستر پر خادمہ کو سویا ہوا دیکھ کر انہیں غصہ آ گیا۔ انہوں نے حکم دیا کہ اس گستاخی پر خادمہ کو سو کوڑوں کی سزا دی جائے۔

حکم کی فوراً تعمیل ہوئی اور خادمہ کو کوڑے مارے جانے لگے۔ مگر یہ عام قسم کی خادمہ نہیں تھی۔ بلکہ وہ مومنہ اور مسلمہ تھی۔ چنانچہ شیخ حمید الدین کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ خادمہ آہ و واویلا نہیں کر رہی ہے، بلکہ ہر کوڑے پر ہنس پڑتی ہے۔ انہوں نے سزا کو روک کر خادمہ کو بلایا اور اس سے خلاف معمول ہنسنے کی وجہ پوچھی۔ خادمہ نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا:

”مجھے خیال آیا کہ جب اس نرم بستر پر ایک بے اختیارانہ نیند کی یہ سزا ہے تو ان لوگوں کا انجام کیا ہوگا جو روزانہ اس نرم بستر پر آرام کرتے ہیں“۔

خادمہ کے اس جواب کا سلطان حمید الدین پر اتنا اثر ہوا کہ ان کی زندگی بالکل بدل گئی۔ وہ سلطان کے بجائے شیخ بن گئے۔ وہ دنیا اور اس کی لذتوں سے بے رغبت ہو گئے۔ یہاں

تک کہ درویشی کی زندگی اختیار کرلی۔ سلطنت چھوڑ کر شیخ حمید الدین لاہور آئے۔ یہاں حضرت سید احمد توختہ (جوان کے نانا بھی ہوتے تھے) کی خدمت میں حاضر ہوکر ان کے ہاتھ پر طریقہ شطاریہ میں بیعت کی اور ریاضتوں اور مجاہدوں کے بعد ان کی خلافت حاصل کی۔ شیخ حمید الدین نے 167 سال کی عمر پائی۔ آخر عمر میں وہ اُچ اور سکھر کے درمیانی علاقہ میں تبلیغ و ارشاد کا کام کرتے رہے۔ اس علاقہ میں بہت سے لوگ ان کے ہاتھ پر ایمان لائے (تذکرۂ صوفیاء پنجاب از اعجاز الحق قدوسی، صفحہ 242-240)۔

ایک عورت اگر صحیح معنوں میں ایمان اور اسلام پر ہو تو وہ خادمہ ہو کر بھی مالک سے زیادہ طاقت ور ہو جاتی ہے۔ اس کا ایک جملہ بادشاہ کو تڑپانے کے لیے کافی ہو جاتا ہے۔ اسلام کی تاریخ میں ایسی خواتین بہت ہیں جنہوں نے اپنے ایک مومنانہ کلمہ سے بڑے بڑے لوگوں کی زندگیاں بدل دیں۔

بنوعباس کے آخری زمانہ میں تاتاریوں نے مسلم دنیا کو پامال کر ڈالا۔ ایک مورخ کے الفاظ میں: اسلام کی تاریخ میں کوئی واقعہ ایسا نہیں ہے جس کا مقابلہ دہشت انگیزی اور غارت گری میں تاتاری حملہ سے کیا جا سکے۔ جس طرح کسی پہاڑ سے بہت بڑا تودہ کسی بستی پر آ گرے اسی طرح تاتاریوں کے وحشی لشکر اسلامی تہذیب و تمدن کے مرکزوں پر ٹوٹ پڑے اور اپنے پیچھے ویران صحرا اور بھیانک کھنڈر کے سوا کچھ اور نہیں چھوڑا۔

جیسا کہ معلوم ہے، یہ المناک حادثہ دوبارہ اس طرح بدلا کہ وحشی تاتاری اسلام قبول کرکے اسلام کے حامی اور پاسباں بن گئے۔ یہ انقلابی واقعہ جن لوگوں کے ذریعہ انجام پایا ان میں بڑی تعداد عورتوں کی تھی۔ تاتاریوں نے مسلم دنیا کو تاراج کرنے کے بعد مردوں کو قتل کیا اور عورتوں کو لونڈی بنا لیا۔ یہ خواتین جو تاتاری گھروں میں زبردستی داخل کی گئی تھیں،

انہوں نے خاموشی کے ساتھ تاتاریوں پر اسلام کی تبلیغ شروع کردی۔ یہاں تک کہ ان کی اکثریت کو اسلام میں داخل کردیا۔

The preaching of IsIam, pp.226-234

تاتاریوں (مغلوں) کا پہلا فرماں روا جس نے اسلام قبول کیا وہ برکہ خان تھا۔ اس نے 1256ء سے لے کر 1267ء تک حکومت کی۔ برکہ خان کی ماں ایک مسلمان تھی۔ اس نے بچپن سے اس کی تربیت اسلامی انداز پر کی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ بڑا ہو کر مسلمان ہو گیا۔ اسی طرح غازان خان کا بھائی الجائتو اپنی مسلمان بیوی کی ترغیب سے اسلام لے آیا، وغیرہ۔ اسلامی خواتین کی تاریخ اس قسم کے کارناموں سے بھری ہوئی ہے۔

ایک گواہی

امریکہ کے سفر میں مجھے ایک امریکی خاتون کا حال معلوم ہوا جنہوں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ اب وہ ایک پاکستانی مسلمان نصیر احمد مرزا سے نکاح کر کے اوٹا (Utah) میں رہتی ہیں۔ ان کا نام جے عائشہ مرزا (Jeanine Aisha Mirza) ہے۔ ان کا ایک انٹرویو میں نے پڑھا۔ اس کا ایک حصہ یہ تھا کہ اکثر امریکی یہ سمجھتے ہیں کہ مسلم بیویاں زیادتی کا شکار ہوتی ہیں۔ مگر ان کے نزدیک یہ خیال درست نہیں۔ یہ تو محض ایک تقسیم ہے۔ گھر کے باہر میرا شوہر باس ہے۔ لیکن گھر کے اندر میں باس ہوں:

While most Americans are under the impression that Muslim wives are opressed. Mirza said, she hasn`t found that to be true. "It`s just a different division. Outside the home, my husband`s the boss. But in my house, I`m the boss."

اس طرح کے متعدد واقعات میرے علم میں آئے۔ امریکہ کی لڑکیاں سفید فام نسل کے لڑکوں سے شادی کرنے میں متردد رہتی ہیں۔ کیونکہ انہیں ہر وقت طلاق کا ڈر لگا رہتا ہے۔ اس بنا پر اکثر سنجیدہ لڑکیاں مسلمان لڑکوں سے شادی کرنا پسند کرتی ہیں۔ یہ لڑکے وہ ہیں جو تعلیم کے مقصد سے امریکہ آتے ہیں۔ اس طرح کی شادیاں اسلام کی تبلیغ کا ذریعہ بھی بن رہی ہیں۔ کیونکہ اخبار کے لوگ ان امریکی لڑکیوں سے سوالات کرتے ہیں۔ اور وہ نہایت عمدہ انداز میں اسلام کی طرف سے دفاع کرتی ہیں، جس کی ایک مثال اوپر نقل ہوئی۔

مذکورہ امریکی خاتون نے اپنے تجربہ کی روشنی میں اسلام کے اصول کی نہایت درست ترجمانی کی ہے۔ اسلام میں عورت کے درجہ کو مرد کے مقابلہ میں گرایا نہیں گیا ہے۔ بلکہ برابری کے اصول پر دونوں کے درمیان تقسیم کار کا نظام قائم کیا گیا ہے۔ اسلام نے زندگی کے معاملات کو دو بڑے حصوں میں بانٹ دیا ہے۔ ایک بیرونی حصہ، دوسرا اندرونی حصہ۔ اسلام کے مطابق، بیرونی حصہ حیات کا انچارج مرد ہے اور اندرونی حصہ حیات کی انچارج عورت۔

یہ تقسیم کار دونوں کے لیے نہایت موزوں ہے۔ اس طرح زندگی کے ایک شعبہ میں مرد اپنی پوری طاقت لگانے کے لیے آزاد ہو جاتا ہے۔ اسی طرح عورت زندگی کے دوسرے شعبہ میں آزاد ہے کہ وہ اپنی پوری توجہ کو استعمال کرتے ہوئے اس کو بخوبی طور پر منظم کرے۔

یہ تقسیم ایک اعتبار سے آزادانہ حیثیت رکھتی ہے۔ اور دوسرے اعتبار سے اس کی حیثیت دندانہ دار پہیہ (cogwheel) جیسی ہے۔ دندانہ دار پہیہ میں ہر پہیہ کی اپنی الگ شخصیت ہوتی ہے۔ اس کے باوجود دونوں پوری طرح ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ ایک کا عمل دوسرے سے بندھا ہوا ہوتا ہے۔ ان کی درست کارکردگی کا انحصار اس پر ہوتا ہے کہ دونوں پوری طرح ایک دوسرے کا ساتھ دے رہے ہوں۔

عورت کو اپنے نقشہ حیات میں اسی احساس کے ساتھ رہنا ہے۔ اس کو یہ سمجھنا ہے کہ وہ داندانہ دار پہیہ کے دو برابر کے پرزوں میں سے ایک پرزہ ہے۔ اس کے مل کر چلنے سے پورا پہیہ چلے گا، اور اس کے نہ چلنے سے پورا پہیہ رک جائے گا اور اسی کے ساتھ زندگی کا پورا نظام بھی۔

تقسیم کار کے معاملہ کا تعلق صرف عورت اور مرد سے نہیں ہے۔ وہ ایک عام اصول ہے جس پر فطرت کا پورا نظام قائم ہے۔

آپ ایک بزنس ہاؤس قائم کریں جہاں بہت سے لوگ کام کر رہے ہوں۔ آپ کو یہ کرنا ہوگا کہ کچھ لوگوں کو آفس میں بٹھائیں اور کچھ لوگوں کو فیلڈ میں متحرک کریں۔ یہ تقسیم ہر کاروبار کو کامیابی کے ساتھ چلانے کے لیے ضروری ہے۔ کسی کاروبار یا کسی آرگنائزیشن کے کارکن اگر اس تقسیم عمل پر راضی نہ ہوں تو ایسے کاروبار یا آرگنائزیشن کا ناکام ہوجانا یقینی ہے۔

یہی معاملہ کاروبار حیات کا ہے۔ زندگی کے لیے خدا نے یہ طریقہ بنایا ہے کہ عورت اور مرد دونوں مل کر اسے چلائیں۔ پھر ان دونوں کے لیے بنیادی دائرہ کار مقرر کر دیا ہے اور ہر ایک کے اندر مخصوص طور پر وہی صلاحیتیں رکھ دی ہیں جو اس کو اپنے دائرہ کے کام کو بخوبی طور پر انجام دینے کے لیے ضروری ہیں۔

اب عقل اور شریعت دونوں کا تقاضا ہے کہ ہر جنس اپنے اپنے دائرہ عمل پر راضی رہ کر اپنے حصہ کا کام پوری توجہ کے ساتھ انجام دے۔ نہ مرد عورت بننے کی کوشش کرے اور نہ عورت مرد کی نقل کرے۔ جو عورت اور مرد خدا کے اس بندوبست پر راضی ہوں وہ خدا کی مدد سے دنیا میں بھی کامیاب ہوں گے اور آخرت میں بھی کامیاب۔

تین مرحلے

ایک عورت کو اپنی زندگی میں تین بڑے مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ سب سے پہلے وہ اپنے والدین کے ساتھ ایک لڑکی کی صورت میں اپنے صبح وشام بسر کرتی ہے۔ اس کے بعد اس کا نکاح ہوتا ہے اور وہ بیوی کی حیثیت سے اپنے شوہر کے گھر منتقل ہوتی ہے۔ اس کے بعد اس کے یہاں بچے پیدا ہوتے ہیں اور اس کی حیثیت ماں کی بن جاتی ہے۔

یہ تینوں مرحلے تقریباً ہر عورت کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کے تقاضے الگ الگ ہیں اور ہر دور میں عورت کو اس کے لحاظ سے اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرنا ہے تاکہ اس کی ترقی جاری رہے اور وہ آخری کامیابی کی منزل تک پہنچ سکے۔ ان تینوں مرحلوں میں عورت کو جو کام کرنا ہے اس کو تین عنوانات کے تحت بیان کیا جا سکتا ہے — تعلیم، خانہ آبادی، تربیت نسل۔

پہلے مرحلہ میں جب کہ عورت کی حیثیت ایک لڑکی کی ہوتی ہے، اس کی سب سے بڑی ذمہ داری تعلیم کا حصول ہے۔ زندگی کا یہی وہ تعمیری دور ہے جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ علم کا حصول ہر مومن مرد اور ہر مومن عورت پر فرض ہے: طَلَبُ العِلمِ فَرِيضَةٌ عَلَى كُلِّ مُؤمِنٍ وَمُؤمِنَةٍ (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 224)۔

تعلیم زندگی کی تعمیر ہے۔ تعلیم ہی کے ذریعہ انسان حقیقی معنوں میں انسان بنتا ہے۔ تعلیم ہی کے ذریعہ ذہن اس ارتقائی حالت تک پہنچتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اور دوسروں کو سمجھے۔ وہ دنیا اور آخرت سے سچی واقفیت حاصل کرے۔ وہ مراحل حیات میں کھلی آنکھ اور کھلے ذہن کے ساتھ داخل ہو اور صحیح طور پر اپنی ذمہ داریوں کو ادا کر سکے۔

ایک عورت جب ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتی ہے تو اس کی حیثیت ایک خام مادہ کی ہوتی ہے۔ اس کے اندر تمام فطری صلاحیتیں موجود ہوتی ہیں مگر یہ صلاحیتیں خام حالت میں ہوتی ہیں۔ ان صلاحیتوں کو جلا دینے کا کام تعلیم کے ذریعے انجام پاتا ہے۔ تعلیم گویا لوہے کو اسٹیل بناتی ہے، وہ فطری امکانات کو واقعہ کے روپ میں تشکیل دیتی ہے۔

تعلیم عورت کی شخصیت کو مکمل کرتی ہے۔ ہر عورت کے لیے ضروری ہے کہ وہ تعلیم حاصل کرے، عورت جتنی زیادہ صاحب علم ہوگی اتنا ہی زیادہ وہ اس دنیا میں اپنی ذمہ داریوں کو ادا کر سکے گی۔

تعلیم کے دو پہلو ہیں۔ ایک کو سیکولر تعلیم اور دوسرے کو دینی تعلیم کہہ سکتے ہیں۔ عورت کے لیے دونوں ہی ضروری ہیں، اگر چہ دونوں کی نوعیت ایک دوسرے سے جدا ہے۔ سیکولر تعلیم اگر ضرورت حیات کے درجہ میں مطلوب ہے تو دینی تعلیم مقصد حیات کے درجہ میں درکار ہے۔

سیکولر تعلیم عورت کو زندگی کا شعور عطا کرتی ہے۔ وہ اس کو سوچنے اور رائے قائم کرنے کا طریقہ بتاتی ہے۔ انسانی نفسیات کیا ہے۔ زمانہ کے تقاضے کیا ہیں۔ قوم اور ملک کی تاریخ کیا ہے۔ وہ انسانی حالات کیا ہیں جن کے درمیان اس کو زندگی کا امتحان دینا ہے۔ یہ تمام چیزیں اس کو سیکولر تعلیم یا دنیوی تعلیم کے ذریعہ معلوم ہوتی ہیں۔ اس تعلیم کو حاصل کرنا عورت کے لیے انتہائی ضروری ہے، اس کے بغیر وہ اپنے فرائض حیات کو کامیابی کے ساتھ ادا نہیں کر سکتی۔

دینی تعلیم کی حیثیت مقصدی ہے۔ ہر عورت پر لازم ہے کہ وہ ضروری حد تک قرآن اور حدیث کا علم حاصل کرے۔ وہ صحابہ اور صحابیات کی زندگیوں کو جانے۔ وہ اسلام کی تاریخ سے بقدر ضرورت واقف ہو۔ وہ جانے کہ انسان کے لیے اسلام کا عطیہ کیا ہے۔

عورت اگر عربی زبان سیکھ سکے تو بہت اچھی بات ہے۔ ورنہ اپنی مادری زبان میں اس کو

قرآن کا ترجمہ پڑھنا چاہیے اور بار بار اس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ کیونکہ قرآن کی حیثیت دین میں اساس کی ہے۔ قرآن کی تعلیمات سے واقفیت کے بغیر دین کا فہم وادراک ممکن نہیں۔

اس کے بعد عورت کو احادیث کا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ اگر وہ عربی زبان جانے اور عربی میں پڑھ سکے تو زیادہ بہتر ہے، ورنہ آج ہر زبان میں حدیث اور سیرت پر کتابیں موجود ہیں۔ اس کو چاہیے کہ اپنی زبان میں اس موضوع پر کتابیں حاصل کرے اور اہتمام کے ساتھ ان کا مطالعہ کرے۔

اس کے بعد صحابہ کے حالات اور دوسری دینی شخصیتوں کے حالات کا معاملہ ہے۔ ان پر بھی ہر زبان میں کثرت سے کتابیں موجود ہیں۔ ہر عورت کے لیے ضروری ہے کہ ان کتابوں کو اپنے حالات کے اعتبار سے پڑھے اور اس میں پوری آگہی حاصل کرے۔

عورت کی زندگی کا دوسرا مرحلہ وہ ہے جب کہ اس کا نکاح ہوتا ہے اور وہ کسی مرد کی بیوی بن کر نئے گھر میں منتقل ہوتی ہے۔ اس دوسرے دورِ حیات میں اس کی جو ذمہ داریاں ہیں اس کو ایک لفظ میں خانہ آبادی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اب عورت محض ایک فرد نہیں رہی، وہ سماج کا ایک ایسا جزء بن جاتی ہے جس کے بغیر نہ وہ خود مکمل ہے اور نہ سماج۔

خانہ آبادی کے اس دور میں عورت کو جس طرح رہنا ہے، اس کو ایک لفظ میں حسن معاشرت کہا جا سکتا ہے۔ قرآن میں مردوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ تم عورتوں کے ساتھ اچھی طرح گزر کرو (وَعَاشِرُوهُنَّ بِٱلْمَعْرُوفِ)، اگر وہ تم کو ناپسند ہوں تو ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تم کو پسند نہ ہو مگر اللہ نے اس میں تمہارے لیے بہت بڑی بھلائی رکھ دی ہو (4:19)۔

یہ بات جو مردوں سے کہی گئی وہی عورتوں سے متعلق بھی ہے۔ عورت کو بھی اسی ذہن

کے ساتھ اپنا گھر بسانا ہے کہ خانہ آبادی میں حاصل اہمیت ذاتی پسند ناپسند کی نہیں ہے بلکہ مجموعی انسانی فلاح کی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ذاتی اعتبار سے ایک چیز آپ کو پسند نہ آتی ہو مگر مجموعی انسانیت کے اعتبار سے اس میں خیر ہو۔ اس لیے گھر کے اندر ناموافق باتوں کو نبھاتے ہوئے ہنسی خوشی زندگی گزارنا ہے۔

تیسرا مرحلہ وہ ہے جب کہ عورت ماں بن جاتی ہے۔ اب اس کی ذمہ داریوں کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ یعنی اگلی نسل کی تیاری میں اپنا حصہ ادا کرنا۔ ہر گھر یا خاندان گویا کہ وسیع تر انسانیت کی ایک اکائی ہے۔ اکائیوں کی درستگی سے مجموعہ درست ہوتا ہے۔ اب عورت کو یہ کرنا ہے کہ اپنی اکائی کو درست کرنے میں لگ جائے تاکہ وسیع تر انسانی معاشرہ درست معاشرہ بن سکے۔

عورت کو اپنے بچوں کو بہترین تعلیم دینا ہے۔ اس کو اعلیٰ انسانی اخلاق سکھانا ہے۔ اس کو اس قابل بنانا ہے کہ وہ اپنے گھر میں اور اپنے سماج میں ایک شریف اور دیانت دار انسان کی حیثیت سے رہ سکے۔ عورت کو اپنی اولاد کو اس قابل بنانا ہے کہ وہ دنیا میں انسانوں کے حقوق ادا کرنے والے بنیں، اور آخرت میں خدا کی رضا کے مستحق قرار پائیں۔

عربی کا مقولہ ہے: التَّعلِيمُ فِي الصِغَرِ كَالنَّقشِ فِي الحَجَرِ۔ یعنی، کم عمری کی تعلیم پتھر میں نقش کی مانند ہے (فتح الباری، جلد 8، صفحہ 702) بچہ میں یہ حجری نقش بنانا ماں ہی کا کام ہے۔ اگر عورت اس امکان کو پوری طرح استعمال کرے تو اس کی آغوش میں پلا ہوا بچہ ایک ایسا انسان بن کر ابھرے گا، جو انسانی دنیا کے لیے ایک قیمتی سرمایہ ہو نہ کہ کوئی بوجھ۔

وہی عوت کامل عورت ہے جو ان تینوں ذمہ داریوں میں پوری اترے۔

نکاح وطلاق

نکاح سے پہلے

حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص جب کسی عورت کو نکاح کا پیغام دے تو اگر اس شخص کے لیے ممکن ہو کہ وہ اسے دیکھے تاکہ اس سے نکاح کی طرف رغبت ہو تو وہ ضرور ایسا کرے: إِذَا خَطَبَ أَحَدُكُمُ الْمَرْأَةَ، فَإِنِ اسْتَطَاعَ أَنْ يَنْظُرَ إِلَى مَا يَدْعُوهُ إِلَى نِكَاحِهَا فَلْيَفْعَلْ (سنن ابوداؤد، حدیث نمبر 2082)۔

حضرت مغیرہ بن شعبہ کہتے ہیں کہ میں نے ایک عورت کو نکاح کا پیغام دیا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے کہا کہ کیا تم نے اس عورت کو دیکھا ہے۔ میں نے کہا کہ نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اس کو نکاح سے پہلے دیکھ لو۔ کیونکہ اس طرح زیادہ امید ہے کہ تم دونوں کے تعلق میں استواری پیدا ہوگی: قَالَ: خَطَبْتُ امْرَأَةً، فَقَالَ لِيَ النَّبِيُّ صلى الله عليه وسلم: هَلْ نَظَرْتَ إِلَيْهَا؟ قُلْتُ: لَا، قَالَ: فَانْظُرْ إِلَيْهَا، فَإِنَّهُ أَحْرَى أَنْ يُؤْدَمَ بَيْنَكُمَا (مصنف ابن ابوشیبہ، حدیث نمبر 17388)۔

نکاح کے بعد

حضرت عبداللہ بن عمر کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سب سے زیادہ ناپسندیدہ حلال اللہ کے نزدیک طلاق ہے — إِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عليهِ وسلَّم قالَ: أَبْغَضُ الْحَلَالِ إِلَى اللّٰهِ الطَّلَاقُ (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 2018)۔ معاذ بن جبل کہتے

ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کہ اے معاذ، اللہ نے زمین پر سب سے زیادہ محبوب چیز جو پیدا کی وہ غلام کو آزاد کرنا ہے، اور اللہ نے سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز جو زمین پر پیدا کی وہ طلاق ہے: قَالَ لِي رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: يَا مُعَاذُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ شَيْئًا عَلَى وَجْهِ الْأَرْضِ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنَ الْعَتَاقِ، وَلَا خَلَقَ اللّٰهُ شَيْئًا عَلَى وَجْهِ الْأَرْضِ أَبْغَضَ إِلَيْهِ مِنَ الطَّلَاقِ (سنن الدارقطنی، حدیث نمبر 3984)۔

ان روایات سے نکاح وطلاق کے بارے میں اسلام کا مزاج معلوم ہوتا ہے۔ اسلام میں یہ مطلوب ہے کہ آدمی نکاح سے پہلے تو خوب سوچے۔ مگر نکاح کے بعد وہ صرف نباہنے کی کوشش کرے۔ اسلام میں غیر عورت کو بالقصد دیکھنا جائز نہیں۔ مگر مخطوبہ کو دیکھنے کی کھلی اجازت دی گئی ہے۔ دوسری طرف طلاق کو ”ابغض المباحات“ قرار دیا گیا۔ گویا نکاح سے پہلے تحقیق کے لیے ممنوعہ حد تک جانے کی اجازت ہے۔ مگر نکاح کے بعد مباح حد کے اندر داخلہ بھی پسند نہیں۔

رحمۃ للعالمینؐ

سیرت رسول کا ایک مطالعہ

مطالعہ سیرت

پیغمبر اسلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تاریخ کی ایک استثنائی شخصیت ہیں۔ آپ واحد انسان ہیں جن کی زندگی میں انسانیت اعلیٰ کے تمام پہلو اپنی کامل صورت میں جمع ہو گئے۔ آپ کی زندگی کا مطالعہ گویا کامل انسانیت کا مطالعہ ہے۔ یہی بات قرآن میں ان لفظوں میں کہی گئی ہے کہ — إِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ (68:4)۔ یعنی، بیشک تم ایک اعلیٰ اخلاق پر ہو۔

سیرت رسول ایک جامع قسم کی انسانی انسائیکلو پیڈیا ہے۔ وہ نہ صرف حیات بشری کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کیے ہوئے ہے، بلکہ مختلف زمانوں کی رعایت بھی اس میں کمال درجہ میں پائی جاتی ہے۔

تاہم سیرت رسول کا مطالعہ سادہ طور پر ڈکشنری کے انداز میں نہیں کیا جا سکتا۔ ڈکشنری میں ہم ایسا کرتے ہیں کہ اپنا مطلوب لفظ حروف تہجی کی ترتیب سے نکال کر دیکھ لیتے ہیں۔ اسی طرح سیرت کا مطالعہ اس طرح نہیں کیا جا سکتا کہ حدیث اور سیرت کی مروجہ کتابوں میں متعلق ابواب کو کھول کر دیکھ لیا جائے۔ ایسا مطالعہ سیرت کا کامل مطالعہ نہیں ہو سکتا۔

قرآن میں ہے کہ: تمھارے لیے اللہ کے رسول میں بہترین نمونہ ہے، اس شخص کے لیے جو اللہ کا اور آخرت کے دن کا امیدوار ہو اور کثرت سے اللہ کو یاد کرے (23:21)۔

رسول کی زندگی میں بلاشبہ حیات بشری کے لیے کامل نمونہ ہے۔ مگر اس نمونہ کو اس کی گہرائیوں کے ساتھ سمجھنے کے لیے وہ شخصیت درکار ہے جس کی معرفت اتنی بڑھی ہوئی ہو کہ ایک خدا ہی اس کی تمام توجہات کا مرکز بن جائے۔ وہ زندگی کی حقیقت سے اتنا زیادہ باخبر ہو جائے کہ آخرت کے سوا ہر چیز اس کو بے حقیقت نظر آنے لگے۔ وہ معرفت کی اس سطح پر پہنچا ہوا ہو کہ اللہ کی یاد اس کی سب سے بڑی ذہنی سرگرمی بن گئی ہو۔

آدمی جب روحانی بلندی یا شعوری ارتقا کے اس درجہ پر پہنچتا ہے تو وہ آخری حد تک حقیقت شناس بن جاتا ہے۔ اور ایک سچا حقیقت شناس ہی سیرت کو اس کی تمام گہرائیوں کے ساتھ سمجھ سکتا ہے۔ آدمی حقیقت شناسی کے جس مرتبہ پر ہوگا اسی کے بقدر وہ سیرت کے رموز کو سمجھنے میں کامیاب ہوگا۔

سیرت کا مطالعہ گویا معرفت کے سمندر میں غواصی ہے۔ غواصی کا یہ عمل قیامت تک جاری رہے گا۔ لوگ اپنی ہمت کے مطابق ہمیشہ اس سے نئے نئے موتی نکالیں گے۔ ہر دور کے انسان اس خزانہ سے مالا مال ہوتے رہیں گے، وہ کبھی کسی کے لیے خالی ہونے والا نہیں۔

دلیل نبوت

قرآن میں پیغمبر اسلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ارشاد ہوا ہے: اللّٰہُ أَعۡلَمُ حَيۡثُ يَجۡعَلُ رِسَالَتَهُ (6:124)۔ اس آیت کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ اللہ خوب جانتا ہے کہ وہ اپنی پیغمبری کو کہاں رکھے۔ یعنی پیغمبر کو بھیجنے کے لیے وہ مناسب شخص اور مناسب وقت اور مناسب جگہ کو بخوبی جانتا ہے اور اسی کے مطابق اس نے اپنے پیغمبر کو مبعوث کیا ہے۔

اس آیت میں جَعَلَ سے مراد وَضَعَ (placement) ہے۔ حضرت ابراہیم نے بنائے کعبہ کے وقت یہ دعا کی تھی کہ یا اللہ، تو اسماعیل کی نسل میں ایک نبی پیدا کر (البقرہ، 2:129)۔ اس دعا کے ڈھائی ہزار سال بعد محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب مکہ میں پیدا ہوئے گہرا مطالعہ بتاتا ہے کہ یہ وضع رسالت انتہائی موزوں تاریخی لمحہ میں وقوع میں آیا۔ پوری نسل اسماعیل میں سے اس انسان کا انتخاب کیا گیا جو اس منصب کے لیے موزوں ترین تھا۔ وہ اس ملک میں پیدا ہوئے جو اس کام کے لیے سب سے زیادہ مناسب ملک تھا اور

اس وقتِ خاص میں ان کا ظہور ہوا جب کہ تمام موافق اسباب حیرت انگیز طور پر ایک ساتھ جمع ہو گئے تھے۔

پیغمبر اسلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو عظیم کارنامہ انجام دیا وہ حیرت انگیز ہے۔ مگر اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز مختلف موافق اسباب کا وہ اجتماع ہے جو عین ان کی مدت عمر میں بیک وقت ان کے حق میں اکٹھا ہو گئے۔ آپ کے حق میں یہ غیر معمولی تاریخی مساعدت بیک وقت دلیل توحید بھی ہے اور دلیل نبوت بھی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس عالم کے پیچھے ایک عظیم ذہن اور عظیم ارادہ والی ہستی موجود ہے۔ نیز یہ کہ یہی وہ ہستی ہے جس نے محمد عربی کو اتنے زیادہ موزوں تاریخی وقت میں اور اتنے زیادہ موزوں جغرافی مقام پر مبعوث فرمایا۔ خدائے عظیم و برتر کے سوا کوئی بھی ایسا کرنے پر قادر نہ تھا۔

کوئی بڑا کارنامہ یا کوئی انقلابی کام انجام دینے کے لیے تین چیزیں انتہائی طور پر ضروری ہیں — اعلیٰ قائد، موزوں مقام، موافق تاریخی حالات۔ اسلامی انقلاب کے حق میں یہ تینوں اسباب اعلیٰ ترین صورت میں جمع ہو گئے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم متفقہ طور پر اعلیٰ ترین قائدانہ اوصاف کے مالک تھے۔ عرب مطلوبہ انقلاب کے لیے موزوں ترین مقام تھا۔ جس کا اعتراف اکثر مورخین نے کیا ہے۔ اسی طرح تاریخی وقت کے اعتبار سے وہ وقت سب سے زیادہ موزوں تھا جب کہ آپ کی بعثت ہوئی۔

کوئی انقلابی کام انجام دینے کے لیے تاریخ کی موافقت انتہائی طور پر ضروری ہے۔ تاریخی اسباب کی موافقت کے بغیر اس دنیا میں کوئی بڑا انقلاب برپا نہیں کیا جاسکتا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ آپ نے عظیم ترین انقلاب برپا کیا۔ ایسا اس لیے ممکن ہوا کہ حیرت انگیز طور پر اعلیٰ تین تاریخی اسباب آپ کے حق میں جمع ہو گئے تھے۔

1۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش 570ء میں ہوئی۔ عین اسی سال اصحاب فیل کا واقعہ پیش آیا۔ یمن کے حاکم ابرھہ نے ہاتھیوں کی ناقابل تسخیر فوج کے ساتھ مکہ پر حملہ کیا تاکہ کعبۃ اللہ کو ڈھادے۔ مگر معجزاتی طور پر یہ واقعہ پیش آیا کہ ان کے اوپر کنکریوں کی بارش ہوئی جس میں ساری فوج بھس بن کررہ گئی۔

یہ ایک انتہائی غیر معمولی واقعہ تھا جس نے اہل عرب کی نظر میں توحید کی عظمت کو ازسرنو قائم کردیا اور شرک و بت پرستی کا پورا نظام بے قیمت ہو کر رہ گیا۔ یہی بات ہے جس کی طرف قرآن کی سورہ نمبر 106، 105 میں اشارہ کیا گیا ہے۔ عین اس عظیم مظاہرۂ توحید کے زمانہ میں پیغمبر اسلامؐ کی پیدائش ہوئی جو اس لیے دنیا میں بھیجے گئے کہ وہ شرک کو ختم کریں اور توحید کی عظمت دنیا میں قائم کردیں۔ پیغمبر توحید کا عین عام الفیل میں پیدا ہونا خدائی منصوبہ بندی کی ایک حیرت انگیز مثال ہے۔

2۔ پیغمبر اسلام کو یہ موقع ملا کہ وہ توحید کی دعوت کا کام مکہ میں شروع کریں۔ مکہ کی خصوصیت یہ تھی کہ صدیوں کے حالات کے نتیجہ میں وہ عرب قیادت کا مرکز بن گیا تھا۔ مکہ میں بین الاقوامی تجارت اور بین الاقوامی تعلق کی روایات پائی جاتی تھیں۔ چنانچہ یہاں ایسے لوگ موجود تھے جن کو اپنے زمانہ میں اصحابِ فکر اور اصحابِ قیادت کا درجہ حاصل تھا۔ مثال کے طور پر ابوبکر بن ابی قحافہ اور عمر بن الخطاب وغیرہ۔ اس قسم کے اعلیٰ افراد کو اسلامی تحریک کی حمایت میں لینا ضروری تھا۔ چنانچہ اسلامی جماعت کے بیشتر تاریخ ساز افراد مکہ ہی سے حاصل ہوئے۔ یہی وہ حقیقت ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دعا میں نظر آتی ہے کہ اے اللہ، اسلام کو ابوالحکم بن ہشام یا عمر بن الخطاب کے ذریعہ طاقت دے — اللَّهُمَّ أَيِّدْ الإسلام بِأَبِي الْحَكَمِ بْنِ هِشَامٍ، أَوْ بِعُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ (سیرت ابن ہشام، جلد 1، صفحہ

296)۔ تاہم مکہ والوں کے لیے شرک ایک اقتصادی انٹرسٹ کا معاملہ تھا۔ انہوں نے عرب کے 360 قبیلوں کے 360 بت کعبہ میں رکھ دیے تھے۔ یہ قبیلے سال بھر مکہ آتے تھے۔ ان کی وجہ سے مکہ کی تجارت کو فروغ حاصل ہوتا تھا۔ ان بت پرست قبائل کی مکہ میں آمد ٹھیک اسی طرح تجارتی نوعیت رکھتی تھی، جس طرح کسی سیاحتی ملک میں سیاحوں کی آمد تجارتی اہمیت رکھتی ہے۔ موجودہ زمانہ میں سیاحت کو انڈسٹری سمجھا جاتا ہے، اسی طرح مکہ والوں کے لیے شرک ایک انڈسٹری تھی۔ ان کے بیشتر تجارتی مفادات اسی انڈسٹری سے وابستہ تھے۔ اس لیے مکہ میں عمومی سطح پر توحید کو مقبولیت حاصل نہیں ہوئی۔ یہی بات تھی جس کو قرآن کے بیان کے مطابق اہل مکہ نے اس طرح کہا تھا: اگر ہم تمہارے ساتھ ہو کر توحید کی اس ہدایت پر چلنے لگیں تو ہم اپنی زمین سے اچک لیے جائیں گے (28:57)۔

3۔ مکہ میں جب حصول افراد کا وہ کام مکمل ہو گیا جس کو قرآن میں قطع طرف (آل عمران، 3:127) کہا گیا ہے، یعنی ان کے بہتر حصہ کو کاٹ کر نکال لینا، تو اس کے بعد آپ نے وہاں سے ہجرت کا فیصلہ فرمایا۔ ہجرت کوئی فرار نہیں تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ مدینہ جا کر وہاں کے امکانات کو استعمال کیا جائے۔ یہ تاریخی امکانات اللہ تعالیٰ نے پیشگی طور پر مدینہ میں پوری طرح جمع کر دیے تھے۔

مثلاً مدینہ کے علاقہ میں یہود کے تین قبائل (نضیر، قُریظہ، قینقاع) کی موجودگی۔ 70ء میں رومی شہنشاہ تیتس (Titus) نے فلسطین کو فتح کیا۔ اس نے یروشلم کو تباہ کر دیا۔ اس کے بعد یہودی جلاوطن ہو کر مختلف ملکوں میں چلے گئے۔ ان میں سے کچھ مدینہ بھی آئے۔ چند صدیوں میں ان کی تعداد چار ہزار سے زیادہ ہو گئی۔ ان یہودیوں کے اختلاط سے اہل مدینہ کو ایک آنے والے نجات دہندہ کا تصور ملا جو اچانک آ کر قوم کے تمام مسائل کو حل کر دے گا۔

چنانچہ ہم سیرت کی کتابوں میں پڑھتے ہیں کہ حج کے موسم میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبائل عرب سے ملنے کے لیے نکلے تو آپ کی ملاقات مدینہ کے قبیلہ خزرج کے کچھ آدمیوں سے ہوئی۔ ان کے سامنے آپ نے اسلام پیش کیا اور ان کو قرآن پڑھ کر سنایا۔ انہوں نے آپ کی بات سنی تو آپس میں کہنے لگے:

يَا قَوْمِ، تَعلّموا وَاَللّٰهِ إنَّهُ لَلنبِيُّ الَّذِي تَوَعَّدَكُمْ بِهِ يَهُودُ، فَلَا تسبقُنكم إلَيْهِ۔ فَأَجَابُوهُ فِيمَا دَعَاهُمْ إلَيْهِ (سیرت ابن ہشام، جلد 2، صفحہ 38)۔ یعنی، لوگوں سمجھ لو۔ خدا کی قسم، ضرور یہ وہی نبی ہے جس کا ذکر تم سے یہودی کیا کرتے تھے۔ دیکھو، کہیں وہ اس کی جانب تم پر سبقت نہ لے جائیں۔ پس جس چیز کی دعوت آپ نے انہیں دی اس کو انہوں نے قبول کرلیا۔

یہی معاملہ خود مدینہ کے عربوں کے سلسلہ میں ایک اور شکل میں پیش آیا۔ ہجرت سے چند سال پہلے 618ء میں مدینہ کے قبائل اوس اور خزرج میں خوں ریز جنگ ہوئی۔ ان حالات میں وہ محسوس کرنے لگے کہ انہیں ایک قومی قائد کی شدید ضرورت ہے۔ یہی بات ہے جس کو حضرت عائشہؓ نے اس طرح فرمایا:

كَانَ يَوْمُ بُعَاثَ يَوْمًا قَدَّمَهُ اللّٰهُ لِرَسُولِهِ صلى اللّٰه عليه وسلم، فَقَدِمَ رَسُولُ اللّٰهِ صلى اللّٰه عليه وسلم وَقَدِ افْتَرَقَ مَلَؤُهُمْ، وَقُتِلَتْ سَرَوَاتُهُمْ وَجُرِّحُوا، فَقَدَّمَهُ اللّٰهُ لِرَسُولِهِ صلى اللّٰه عليه وسلم فِي دُخُولِهِمْ فِي الْإِسْلَامِ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 3777)۔ یعنی، بعاث کا واقعہ ایک ایسا واقعہ تھا جو اللہ نے اپنے رسول کی خاطر تمہید کے طور پر برپا کیا۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ آئے تو ان کے سردار متفرق ہو چکے تھے۔ ان کے سربرآوردہ لوگ

مقتول اور زخمی ہو گئے تھے۔ چنانچہ اس واقعہ کو اللہ نے اپنے رسول کے لیے بطور تمہید برپا کیا جو اہل مدینہ کے لیے دخولِ اسلام میں معاون بنا۔

یہی بات انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے مقالہ نگار نے اس طرح کہی ہے کہ مدینہ کی ایک قبائلی جنگ میں بہت زیادہ خون بہا تھا جو 618ء میں ہوئی۔ اس کے بعد امن پوری طرح قائم نہیں ہو سکا تھا۔ محمدؐ کو مدینہ بلا کر وہاں کے بہت سے عرب غالباً یہ امید کر رہے تھے کہ وہ مخالف گروہوں کے درمیان ثالث کا کام کریں گے۔ اور یہود سے اہل مدینہ کے ربط نے غالباً انہیں ایک مسیحائی مذہبی قائد کو قبول کرنے کے لیے تیار کیا ہو گا جو کہ انہیں ظلم سے نجات دلائے اور ایک ایسی سلطنت بنائے جس میں انہیں انصاف مل سکے:

> Much blood had been shed in a battle at battle at about 618, and peace was not fully restored. In inviting Muhammad to Medina, many of the Arabs there probably hoped that he would act as an arbiter among the opposing parties, and their contact with the jews may have prepared them for a messianic religious leader, who would deliver them from oppression and establish a kingdom in which justice prevaild. (Encyclopaedia Britannica Vol. 12, p. 601)

4۔ پیغمبر اسلامؐ کے مشن کا ایک جزء یہ تھا کہ وہ اس دور کو دنیا سے ختم کر دیں جس کو فرانسیسی مورخ ہنری پرین نے مطلق شہنشاہیت (absolute imperialism) سے تعبیر کیا ہے۔ یہی سیاسی نظام ہے جو قدیم زمانہ میں انسانی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنا ہوا تھا۔ چنانچہ آپ کی پیدائش جزیرہ نمائے عرب میں ہوئی جو اس زمانہ کی دو عظیم ترین شہنشاہیتوں، رومی ایمپائر اور ساسانی ایمپائر کے درمیان میں واقع تھا۔

اس مقصد کے لیے آپ کا مقابلہ ان شہنشاہیتوں کے ساتھ پیش آنے والا تھا۔ چنانچہ تاریخی اعتبار سے آپ کا ظہور انتہائی موزوں وقت میں ہوا۔ یہی وہ وقت ہے جب کہ رومیوں اور ایرانیوں کے درمیان پچیس سالہ جنگ (628-603ء) پیش آئی۔ یہ دونوں اپنے زمانہ میں ناقابل تسخیر حد تک طاقت ور سلطنتیں تھیں۔مگر پیغمبر اسلام کی بعثت حیرت انگیز طور پر عین اس زمانہ میں ہوئی جب کہ دونوں سلطنتیں آپس میں لڑ کر تباہ ہو چکی تھیں۔ یہی واقعہ ہے جس کی طرف قرآن کی سورہ نمبر 30 میں اشارہ کیا گیا ہے:

غُلِبَتِ الرُّومُ ۔فِي أَدْنَى الْأَرْضِ وَهُمْ مِنْ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُونَ (30:2-3)۔یعنی، رومی مغلوب ہو گئے۔ پاس کے علاقہ میں اور وہ اپنی مغلوبیت کے بعد عنقریب غالب ہوں گے۔

پیغمبر اسلام کی پیدائش کے بعد 603ء میں ایران نے رومی سلطنت پر حملہ کر دیا۔تباہ کن جنگ کے بعد رومیوں کو شکست ہوئی۔ یہاں تک کہ 616ء میں یروشلم سمیت رومن ایمپائر کی مشرقی سلطنت کا بڑا حصہ ایرانیوں کے قبضہ میں چلا گیا۔

اس کے بعد قیصر روم کے اندر نیا حوصلہ پیدا ہوا۔ اس نے تیاری کر کے 623ء میں ایران کے اوپر جوابی حملہ کیا۔624ء میں اس نے ایران پر فیصلہ کن فتح حاصل کی۔ 627ء میں اس نے اپنے مقبوضہ علاقے دوبارہ ایرانیوں سے واپس لے لیے۔ تاہم ان دوطرفہ لڑائیوں میں دونوں عظیم سلطنتوں کی طاقت ٹوٹ گئی۔ دونوں کمزور ہو کر رہ گئیں۔

یہی وہ زمانہ ہے جب کہ پیغمبر اسلامؐ کا ظہور ہوا۔ آپ نے اور آپ کے بعد آپ کے اصحاب نے دونوں سلطنتوں سے ٹکر لی اور دونوں کو توڑ کر تاریخ میں ایک نئے دور آزادی کا آغاز کیا۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (1984) میں بازنطینی ایمپائر (Byzantium Empire) کے نام سے 26 صفحہ کا ایک مقالہ شامل ہے۔ اس کے مصنف بازنطینی تاریخ کے ایک اکسپرٹ پروفیسر نکل (Donald MacGillivray Nicol) ہیں۔ مسلم عہد کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

632ء میں پیغمبر کی وفات کے بعد خلفا نے عرب بدوؤں کی طاقت کا رخ ایک بامقصد اور منظم منصوبہ فتح کی طرف موڑ دیا۔ نتیجہ نہایت شاندار نکلا۔ 636ء میں بازنطینی فوج کو دریائے یرموک کے کنارے ایک جنگ میں شکست ہوئی۔ اس کے بعد فلسطین اور شام کا دروازہ عربوں کے لیے کھل گیا۔ اسکندریہ نے 642ء میں ہتھیار ڈال دیا اور پھر ہمیشہ کے لیے مصر کا صوبہ بازنطینیوں کے اقتدار سے نکل گیا۔ اسی درمیان عربوں نے میسوپوٹامیا کے علاقہ میں پیش قدمی کی اور جلد ہی ایرانی فوج کو شکست دے کر ان کی راجدھانی کو فتح کرلیا۔ اس طرح ایرانی شہنشاہیت کی لمبی تاریخ ختم ہوگئی۔

اس وقت کی بازنطینی سلطنت اور ایرانی سلطنت کے کم از کم تین پہلوؤں نے عربوں کے لیے اس شاندار کامیابی کو آسان بنا دیا، جس کی وجہ سے انہوں نے اپنے دشمنوں پر فتح حاصل کی۔ اول، دونوں سلطنتیں جنگوں کے نتیجہ میں بالکل ختم ہوچکی تھیں اور 632ء سے پہلے انہوں نے اپنی فوجوں کو گھٹا دیا تھا۔ دوم، دونوں ہی سلطنتیں عرب سرحد پر اپنی ماتحت حکومتوں کی مدد بند کرچکی تھیں جنہوں نے پچھلی ایک صدی سے صحرائی بدوؤں کو آگے بڑھنے سے روک رکھا تھا۔ سوم، اور خاص طور پر بازنطینیوں کے معاملہ میں مذہبی اختلافات جنہوں نے شامیوں اور مصریوں کی قسطنطنیہ کے ساتھ وفاداری کو کمزور کردیا تھا:

At least three aspects of the contemporary situation of Byzantium and Persia account for the phenomenal

ease with which the Arabs overcame their enemies: first, both empires, exhausted by wars, had demobilized before 632; second, both had ceased to support those client states on the frontiers of the Arabian Peninsula that had restrained the Bedouin of the desert for a century past; third, and particularly in reference to Byzantium. religious controversy had weakened the loyalties that Syrians and Egyptians rendered to Constantinople. (*Encyclopedia Britannica* Vol. 3, p. 557)

5۔موسموں کی تبدیلی کا تعلق سورج کے گرد زمین کی گردش پر ہے۔شمسی کیلنڈر اسی کی بنیاد پر بنایا گیا ہے۔ چنانچہ شمسی کیلنڈر میں ہر موسم ہمیشہ ایک ہی مہینہ میں آتا ہے۔مثلاً دسمبر میں ہمیشہ سردی اور جون میں ہمیشہ گرمی۔مگر قمری کیلنڈر، جس کا سال شمسی سال سے گیارہ دن کم ہوتا ہے، وہ قمری مہینوں کی بنیاد پر بنایا گیا ہے۔اس لیے قمری کیلنڈر میں مہینے ہمیشہ موسم کے مطابق نہیں ہوتے۔مثلاً رمضان کا مہینہ کبھی جاڑے کے موسم میں آتا ہے اور کبھی گرمی کے موسم میں۔

حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ نے جب اللہ کے حکم سے کعبہ کی تعمیر کی اور حج کا نظام قائم کیا تو انہوں نے اس کا نظام قمری کیلنڈر کی بنیاد پر بنایا تھا۔یعنی یہ کہ حج کی عبادت ذی الحجہ کے مہینہ میں ادا کی جائے۔قدیم زمانہ میں مکہ کا قبیلہ قریش کعبہ کا متولی تھا۔ان کی معاشیات کا سب سے بڑا ذریعہ کعبہ کا حج تھا۔عرب کے تمام قبائل ہر سال حج وزیارت کے لیے مکہ آتے۔وہ اس پر چڑھاوے چڑھاتے۔اس کے علاوہ ان کے آنے سے مکہ کو تجارت کو فروغ حاصل ہوتا، جس طرح سیاح آج کل جس ملک میں بڑی تعداد میں آتے ہیں، وہاں کی تجارت کو ان سے فروغ حاصل ہوتا ہے۔

قریش نے دیکھا کہ ذی الحجہ کا مہینہ جب معتدل موسم میں پڑتا ہے تو زائرین کے قافلے زیادہ بڑی تعداد میں مکہ آتے ہیں۔ اور جب ذی الحجہ کا مہینہ سخت موسم میں پڑتا ہے تو زائرین کی تعداد کافی کم ہو جاتی ہے۔ اس تجربہ کے بعد قریش نے حج کے نظام کو بدل دیا۔ انہوں نے اس کو قمری کیلنڈر سے ہٹا کر شمسی کیلنڈر کی بنیاد پر قائم کر دیا۔ تاکہ حج کی تاریخ کو ہمیشہ معتدل اور موافق موسم میں انجام دیں اور اس طرح اپنے تجارتی مفاد کو بلا روک ٹوک حاصل کر سکیں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کا ایک جزء یہ بھی تھا کہ آپ حج کی عبادت کو دوبارہ ابراہیمی طریقہ پر قائم کر دیں۔ اس تبدیلی کا اعلان آپ فتح مکہ (8ھ) کے موقع پر کر سکتے تھے۔ مگر آپ نے ایسا نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اجتماعی اصلاح کے سلسلہ میں آپ کی ایک مستقل سنت یہ تھی کہ روایات کو توڑے بغیر ان کو نافذ کیا جائے۔ اگر آپ فتح مکہ کے دن اس کا اعلان فرماتے تو ایسی کارروائی روایات کو توڑے بغیر نہیں ہو سکتی تھی۔

اصل یہ ہے کہ قمری کیلنڈر چونکہ شمسی سال سے گیارہ دن کم ہوتا ہے۔ اس لیے 33 سال کی گردش کے بعد دونوں ایک دوسرے کے برابر ہو جاتے ہیں۔ مثلاً رمضان کا مہینہ اس سال اگر فروری میں پڑے تو 33 سال کے بعد دوبارہ وہ فروری کے مہینہ میں آجائے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے دو مہینہ پہلے یہ 33 سالہ دور پورا ہونے والا تھا۔ اور دوبارہ حج کا موسم ذی الحجہ کے مہینہ میں آنے والا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے بعد نہ تو حج کے نظام میں تبدیلی کا اعلان فرمایا اور نہ اس کے بعد آنے والے حج میں آپ نے شرکت کی۔ آپ نے 10ھ میں پہلا حج کیا جس کو عام طور پر حجۃ الوداع کہا جاتا ہے۔ اس سال کا حج اپنے آپ خود گردش کے نظام کے نتیجہ میں ذی الحجہ میں پڑنے والا تھا۔ چنانچہ آپ نے اپنی وفات سے تقریباً دو ماہ پہلے مکہ

جا کر حج ادا فرمایا۔ اس حج میں آپ نے جو خطبہ دیا، اس میں آپ نے اعلان کر دیا اور فرمایا کہ اے لوگو، زمانہ گھوم گیا۔ پس آج کے دن وہ اپنی اس ہیئت پر ہے جس دن کہ اللہ نے زمین و آسمان کو پیدا کیا تھا (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: حقیقت حج، صفحہ 32-28)۔

یعنی 33 سالہ دور کو پورا کر کے اب حج کا موسم دوبارہ ذی الحجہ کے مہینہ میں پڑ رہا ہے۔ یہی نظام مشیت خداوندی کے مطابق ہے۔ اب قریش کا جاری کردہ نظام ختم کیا جاتا ہے۔ آئندہ ہمیشہ کے لیے قمری کیلنڈر کے مطابق، ذی الحجہ کے مہینہ میں حج ادا کیا جائے گا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہ تھا کہ روایات کو توڑے بغیر اصلاحات کرنا۔ اسی لیے آپ نے حج کی تاریخوں میں اصلاح فرمائی مگر یہ کام آپ نے روایات کو توڑے بغیر انجام دیا۔ یہ بے حد حیرت انگیز بات ہے کہ آپ کی پیدائش اور آپ کی وفات انتہائی موزوں وقت میں ہوئی۔ ایک طرف مذکورہ 33 سالہ دور پورا ہوا، اور دوسری طرف آپ اپنی مدت حیات پوری کر کے اس مخصوص مہینہ اور سال میں پہنچ گئے جب کہ آپ روایت شکنی کے بغیر فطری انداز میں حج کے نظام کی اصلاح کر سکیں۔ یہاں واضح طور پر آپ کی پیدائش اور آپ کی وفات کے وقت کی تعیین میں اس برتر خالق کا ہاتھ کام کرتا ہوا نظر آتا ہے جو تخلیق کے پورے نظام کو کنٹرول کر رہا ہے۔ آپ کی عمر اور خارجی زمانہ میں اگر یہ مطابقت نہ ہوتی تو آپ اتنی صحت کے ساتھ اپنے مشن کو پورا نہیں کر سکتے تھے یہ واقعہ بھی: اللّٰهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ (6:124) کی ایک ایمان افروز مثال ہے، یعنی، اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ اپنی پیغمبری کس کو بخشے۔

پیغمبر اسلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن میں یہ بھی تھا کہ آپ حج کی سالانہ عبادت میں اس طرح اصلاح کریں کہ وہ شمسی کیلنڈر سے ہٹ کر قمری کیلنڈر پر آجائے۔ اور اس عمل کے درمیان روایات کو بھی توڑنا نہ پڑے۔ یہ ایک ایسا کام تھا جو محدود عمر کے ایک

انسان کی استطاعت سے باہر تھا۔ اس انقلابی تبدیلی کو قائم کرنے کے لیے ضروری تھا کہ مصلح کی پیدائش بالکل حسابی انداز میں ایسے زمانہ میں ہو جب کہ کائنات کا آفاقی نظام بھی اس کی مدت حیات کے ساتھ مساعدت کر رہا ہو۔ صرف خداوند عالم ہی اس پر قادر ہوسکتا تھا۔ اور پیغمبر اسلام کی زندگی میں ان آفاقی اسباب کا جمع ہونا یہ ثابت کرتا ہے کہ آپ خداوند عالم کے فرستادہ تھے۔

6۔ دنیا کے تمام انقلابات، خالص نظریاتی اعتبار سے، ناکام انقلابات ہیں۔ کیونکہ کوئی بھی انقلاب اپنے نظریاتی معیار والا نظام نہ بنا سکا۔ تمام انقلابات صرف ارباب حکومت کی تبدیلی کے ہم معنی ہیں۔ اس کا آغاز خوش نما نظریات کی تبلیغ سے ہوا۔ مگر جب عملی انقلاب کی نوبت آئی تو ان کا نتیجہ اس کے سوا کچھ اور نہ تھا کہ ایک گروہ کی سیاسی حکمرانی ختم ہو کر دوسرے گروہ کی سیاسی حکمرانی قائم ہوگئی۔ انقلابات کی تاریخ میں اسلامی انقلاب واحد انقلاب ہے جس میں عین اس کے نظریہ کے مطابق، ایک مثالی معاشرہ بنا اور ایک مثالی سماج قائم ہوا۔

اس فرق کا بنیادی سبب یہ ہے کہ بقیہ تمام انقلابات دوسری اور تیسری نسل میں مکمل ہوئے۔ جب کہ اسلامی انقلاب اپنی پہلی ہی نسل میں عملی تکمیل کے مرحلہ تک پہنچ گیا۔ کسی نظریاتی تحریک کی جو پہلی نسل ہوتی ہے اس کے افراد کے لیے وہ نظریہ ذاتی دریافت ہوتا ہے۔ ان کے اندر اس نظریہ کے حق میں کامل اخلاص موجود رہتا ہے۔ جب کہ دوسری اور تیسری نسل تک پہنچ کر نظریہ صرف ایک قسم کا رسمی عقیدہ بن کر رہ جاتا ہے۔ زندگی میں قوت محرکہ کے اعتبار سے وہ اپنی حیثیت کھو دیتا ہے۔

ڈیموکریسی (جمہوریت) کا نظریہ سترھویں صدی کے کچھ یورپی مفکرین نے پیش کیا۔ مگر عملی صورت میں ڈیموکریسی اٹھارویں صدی کے آخر میں قائم ہوئی۔ 1776ء میں

امریکہ میں اور 1789ء میں فرانس میں۔ اس طرح ڈیموکریسی اپنی پہلی نسل میں صرف نظریہ کے درجہ میں باقی رہی۔ وہ اپنی تیسری نسل میں پہنچ کر عملی واقعہ بن سکی۔ جب کہ اس کے ابتدائی نظریہ ساز ختم ہو چکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈیموکریسی کے نام پر آنے والے انقلابات ڈیموکریسی کا حقیقی عملی نمونہ نہ بن سکے۔

اسی طرح کمیونزم کا نظریہ انیسویں صدی میں ابھرا۔ مگر اس کا عملی نفاذ بیسویں صدی میں کمیونسٹوں کی دوسری اور تیسری نسل میں ہوا۔ پہلی نسل کے افراد کے لیے اس کو عملی روپ دینا ممکن نہ ہو سکا۔ چنانچہ حکمرانوں کی تبدیلی کے معنی میں تو کمیونزم نافذ ہو گیا۔ مگر اس کا نظریاتی معیار کبھی اور کسی ملک میں واقعہ نہیں بنا۔

اس کے برعکس، اسلام کا نظریہ پہلی ہی نسل (محمد صلی اللہ علیہ وسلم، ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما) کے زمانہ میں اپنی آخری تکمیل تک پہنچ گیا۔ اگر مثال کے طور پر ایسا ہوتا کہ عرب کی فتح بنوامیہ کی خلافت کے زمانہ میں ہوتی اور ایران و روم کی فتوحات بنوعباس کی خلافت کے زمانہ میں انجام پاتیں تو ناممکن تھا کہ اسلام کی تاریخ میں حیات انسانی کا وہ مثالی ماڈل موجود ہو جو اسلام کے پہلے دور میں بنا اور جو عام انسانوں کے لیے دائمی طور پر مشعل راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیوں کہ اگلی نسل تک پہنچتے پہنچتے اسلام کی اصل اسپرٹ لوگوں میں کافی کمزور ہو چکی تھی۔

کیا وجہ ہے کہ دوسرے انقلابات کی تکمیل کئی نسلیں گزرنے کے بعد ہوئی۔ مگر اسلامی انقلاب پہلی ہی نسل میں مکمل ہو گیا۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ دوسرے نظریات کو پہلی نسل میں بڑی تعداد میں مردان کار حاصل نہ ہو سکے۔ جب کہ اسلامی نظریہ کو پہلی ہی نسل میں مردان کار کی ایک طاقت ور ٹیم مل گئی جس نے غیر معمولی جدوجہد اور قربانی کے ذریعہ پہلی ہی نسل میں اس کو تکمیل کے آخری مرحلہ تک پہنچا دیا۔

اوپر جو آیت ہم نے نقل کی ہے کہ اللہ کو معلوم ہے کہ وہ اپنی پیغمبری کو کہاں رکھے (الانعام، 6:124)۔ اسی کا ایک پہلو یہ تھا کہ پیغمبر کی جائے پیدائش اور مقام عمل کے لیے اس جگہ کا انتخاب کیا جائے جہاں اس کو پہلے ہی مرحلہ میں اعلیٰ صلاحیت کے مردان کار مل سکیں۔ ظہور محمدی کے زمانہ کو دیکھیے تو بظاہر عرب کا ملک اس مقصد کے لیے سب سے زیادہ غیر اہم نظر آتا ہے۔ اس وقت عربوں کی تصویر دنیا کی نظر میں کیا تھی، اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ فردوسی اپنے شاہنامہ میں ان کے بارے میں لکھتا ہے کہ اے آسمان تجھ پر افسوس ہے کہ اونٹ کا دودھ پینے والے اور گوہ کا گوشت کھانے والے عربوں کا معاملہ اب یہاں تک پہنچا ہے کہ وہ ایرانی تخت کی آرزو کر رہے ہیں:

زشیر شتر خوردن و سوسمار — عرب را بجائے رسید است کار

کہ تخت کیاں را کنند آرزو — تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

اس وقت صرف خدا ہی جان سکتا تھا کہ اس بظاہر غیر اہم قبائلی مجموعہ کے اندر ایک عظیم قوم بننے کے امکانات چھپے ہوئے ہیں۔ مارگولیتھ نے عربوں کو ہیروؤں کی ایک قوم (a nation of heroes) کہا ہے۔ مگر یہ اعتراف واقعہ کے ظہور میں آنے کے بعد کا ہے۔ ظہور واقعہ سے پہلے صرف خدا ہی یہ جان سکتا تھا کہ عرب قوم کے اندر کیا امکانی اوصاف چھپے ہوئے ہیں۔

ان عربوں میں دوسری غیر معمولی صفات کے ساتھ ایک انوکھی صفت یہ تھی کہ وہ ہر قسم کے تعصب سے خالی تھے۔ ان کے مزاج میں یہ چیز رچی بسی ہوئی تھی کہ وہ حق کا فوراً اعتراف کر لیں۔ ان کی اسی صلاحیت کی بنا پر یہ ممکن ہوا کہ پیغمبر کی زندگی ہی میں ایک لاکھ سے زیادہ آدمی آپ پر ایمان لا کر آپ کے ساتھی بن گئے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو عرب میں مبعوث کرنا کوئی سادہ بات نہیں تھی۔ یہ ایک انتہائی اعلیٰ منصوبہ بندی کا معاملہ تھا۔ اس میں منصوبہ ساز کو یہ جاننا تھا کہ ساری دنیا میں وہ کون سا مخصوص مقام ہے جو پیغمبر اسلام کو اپنا کام شروع کرنے کے لیے موزوں ترین ہے۔

نہ صرف پیغمبروں کی تاریخ بلکہ کوئی تخلیقی نظریہ پیش کرنے والے ہر آدمی کی تاریخ بتاتی ہے کہ معاصر زمانہ میں بہت کم لوگ ہوتے ہیں جو اس کے پیغام کو گہرائی کے ساتھ سمجھیں اور اس کے زمانہ ہی میں اس کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو جائیں۔ عرب جیسی قوم میں مبعوث کرنے ہی کی وجہ سے یہ ممکن ہوا کہ اپنی زندگی ہی میں پیغمبر اسلام کو کثیر تعداد میں ایسے ساتھی مل گئے جو مطلوبہ انقلاب کے لیے جہاد عظیم کر سکیں۔

یہ واقعہ اتنا اہم اور اتنا زیادہ استثنائی تھا کہ بائبل میں اس کے بارے میں پیشگی خبر دے دی گئی۔ بائبل (کتاب استثنا) میں ہے کہ مرد خدا موسیٰ نے جو دعائے خیر دے کر اپنی وفات سے پہلے بنی اسرائیل کو برکت دی وہ یہ ہے کہ —اور اس نے کہا: خداوند سینا سے آیا۔ اور شعیر سے ان پر آشکارا ہوا۔ وہ کوہ فاران سے جلوہ گر ہوا۔ وہ دس ہزار قدسیوں کے ساتھ آیا:

> And he came with ten thousands of saints. (Deuteronomy 33:2)

بائبل کی اس آیت میں سینا سے آنے والے حضرت موسیٰ ہیں۔ شعیر سے آنے والے حضرت مسیح ہیں اور فاران سے آنے والے سے مراد پیغمبر اسلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ ان کے ساتھ یہ انوکھا واقعہ پیش آیا کہ وہ آغاز نبوت کے صرف 20 سال بعد دس ہزار صحابہ کے ساتھ فاتحانہ طور پر مکہ میں داخل ہوئے:

> He received his prophetic call in about 610, and in january 630 he entered Mecca with 10,000 men. (*Encyclopedia Britannica*, Vol. 7, p. 84)

سیرت کی رہنمائی

ڈاکٹر مائیکل ہارٹ (پیدائش 1932) نے پیغمبر اسلامؐ کو تاریخ کا سپریملی سَکسِس فل انسان بتایا ہے۔ مگر آپ کی حیثیت ایک ہیرو کی نہیں تھی بلکہ ایک رہنما کی تھی۔ اس اعتبار سے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ آپ نے دراصل اپنی زندگی سے ہر زمانہ کے انسان کو سپریم سَکسِس (supreme success) کا راز بتایا ہے۔ آپ اگر ایک طرف اعلیٰ ترین کامیاب انسان تھے تو دوسری طرف آپ کی زندگی حصول کامیابی کے لیے اعلیٰ ترین معیار (super model) کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس مضمون میں اسی حیثیت سے آپ کی سیرت کا مختصر مطالعہ کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

ممکن سے آغاز

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تو اس وقت عرب میں مختلف مسائل تھے— کعبہ میں 360 بت رکھے ہوئے تھے۔ رومن ایمپائر اور ساسانی ایمپائر نے عرب میں سیاسی نفوذ حاصل کر رکھا تھا۔ معاشرہ میں سود، زنا، شراب خوری جیسے جرائم پھیلے ہوئے تھے۔ مگر قرآن میں آپ کے اوپر پہلا حکم اترا تو وہ یہ نہیں تھا کہ (طَهِّرِ الْكَعْبَةَ مِنَ الْأَصْنَامِ يَا قَاتِلَ الْفُرْسِ وَالرُّومَانِ، يَا نَافِذَ حدُود اللّٰهِ عَلَى الْمُجْرِمِينَ)۔ اس کے برعکس، آپ کے اوپر پہلا حکم جو اتارا گیا وہ قرأت اور تعلیم کے بارے میں تھا:

اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ۔ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۔ اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ ۔ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۔ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ (96:1-5)۔ یعنی، پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔ پیدا کیا انسان کو علق سے۔ پڑھ اور

تیرا رب بڑا کریم ہے۔ جس نے علم سکھایا قلم سے۔ انسان کو وہ کچھ سکھایا
جو وہ جانتا نہ تھا۔

اس سے معلوم ہوا کہ اسلامی عمل (Islamic activism) کا صحیح نقطہ آغاز یہ ہے کہ ممکن سے آغاز کیا جائے۔ بعثت کے وقت جو حالات تھے اس کے اعتبار سے تطہیر مسجد، سیاسی استقلال، اور تنفیذ حدود کا کام، مطلوب ہونے کے باوجود، عملی طور پر ممکن نہ تھا۔ البتہ تعلیم اور دعوت سے آغاز کرنا پوری طرح دائرہ امکان میں تھا۔ آپ نے، اللہ تعالیٰ کی رہنمائی میں ناممکن کو چھوڑ کر ممکن سے عمل اسلامی کا آغاز کیا۔ انگریزی کا مقولہ ہے کہ سیاست ممکن کا فن ہے (politics is the art of possible) میں کہوں گا کہ عمل اسلامی کا پیغمبرانہ طریقہ یہ ہے کہ ممکن سے آغاز کیا جائے:

Prophetic way of beginning is to begin from the possible.

عسر میں یسر

پیغمبر اسلام اور آپ کے ابتدائی اصحاب نے مکہ میں توحید کی دعوت دینا شروع کیا تو وہاں کے لوگوں کی طرف سے سخت ردعمل پیش آیا۔ بظاہر ایسا معلوم ہونے لگا کہ مکہ کی سرزمین اسلام کے لیے صرف مشکلات ومصائب کی سرزمین ہے۔ اس وقت قرآن میں یہ رہنما آیت اتری کہ پس مشکل کے ساتھ آسانی ہے، مشکل کے ساتھ آسانی ہے: فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْراً. إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْراً (94:5-6)۔

اس سے پیغمبر کے فاتحانہ طریقہ کار کا ایک اہم پہلو سامنے آتا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس دنیا کے لیے خدا کا قانون یہ ہے کہ وہ کبھی بھی صرف مشکلوں کی آماجگاہ نہ بنے۔ یہاں ہمیشہ مشکل کے ساتھ عین اسی وقت آسانی بھی ضرور پائی جائے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ

جہاں بظاہر ڈس ایڈ وانٹج ہو وہیں عین اسی کے ساتھ ایڈ وانٹج کی صورتیں بھی ضرور موجود ہو۔

'عسر میں یسر' کی مثال یہ ہے کہ مکہ میں اگر ابوجہل جیسے منکر تھے تو وہیں عمر جیسے اعتراف کرنے والے بھی موجود تھے۔ اس وقت اگر کعبہ سے بتوں کو نکالنا مشکل تھا تو عین اسی وقت یہ ممکن تھا کہ لوگوں کے دلوں سے غیر اللہ کی پرستش کا جذبہ نکالا جائے۔ اسی طرح دور اول میں اہل اسلام کو عرب میں جو مشکلیں پیش آئیں وہ چیلنج بن کر اہل اسلام کی صلاحیتوں کو جگانے کا سبب بن گئیں۔ یہاں تک کہ، مارگولیتھ کے الفاظ میں ان میں کا ایک ایک شخص ہیرو بن گیا۔

سیرت کا کام یہ پہلو بتاتا ہے کہ اہل اسلام جب اپنے آپ کو مسائل کے درمیان پائیں تو ان کو پیشگی طور پر یقین کرنا چاہیے کہ یہاں عین مسائل کے ساتھ ہی مواقع بھی موجود ہیں۔ ان کو چاہیے کہ مسائل کے خلاف فریاد کرنے کے بجائے مواقع کو دریافت کریں اور ان کو استعمال کرکے اپنی تاریخ کو آگے بڑھائیں۔

ہجرت: مقام عمل کی تبدیلی

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات مکہ میں سخت سے سخت تر ہوتے چلے گئے، یہاں تک کہ وہاں کے مخالفین آپ کے قتل پر آمادہ ہوگئے۔ اس وقت آپ نے ٹکراؤ کا طریقہ اختیار نہیں کیا بلکہ مکہ کو چھوڑ کر مدینہ چلے گئے جس کو ہجرت کہا جاتا ہے۔

یہ ہجرت سادہ طور پر ترکِ وطن نہ تھی۔ یہ دراصل ایک اسٹریٹجی کا معاملہ تھا۔ اس کو ایک لفظ میں مقام عمل کی تبدیلی کہا جا سکتا ہے۔ آپ نے جب مکہ کو ایک ناموافق مقام پایا تو آپ نے مدینہ کو اپنا مرکز بنالیا تاکہ وہاں سے اپنا مشن جاری رکھ سکیں۔

اس سے یہ اصول ملتا ہے کہ ایک جگہ کے لوگ اگر ضد اور مخالفت کی آخری حد پر

آجائیں تو یہ صحیح نہ ہوگا کہ اہل اسلام وہیں ان سے لڑ کر ہلاک ہوجائیں۔ بلکہ انہیں دوسری مناسب جگہ تلاش کر کے وہاں اپنا اسلامی عمل جاری کردینا چاہیے۔ یہ طریقہ ایک طرف اصل مشن کے زندہ رہنے کی ضمانت ہے، دوسری طرف اس میں یہ امکان بھی چھپا ہوا ہے کہ 'مدینہ' میں استحکام حاصل کرنے کے بعد 'مکہ' بھی آخر کار قبضہ میں آجائے۔

فطرت پر اعتماد

پیغمبر اسلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کو بار بار یہ تجربہ ہو رہا تھا کہ لوگ آپ کے ساتھ برے طریقے سے پیش آتے ہیں۔ اشتعال انگیز کلمات کہنا، پتھر مارنا، راستہ میں رکاوٹ ڈالنا، وغیرہ۔ اس وقت قرآن میں حکم دیا گیا کہ: تم برائی کا جواب بھلائی سے دو۔ پھر تم دیکھو گے کہ جو تمہارا دشمن تھا وہ تمہارا قریبی دوست بن گیا ہے۔(41:34)

اس ہدایت میں ایک اہم حقیقت بتائی گئی ہے وہ یہ کہ کوئی انسان بظاہر مخالف اور دشمن کیوں نہ ہو اس کے اندر خدا کی پیدا کی ہوئی فطرت بہر حال موجود رہتی ہے۔

فطرت ہمیشہ حق پسند ہوتی ہے۔ اس طرح گویا ہر ظاہری دشمن کے اندر تمہارا ایک مخفی دوست موجود رہتا ہے۔ اگر تم حق کے داعی ہو تو پیشگی طور پر یہ یقین کرلو کہ تمہاری دعوت کا ایک مثنیٰ (counterpart) یقینا فریق ثانی کے سینہ میں موجود ہوگا۔

مخالف انسان کے اندر اس موافق انسان کو پانے کی یقینی تدبیر یہ ہے کہ تم اس کے برے سلوک کے جواب میں اپنی طرف سے اچھا سلوک کرو۔ تمہارا اچھا سلوک اس کے ظاہری پردے کو ہٹا دے گا۔ اور پھر اندر سے تمہارا ایک دوست انسان نکل آئے گا۔ یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ دور اول میں ہزاروں لوگ صرف اسی اصول پر عمل کرنے کے نتیجہ

میں اسلام میں داخل ہوئے۔ مثلاً ایک مشرک نے آپ کو تنہا پا کر آپ کے اوپر تلوار اٹھائی۔ مگر اس پر قابو پانے کے بعد آپ نے اس کو معاف کر دیا (المعجم الاوسط للطبرانی، حدیث نمبر 9112)۔ اسی وقت اس نے اسلام قبول کرلیا، وغیرہ۔ دورِ اول میں اس طرح کے واقعات کثرت سے پیش آئے جن کو تاریخ کی کتابوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔

دشمن کو استعمال کرنا

بدر کی جنگ کے بعد مخالف فوج کے ستر آدمی گرفتار ہو کر مدینہ آئے۔ یہ سب مکہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اور وہ پڑھے لکھے لوگ تھے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا کہ ان جنگی مجرموں میں سے جو شخص مدینہ کے دس بچوں کو پڑھا دے گا وہ اس کا فدیہ ہوگا۔ اور اس کے بعد ہم اس کو رہا کر دیں گے (مسند احمد، حدیث نمبر 2216)۔ یہ اسلام کی تاریخ میں پہلا اسکول تھا جو اس طرح قائم کیا گیا کہ اس کے طلبہ تو سب مسلمان تھے۔ مگر اس کے ٹیچر سب کے سب دشمن قوم سے تعلق رکھتے تھے۔

امن کی طاقت

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا ایک اہم سبق یہ ہے کہ امن کی طاقت تشدد کی طاقت سے زیادہ ہے۔ آپ نے اپنی پوری زندگی میں سب سے زیادہ جس طاقت کو استعمال کیا وہ یہی امن کی طاقت ہے۔ مثال کے طور پر جب مکہ فتح ہوا تو مکہ کے وہ مخالفین آپ کے پاس لائے گئے جنہوں نے آپ کو ستایا تھا، جنہوں نے آپ کو مکہ سے نکالا تھا۔ جنہوں نے آپ کے خلاف جنگی کارروائی کی تھی۔ اور آپ کو طرح طرح کی ایذائیں پہنچائی تھیں۔

یہ لوگ ثابت شدہ طور پر جنگی مجرم تھے۔ اور جنگی مجرم کے لیے یہ عام رواج تھا کہ فاتح

اس کو قتل کر دیتا تھا۔ مگر پیغمبر اسلام نے ان کو ملامت کا کلمہ تک نہیں کہا۔ آپ نے سادہ طور پر اعلان فرمایا کہ جاؤ تم سب لوگ آزاد ہو: اذْهَبُوا فَأَنْتُمْ الطُّلَقَاءُ (سیرت ابن ہشام، جلد 2، صفحہ 412)۔

یہ تشدد کے بجائے امن کی طاقت کو استعمال کرنا تھا۔ یہ جسمانی تسخیر کے بجائے ضمیر اور قلب کو متاثر کر کے آدمی کو اپنے قابو میں لینا تھا۔ اس اعلیٰ اخلاقی روش کا نتیجہ، راوی کے الفاظ میں یہ ہوا کہ وہ لوگ حرم سے باہر اس طرح نکلے گویا کہ وہ قبروں سے نکلے ہوں۔ اور پھر وہ اسلام میں داخل ہو گئے: فَخَرَجُوا كَأَنَّمَا نُشِرُوا مِنَ الْقُبُورِ فَدَخَلُوا فِي الْإِسْلَامِ (السنن الکبریٰ للبیہقی، حدیث نمبر 18275)۔

تھرڈ آپشن

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری زمانہ میں مسلمانوں اور رومیوں کے درمیان موجودہ اردن میں ایک جنگ پیش آئی جس کو غزوۂ موتہ کہا جاتا ہے۔ اس جنگ میں چند دن کے اندر بارہ اصحاب شہید ہو گئے۔ اس کے بعد خالد بن الولید کو اسلامی لشکر کا سردار بنایا گیا۔ انہوں نے اندازہ کیا تو معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی تعداد تین ہزار ہے اور رومیوں کی تعداد دو لاکھ ہے۔ یہ فرق ناقابل عبور حد تک غیر متناسب (out of proportion) تھا۔ چنانچہ خالد بن الولید نے مقابلہ کے میدان سے ہٹ کر واپسی کا فیصلہ کیا۔

یہ لوگ جب واپس ہو کر مدینہ پہنچے تو مدینہ کے کچھ لوگوں نے ان کا استقبال یا فُرَّارُ (اے بھاگنے والو) کہہ کر کیا۔ اس وقت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لَيْسُوا بِالْفُرَّارِ، وَلَكِنَّهُمْ الْكُرَّارُ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ تَعَالَى (سیرت ابن ہشام، جلد 2، صفحہ 382)۔ وہ بھاگنے والے نہیں ہیں بلکہ دوبارہ اقدام کرنے والے ہیں۔

مدینہ کے مذکورہ مسلمان دراصل ثنائی طرزفکر(dichotomous thinking) میں مبتلا تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ان کے لیے صرف دو میں سے ایک کا آپشن (انتخاب) ہے۔ پہلا آپشن یہ کہ دشمن سے بہادرانہ طور پر لڑا جائے۔ اور دوسرا آپشن یہ کہ ہمت ہار کر بزدلانہ پسپائی اختیار کی جائے۔ چونکہ دوسرا آپشن غیر محمود تھا اس لیے ان کا خیال تھا کہ مسلم لشکر کو پہلے آپشن پر ہی قائم رہنا چاہیے تھا خواہ ان کا ایک ایک شخص لڑتے لڑتے اپنی جان دے دے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر رہنمائی دیتے ہوئے کہا کہ یہاں ایک تیسرا آپشن بھی ہے۔ اور وہ یہ کہ مقابلہ کے میدان سے ہٹ کر مزید تیاری کی جائے تا کہ آئندہ زیادہ موثر انداز میں اقدام کیا جا سکے۔ خالد بن الولید کی موتہ سے واپسی فرار کی طرف واپسی نہیں تھی بلکہ وہ اسی تھرڈ آپشن کی طرف واپسی تھی۔ چنانچہ تاریخ بتاتی ہے کہ مسلم جماعت نے تین سال بعد مزید تیاری کے ساتھ اسامہ ابن زید کی سرداری میں دوبارہ رومی سرحد کی طرف اقدام کیا اور شاندار کامیابی حاصل کی۔

میدان عمل کی تبدیلی

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ چلے آئے۔ مگر مکہ کے سردار اب بھی خاموش نہیں ہوئے۔ انھوں نے آپ کے خلاف باقاعدہ جنگ چھیڑ دی۔ کئی بار دونوں طرف کی فوجوں میں ٹکراؤ ہوا۔ مگر جنگ کے ذریعہ آخری فیصلہ نہ ہو سکا۔

اس کے بعد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مکہ سے وہ معاہدہ کر لیا جو صلح حدیبیہ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ دراصل دونوں فریقوں کے درمیان دس سال کا ناجنگ معاہدہ تھا۔ اس معاہدہ کے ذریعہ آپ نے فریق ثانی کے ساتھ میدان مقابلہ کو بدل دیا۔ اب تک

دونوں کا مقابلہ جنگ کے میدان میں پیش آ رہا تھا۔ اب دونوں کا مقابلہ نظریاتی میدان میں منتقل ہو گیا۔ اس معاہدہ کے بعد دونوں فریقوں کے درمیان بڑے پیمانہ پر ملنا جلنا شروع ہو گیا۔ اس اختلاط کے دوران اسلام کی نظریاتی برتری اپنے آپ ثابت ہونے لگی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بڑی تعداد میں لوگ متاثر ہو کر اسلام میں داخل ہونے لگے۔ اہل اسلام کی تعداد مسلسل بڑھ رہی تھی اور فریق ثانی کی تعداد مسلسل گھٹ رہی تھی۔ یہاں تک کہ مزید جنگ کے بغیر محض عوامی طاقت سے اہل اسلام غالب آ گئے۔

اس سنتِ رسولؐ کا مطلب یہ ہے کہ حریف سے ایک میدان میں مقابلہ اگر موثر نہ ہو رہا ہو تو مقابلہ کے میدان کو بدل کر اس کو اپنے موافق میدان میں لایا جائے جہاں اہل اسلام اپنی کوششوں کو زیادہ موثر بنا سکیں۔

تدریج کا اصول

صحیح البخاری میں عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ قرآن جب اترنا شروع ہوا تو اس میں سب سے پہلے وہ آیتیں اتاری گئیں جن میں جنت اور جہنم کا ذکر تھا۔ اس طرح (تقریباً 15 سال بعد) جب لوگوں کے دل نرم ہو گئے تو اس کے بعد قرآن میں یہ حکم اترا کہ زنا چھوڑ دو اور شراب چھوڑو۔ اس کے بعد وہ کہتی ہیں کہ اگر قرآن میں یہ احکام شروع ہی میں اتار دیے جاتے تو عرب کہتے کہ ہم تو کبھی زنا نہیں چھوڑیں گے، ہم تو کبھی شراب نہیں چھوڑیں گے: لَا نَدَعُ الزِّنَا أَبَدًا ... وَلَا نَدَعُ الْخَمْرَ أَبَدًا (صحیح البخاری، حدیث نمبر 4993)۔

اس سے معلوم ہوا کہ اسلامی شریعت کا نفاذ ہمیشہ ترتیب و تدریج کے اصول پر کیا جاتا ہے۔ یعنی پہلے لوگوں کے دلوں میں اس کی آمادگی پیدا کی جاتی ہے۔ اس کے بعد عملی طور پر

اس کا نفاذ کیا جاتا ہے۔ کوڑے اور بندوق کے زور پر کبھی شریعت کا نفاذ ممکن نہیں ہوتا۔ اگر کوئی شخص ایک غیر تیار شدہ معاشرہ میں محض طاقت کے زور پر شریعت کے احکام کو نافذ کرنا چاہے تو یہ سنت رسولؐ کے خلاف ہوگا۔ اور سنت رسولؐ کی خلاف ورزی کر کے کوئی کامیابی اس دنیا میں ممکن نہیں۔

آئیڈیلزم کے بجائے پریگمیٹزم

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں میں سے ایک سنت یہ ہے کہ اپنی ذات کے معاملہ میں آئیڈیلزم کو اختیار کرنے کی کوشش کرو۔ مگر دوسروں سے معاملہ کرنے میں پریگمیٹک حل (pragmatic solution) پر راضی ہو جاؤ۔ یہ آپ کی ایک اہم سنت ہے اور آپ کی پوری زندگی اس سنت کی مثال نظر آتی ہے۔

جس وقت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور قریش کے درمیان حدیبیہ کا معاہدہ لکھا جا رہا تھا، آپ نے اس میں یہ الفاظ لکھوائے: هَذَا مَا صَالَحَ عَلَيْهِ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللّٰهِ۔ قریش کے نمائندہ نے اعتراض کیا کہ ہم آپ کو خدا کا رسول نہیں مانتے۔ اس لیے آپ محمد رسول اللہ کے بجائے محمد بن عبداللہ لکھوائیے۔ آپ نے محسوس کیا کہ اگر میں رسول اللہ کے لفظ پر اصرار کروں تو صلح کا معاہدہ نہیں ہو سکے گا۔ اس لیے آپ نے رسول اللہ کا لفظ کاغذ سے مٹا دیا اور اس کے بجائے محمد بن عبداللہ لکھوا دیا (مسند احمد، حدیث نمبر 3187)۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب میں جو عظیم کامیابی حاصل کی اس میں اس سنت کا بڑا دخل ہے۔ یہ دنیا ایک ایسی دنیا ہے جہاں بے شمار لوگ ہیں اور ہر آدمی کو آزادی حاصل ہے۔ اس لیے یہاں عملی معاملات میں پریگمیٹزم کا اصول اختیار کیے بغیر کوئی بڑی کامیابی حاصل کرنا ممکن نہیں۔

پریگمیٹک سولیوشن یا عملی حل کو ماننا کوئی تنزل کی بات نہیں ہے۔ یہ حقیقت پسندی کی بات ہے، اور اس دنیا میں حقیقت پسندی ہی تمام کامیابیوں کی کنجی ہے۔

بصیرت کی ضرورت

قران میں بتایا گیا ہے کہ اللہ کے رسول میں تمہارے لیے نمونہ ہے (الاحزاب، 33:21)۔ بظاہر یہ ایک سادہ سی بات ہے مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی سے نمونہ لینے کے لیے گہری سمجھ کی ضرورت ہے۔ اگر آدمی کے اندر گہری سمجھ نہ ہو تو وہ بظاہر قرآن کا یا سنت رسول کا نام لے گا مگر حقیقتاً اس کے عمل کا قرآن وسنت سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کسی ایک چیز کا نام نہیں بلکہ وہ بہت سی چیزوں کا مجموعہ ہے۔ مثلاً ہم سیرت کی کتابوں میں پڑھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تیرہ سال تک مکہ میں رہے مگر آپ نے کبھی کعبہ میں رکھے ہوئے بتوں کو نکال کر پھینکنے کی کوشش نہیں کی۔ مگر اسی پیغمبر کے بارے میں ہم پڑھتے ہیں کہ فتح مکہ کے بعد آپ کے حکم سے کعبہ کے تمام بت نکال کر باہر پھینک دیے گئے۔ ایک طرف ہم آپ کی زندگی میں دیکھتے ہیں کہ مکی دور کے آخر میں آپ کے مخالفین آپ کے مکان کو تلوار لے کر گھیر لیتے ہیں اس وقت آپ خاموشی سے ہجرت کر کے مدینہ چلے جاتے ہیں۔ دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ یہی مخالفین احد کے موقع پر جب تلوار لے کر آتے ہیں تو آپ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ان کا مقابلہ کرتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں اس طرح کے مختلف نمونے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسول کے نمونہ کو اپنانے کے لیے اس حکمت کو جاننا ضروری ہے کہ کون سا نمونہ کس موقع کے لیے ہے۔ اگر آدمی کے اندر یہ بصیرت نہ ہو تو بظاہر وہ سنت رسول پر عمل

کرنے کا دعویٰ کرے گا۔ مگر حقیقتاً وہ سنت رسول سے آخری حد تک دور ہوگا۔

جو شخص سنت کو سمجھنے کی بصیرت سے محروم ہو اس کا حال یہ ہوگا کہ جس موقع پر صبر کی سنت درکار ہوگی وہاں وہ قتال کی آیت کا حوالہ دے گا۔ جن حالات میں دعوت کی سنت مطلوب ہوگی وہاں وہ جہاد کی سنت پر تقریر کرے گا۔ جہاں صلح کی سنت پر عمل کرنا چاہیے وہاں وہ جنگ کی سنت پر عمل کرنے کا نعرہ لگائے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں بلا شبہ بہترین نمونہ ہے۔ مگر یہ نمونہ انہیں لوگوں کے لیے نمونہ بنے گا جو اس معاملہ میں آخری حد تک سنجیدہ ہوں۔ جن میں یہ مزاج نہ ہو کہ وہ اپنی خواہش کے لیے سنتِ رسول میں نمونہ تلاش کریں، بلکہ سنت رسول کے نمونہ پر اپنی خواہش کو ڈھالیں۔ جو اپنے آپ کو سنت رسول کے سامنے جھکانے کا مزاج رکھتے ہوں جو دل کی پوری آمادگی کے ساتھ رسول کو اپنی زندگی کا رہنما بنالیں۔

حدیبیہ منہاج

ڈاکٹر مائیکل ہارٹ کی مشہور کتاب (The 100) کا تعارف غالباً مسلم دنیا میں سب سے پہلے الرسالہ (اکتوبر 1978) میں چھپا۔ اس میں امریکی مصنف نے تاریخ کے ایک سو انتہائی ممتاز آدمیوں کا انتخاب کیا ہے۔ اور ان پر مضامین لکھے ہیں۔ اس سلسلہ میں مصنف نے اپنی فہرست میں نمبر ایک پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رکھا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ محمدؐ تاریخ کے سب سے زیادہ کامیاب انسان (supremely successful man) تھے۔

الرسالہ میں اس مضمون کی اشاعت کے بعد ہمارے پاس کثرت سے مسلمانوں کے خطوط آئے۔ ہر خط میں یہ پوچھا گیا تھا کہ مذکورہ کتاب کو حاصل کرنے کا پتہ کیا ہے۔ بہت سے لوگوں نے اس کے اردو ترجمہ کی بابت دریافت کیا۔ تاہم لوگوں کی تحریروں سے اندازہ ہوا کہ ہر مکتوب نگار کو صرف سپریملی سکس فل انسان سے دلچسپی تھی، ان میں سے کسی کو بھی اس سے دلچسپی نہ تھی کہ وہ اس سپریملی سکس فل انسان کی سپریم سکس کا راز معلوم کرنے کی کوشش کرے۔

یہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا عام مزاج ہے۔ اور اس مزاج کا سبب ہیرو ورشپ کی نفسیات ہے۔ موجودہ مسلمانوں نے رسول اور اصحاب رسول کو اپنا ہیرو بنالیا ہے، نہ کہ اپنا عملی نمونہ۔ یہ دراصل ان قوموں کی نفسیات ہے جو خود کوئی کارنامہ انجام نہ دے سکیں۔ ایسے لوگ اپنی تاریخی شخصیتوں کے پرعظمت تذکرہ کو اپنے لیے تسکین کا سامان بنا لیتے ہیں۔ کسی نے نہایت صحیح کہا ہے کہ تاریخ ان لوگوں کی پناہ گاہ ہے جنہوں نے خود کچھ زیادہ نہ کیا ہو جس کی وہ تقریب منائیں:

History is often the refuge of those who have not done much themselves to celebrate.

امت مسلمہ جب زندہ حالت میں ہوتو اس کا پیغمبر اس کے لیے نمونۂ عمل ہوتا ہے۔ اور امت مسلمہ کے لوگ جب زندہ حالت پر باقی نہ رہیں تو وہ اپنے پیغمبر کو اپنے لیے فخر کا نشان بنا لیتے ہیں۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان اسی دوسری حالت میں مبتلا ہیں۔

موجودہ مسلمانوں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے لیے فخر کا نشان بنالیا ہے۔ اور فخر کے جذبہ کی تسکین اسی طرح ہوتی ہے کہ آپ کو سپریملی سکس فل کہا جائے۔ قرآن میں پیغمبر اسلام کو اسوہ کے طور پر پیش کیا گیا ہے نہ کہ فخر کے طور پر۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ: لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (33:21)۔ یعنی، تمہارے لیے اس کے رسول میں بہترین نمونہ ہے۔ مگر موجودہ دور کے مسلمانوں نے عملاً اپنی تشریح میں اس کو بدل کر لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ مَفْخَرَةٌ حَسَنَةٌ (رسول اللہ میں تمہارے لیے بہترین فخر کی غذا ہے) بنادیا ہے۔

قرآن کی تعلیم کے مطابق، ہمارے لیے سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ہم یہ معلوم کریں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی سپریم سکسس کا راز کیا تھا۔ کیونکہ اس راز کو جان کر ہی ہم دوبارہ اسلام کو اعلیٰ کامیابی کے مقام پر پہنچا سکتے ہیں۔

اس سوال کو لے کر جب ہم قرآن میں غور کرتے ہیں تو سب سے پہلے ہمارے سامنے قرآن کی وہ سورہ آتی ہے جس کا نام الفتح ہے۔ اس سورۃ میں اس واقعہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے کہ: ہم نے تم کو کھلی فتح دے دی: إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحاً مُبِيناً (48:1)۔ ڈاکٹر مائیکل ہارٹ نے جس چیز کو سپریم سکسس بتایا ہے، اس کو قرآن میں فتح مبین کہا گیا ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فتح مبین یا سپریم سکسس کس طرح حاصل ہوئی۔ قرآن کی مذکورہ آیت بتاتی ہے کہ آپ کو یہ غیر معمولی فتح صلح حدیبیہ کے ذریعہ اور اس کے

بعد حاصل ہوئی۔ قرآن کی مذکورہ آیت صلح حدیبیہ کے بارے میں اتری تھی۔ اس لیے یہاں بطریق نص یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ اس فتح کا راز وہ مخصوص طریقہ تھا جس کا استعمال حدیبیہ کے واقعہ میں کیا گیا۔ اس کو ہم حدیبیہ منہاج کہہ سکتے ہیں۔

حدیبیہ سے بظاہر آپ اپنے مقصد کو حاصل کیے بغیر واپس آئے تھے۔ چنانچہ حدیبیہ سے مدینہ واپس جاتے ہوئے راستہ میں جب سورہ فتح نازل ہوئی تو ایک شخص نے کہا کہ یہ تو کوئی فتح نہیں۔ انہوں نے ہم کو بیت اللہ میں داخلہ سے روک دیا۔ آپ نے فرمایا۔ بلکہ وہ تمام فتحوں میں سب سے بڑی فتح ہے— قَالَ رَجُلٌ عِنْدَ مُنْصَرَفِهِمْ مِنَ الْحُدَيْبِيَةِ: مَا هَذَا بِفَتْحٍ، لَقَدْ صَدُّونَا عَنِ الْبَيْتِ. فَقَالَ النَّبِيُّ صلى الله عليه وسلم: بَلْ هُوَ أَعْظَمُ الْفُتُوحِ (تفسیر القرطبی، جلد 16، صفحہ 260)۔

البراء بن عازب صحابی نے بعد کے لوگوں سے کہا کہ تم لوگ فتح مکہ کو فتح سمجھتے ہو۔ مگر ہم لوگ (اصحاب رسول) حدیبیہ کو فتح سمجھتے تھے (صحیح البخاری، حدیث نمبر 4150)۔ ابن شہاب زہری تابعی (124-58ھ) نے کہا کہ اسلام میں صلح حدیبیہ کو فتح اعظم کا درجہ حاصل ہے۔ (السیرۃ النبویۃ لابن کثیر، جلد 3، صفحہ 324)

یہ جو کچھ کہا گیا، اس سے واضح ہوتا ہے کہ رسول اور اصحاب رسول کو جو عظیم کامیابی ملی، اس کا راز صلح حدیبیہ تھا۔ اسلام کا قافلہ حدیبیہ سے گزر کر فتح اعظم کے درجہ کو پہنچا۔ اس لحاظ سے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اہل اسلام کے لیے فتح اعظم یا سپریم سکسس کے مقام تک پہنچنے کا ذریعہ یہ ہے کہ وہ حدیبیہ منہاج کو اختیار کریں۔

اب غور کیجیے کہ حدیبیہ منہاج کیا ہے۔ یہ تمام قربانیوں میں سب سے بڑی قربانی ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اصحاب رسول جیسے فداکاروں کا گروہ بھی اس معاملہ میں وقتی طور پر متزلزل ہوگیا اور نہایت دشواریوں کے ساتھ اس امتحان میں پورا اتر سکا۔

اصحاب رسول کے سامنے بدر اور احد کے محاذ آئے جس میں انہیں اپنی جانوں کی قربانی پیش کرنی تھی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اصحاب رسول کسی سستی اور تذبذب کے بغیر اس میدان میں کود پڑے۔ انہوں نے خون بہا کر اپنی جان بازی اور قربانی کا ثبوت دیا۔

دوسری طرف تاریخ بتاتی ہے کہ حدیبیہ کے موقع پر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح کا معاہدہ کرلیا اور عمرہ کیے بغیر مدینہ کی طرف واپس جانے پر راضی ہو گئے تو ایک ابوبکر صدیق کو چھوڑ کر تمام اصحاب رسول نے اس پر اپنی عدم رضامندی کا اظہار کیا۔ کوئی بھی اس کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شدید اصرار اور دباؤ کے تحت آخر کار وہ اس پر راضی ہوئے۔

یہاں سوچنے کی بات ہے کہ بدر و احد میں اور حدیبیہ میں کیا فرق ہے کہ اصحاب رسول جیسا سرفروش گروہ بدر و احد کی قربانی کے لیے بخوشی راضی ہو گیا مگر حدیبیہ کی قربانی پر راضی ہونا اس کے لیے سخت مشکل بن گیا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ بدر و احد کے محاذ پر جان کی قربانی دینا تھا، اور حدیبیہ کے محاذ پر وقار کی قربانی دینے کا مسئلہ تھا۔ اور ساری تاریخ کا تجربہ بتاتا ہے کہ انسان کے لیے جان کی قربانی اتنی آسان ہے کہ ساری معلوم تاریخ میں بے شمار لوگ مسلسل جان کی قربانی دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ لیکن وقار کی قربانی اتنی زیادہ مشکل ہے کہ معلوم تاریخ میں چند اللہ کے بندوں کے سوا کوئی بھی دکھائی نہیں دیتا جو واقعی رضامندی کے ساتھ وقار کی قربانی دینے پر آمادہ ہو جائے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ جان کی قربانی میں آدمی ہیرو بن رہا ہوتا ہے جب کہ وقار کی قربانی میں وہ اچانک زیرو بن جاتا ہے۔ جان کی قربانی میں وہ اپنے آپ کو فتح کی طرف جاتا ہوا دیکھتا

ہے اور وقار کی قربانی میں وہ محسوس کرتا ہے کہ میں نے خود اپنے فیصلہ سے شکست کو قبول کرلیا۔ جان کی قربانی بظاہر ایک عزت کا عمل ہے اور وقار کی قربانی اس کے برعکس، بے عزتی کا عمل۔ جان کی قربانی میں آگے بڑھنا ہوتا ہے اور وقار کی قربانی میں پیچھے ہٹ جانا۔ جان کی قربانی میں اقدام کا سہرا بندھتا ہے اور وقار کی قربانی میں پسپائی کا الزام سہنا پڑتا ہے — یہی وجہ ہے کہ جان کی قربانی چھوٹی قربانی ہے اور وقار کی قربانی زیادہ بڑی قربانی۔

یہ ایک معلوم بات ہے کہ جتنی بڑی قربانی اتنی ہی بڑی کامیابی۔ سب سے بڑی کامیابی کسی کو صرف اس وقت ملتی ہے جب کہ وہ سب سے بڑی قربانی دینے کے لیے تیار ہو۔ رسول اور اصحاب رسول نے چونکہ حدیبیہ کے موقع پر سب سے بڑی قربانی دی اسی لیے وہ اس دنیا میں سب سے بڑی کامیابی کے مستحق قرار پائے۔

حدیبیہ منہاج میں وہ کون سی خصوصی طاقت ہے جس کی بنا پر وہ فتح مبین کا دروازہ کھول دیتا ہے۔ اس کا سراغ اس واقعہ میں ملتا ہے کہ ذوالقعدہ 6ھ میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ سے مکہ کا سفر فرمایا۔ اس وقت آپ کے ساتھ جو مردان کار تھے، ان کی تعداد ڈیڑھ ہزار سے بھی کم تھی۔ مگر اس کے دو سال سے بھی کم عرصہ بعد رمضان 8ھ میں جب آپ نے دوبارہ مکہ کی طرف مارچ کیا تو آپ کے ساتھ مردان کار کی تعداد دس ہزار ہو چکی تھی۔ پہلے سفر میں اہل مکہ نے آپ کو حدیبیہ کے مقام سے لوٹنے پر مجبور کر دیا تھا۔ دوسرے سفر میں آپ کے عظیم قافلہ کو دیکھ کر وہ اتنا مرعوب ہوئے کہ مقابلہ کے بغیر انہوں نے شکست قبول کرلی۔

اس سے معلوم ہوا کہ حدیبیہ منہاج انسانی تسخیر کا منہاج ہے۔ حربی منہاج میں انسانوں کے جسم کو قتل کیا جاتا ہے۔ اور حدیبیہ منہاج میں انسانوں کی روح کو مسخر کیا جاتا ہے۔

جنگ کا منہاج یہ ہے کہ دشمن کا خاتمہ کرکے اس کے اوپر قبضہ کیا جائے۔ حدیبیہ منہاج یہ ہے کہ دشمن کو دوست بنا کر اس کو اپنی صف میں شامل کرلیا جائے۔ جنگ کے منہاج میں صاحب منہاج کا ہاتھ لوگوں کی گردن پر ہوتا ہے اور حدیبیہ کے منہاج میں صاحب منہاج کا ہاتھ لوگوں کے قلوب پر۔ جنگ کا منہاج دوسروں کو مٹا کر اپنا غلبہ قائم کرنا ہے اور حدیبیہ کا منہاج لوگوں کو شریک کرکے حق کو سربلند کرنا ہے۔ جنگ کا منہاج اگر صرف "میں" کا نام ہے تو حدیبیہ منہاج "میں اور آپ" دونوں کا نام۔ جنگ کے منہاج میں نفرت کامیابی کا ذریعہ بنتی ہے اور حدیبیہ کے منہاج میں محبت کامیابی کی منزل تک پہنچاتی ہے۔

حدیبیہ کا واقعہ نبوت کے تقریباً 20 سال بعد پیش آیا۔ غور کیجیے کہ ایسا کیوں ہوا۔ اس طریقہ کو اختیار کرنے میں اتنی تاخیر کیوں ہوئی۔ حدیبیہ منہاج کے اس پہلو پر غور کیا جائے تو اس سے ایک اور عظیم حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے۔

اس معاملہ کا سراغ سورہ الفتح کے مطالعہ سے ملتا ہے۔ اس میں اصحاب رسول کو مخاطب کرکے بتایا گیا ہے کہ حدیبیہ کے موقع پر جب قریش کے سرداروں نے سرکشی کا مظاہرہ کیا تو یہ ممکن تھا کہ تم کو جنگ کی اجازت دیدی جائے اور اللہ کی مدد سے تمہیں فتح بھی حاصل ہو۔ مگر ایک خاص مصلحت کی وجہ سے تم کو جنگ کی اجازت نہیں دی گئی۔

وہ مصلحت یہ تھی کہ مکہ میں اس وقت بہت سے مرد اور عورت تھے جن کے دل میں اسلام داخل ہو چکا تھا۔ مگر انہوں نے چونکہ ابھی اپنے اسلام کا اعلان نہیں کیا تھا، اس لیے تم ان کو نہیں جانتے تھے۔ گویا کہ امکانی طور پر وہ مسلمان تھے۔ اگر دونوں فریقوں میں جنگ چھڑتی تو یہ لوگ بھی اس میں مارے جاتے۔ تم لاعلمی میں اہل انکار کے ساتھ اہل اقرار کو بھی پیس ڈالتے۔ اور بلاشبہ یہ بہت بڑا نقصان ہوتا۔ (الفتح، 25-22:48)

پھر فرمایا کہ اللہ نے وہ بات جانی جو تم نے نہ جانی: فَعَلِمَ مَا لَمۡ تَعۡلَمُوۡا (48:27)۔ اس علم کی بنا پر حدیبیہ کے موقع پر یہ ہدایت دی گئی کہ یک طرفہ شرط ماننا ہو تب بھی اس کو مان کر سرداران مکہ سے صلح کرلو۔ تاکہ ان امکانی مسلمانوں کو یہ موقع مل جائے کہ وہ اپنے پوشیدہ ایمان کا اعلان کرکے اسلام کی صفوں میں داخل ہو جائیں۔

اس صورت حال کا پس منظر یہ ہے کہ عرب کے لوگ (بنو اسماعیل) عموماً سادہ مزاج تھے اور اپنی فطرت پر قائم تھے۔ ان کا شرک اوپری قسم کا تھا، وہ زیادہ گہرائی کے ساتھ ان کے اندر سرایت نہیں کرسکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کے ابتدائی دور میں کثرت سے ایسے واقعات ملتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتا ہے۔ وہ سادہ قسم کے سوالات کرتا ہے اور اس کے بعد یا تو آپ کی صداقت کا اعتراف کرلیتا ہے یا اسی وقت کلمہ پڑھ کر اسلام قبول کرلیتا ہے۔

مثلاً عمرو بن عبسہ ایک صحابی ہیں۔ وہ اولاً مکہ میں آ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے۔ اور آپ سے کہا کہ جو کچھ اللہ نے آپ کو بتایا ہے، اس میں سے مجھے بتائیے (علّمني ممّا عَلّمک الله)۔ آپ انہیں توحید، صلہ رحمی اور حسن اخلاق کی باتیں بتاتے ہیں۔ وہ فوراً کہہ اٹھتے ہیں کہ کتنی اچھی یہ باتیں ہیں جن کے ساتھ اللہ نے آپ کو بھیجا ہے: نِعْمَ ما أُرْسِلْتَ به (الطبقات الکبریٰ لابن سعد، جلد 4، صفحہ 204)۔

اس طرح کے واقعات کثرت سے سیرت اور حدیث کی کتابوں میں موجود ہیں۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم عربوں کا بگاڑ اوپری نوعیت کا تھا۔ ان کی اصل شخصیت فطری حالت پر قائم تھی اور معمولی تحریک سے حق کو پہچان لیتی تھی۔

قدیم عربوں کی اسی سادگی کا نتیجہ تھا کہ ان کے چند سرداروں کو چھوڑ کر عام عربوں کے

لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار زیادہ تر غلط فہمی کی بنا پر تھا، نہ کہ حقیقتاً سرکشی کی بنا پر۔ اپنے اسی مزاج کی بنا پر انہیں یہ جرأت ہوئی کہ بدر کی جنگ سے پہلے وہ دعا کریں جس کا ذکر سورہ انفال (8:19) میں کیا گیا ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ مکہ کے لوگ جب ایک ہزار کی تعداد میں مکہ سے نکل کر بدر کی طرف روانہ ہوئے تا کہ رسول اور اصحاب رسول سے جنگ کریں تو وہ بیت اللہ میں گئے۔ اور کعبہ کے پردے کو پکڑ کر دعائیں کیں۔ اس دعا میں انہوں نے کہا کہ اے اللہ دونوں گروہوں میں سے جو گروہ زیادہ ہدایت پر ہو اور دونوں دینوں میں سے جو دین زیادہ افضل ہو، تو اس کی مدد فرما اور اس کو فتح دے —فَإِنَّهُمْ لَمَّا نَفَرُوا إِلَى نُصْرَةِ الْعِيرِ تَعَلَّقُوا بِأَسْتَارِ الْكَعْبَةِ وَقَالُوا: اللَّهُمَّ انْصُرْ أَهْدَى الطَّائِفَتَيْنِ، وَأَفْضَلَ الدِّينَيْنِ (دلائل النبوۃ للبیہقی، جلد 3، صفحہ 75)۔ اس کے بعد جب دونوں فریقوں میں ٹکراؤ ہوا تو اہل ایمان کو فتح اور اہل شرک کو شکست ہوئی۔ چنانچہ قرآن میں اہل مکہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا گیا کہ: اگر تم فیصلہ چاہتے تھے۔ تو فیصلہ تمہارے سامنے آ گیا اور اگر تم باز آ جاؤ تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے (8:19)۔

جنگ بدر کی اسی خصوصیت کی بنا پر اس کو یوم الفرقان (8:41) کہا گیا ہے۔ جنگ بدر میں واضح فیصلہ آنے کے بعد عرب کے لوگ، تھوڑے سے سرداروں کو چھوڑ کر، سخت متزلزل ہو گئے۔ ان کا یہ خیال ہو گیا کہ صداقت ہماری طرف نہیں ہے بلکہ محمدؐ کی طرف ہے۔ اس طرح بدر کے بعد عربوں کی اکثریت دین توحید کی طرف مائل ہو گئی۔ تاہم کچھ جابر اور سرکش سرداروں کے خوف سے ہر ایک اپنے ایمان کو چھپائے رہا۔

حقیقت یہ ہے کہ قدیم عرب (بنو اسماعیل) اپنی سادگی اور اپنے فطری مزاج کی بنا پر اول روز ہی سے امکانی طور پر مومن تھے۔ اس کے بعد بدر کے موقع پر خدا سے استفتاح جب

الٹی شکل میں برآمد ہوا تو ان کا ابتدائی میلان زیادہ طاقتور رجحان میں تبدیل ہو گیا۔ وہ امکانی طور پر اسلام کے دروازہ پر پہنچ گئے۔

اب مسئلہ صرف ایک تھا، اور وہ سرداران قریش کا تھا۔ وہ اپنی قیادت اور برتری کو قائم رکھنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جنگ چھیڑے ہوئے تھے اور بظاہر اس پر راضی نہ تھے کہ آپ کا اور آپ کے موحدانہ مشن کا خاتمہ کیے بغیر وہ اپنی جنگ جوئی کو ختم کر دیں۔ انہیں سرکش سرداروں کے خوف سے مکہ اور اطراف مکہ کے لوگ اسلام قبول کرنے سے گھبراتے تھے۔

کسی ندی میں پانی بہہ کر آئے اور بیراج کے آہنی گیٹ پر رک جائے۔ اب ایک طرف پانی کے ذخائر ہیں اور دوسری طرف کھیت اور باغات۔ ایسی حالت میں اگر روک دروازہ کو ہٹا دیا جائے تو پانی کا سیلاب اپنے آپ بہہ کر کھیتوں اور باغوں میں پہنچ جائے گا۔ اس کے بعد اس کی ضرورت نہ ہوگی کہ پانی کے ذخیرہ کو دھکا دے کر آگے بڑھایا جائے۔

اس وقت قریش کی جنگ جوئی اسی قسم کے ایک روک دروازہ (trap door) جیسی ہو گئی تھی۔ مسئلہ صرف دریائی روک کو ہٹانے کا تھا۔ روک کے ہٹنے کے بعد یقینی تھا کہ ہدایت کا سیلاب اپنے آپ یلغار کر کے لوگوں کے دلوں میں داخل ہو جائے گا۔

قریش سے جنگ جاری رکھنے کے لیے خون کی قربانی درکار تھی۔ اور جنگ کی صورتحال کو ختم کرنے کے لیے وقار کی قربانی کا مسئلہ تھا۔ کیونکہ جنگ دوطرفہ بنیاد پر ہرگز ختم نہیں ہو سکتی جنگ کو ختم کرنے کی واحد صورت یہ تھی کہ اس کو وقار کا مسئلہ بنایا جائے اور یک طرفہ طور پر اپنے وقار کی قربانی دے کر قریش مکہ سے صلح کر لی جائے۔ صلح حدیبیہ اسی قسم کا ایک دوررس معاملہ ہے۔

حدیبیہ منہاج یہ ہے کہ مدعو کی طرف سے جب رکاوٹ ختم نہ کی جا رہی ہو تو داعی یک طرفہ جھکاؤ کے ذریعہ اپنی طرف سے رکاوٹ کا خاتمہ کر دے۔

اس وقت صورتحال یہ تھی کہ مسلمان اپنے سینہ میں یہ غم لیے ہوئے تھے کہ مکہ کے سرداروں نے ان کو ان کے وطن سے نکالا۔ ان کے گھروں اور جائیدادوں پر قبضہ کیا۔ لڑائیاں چھیڑ کر ان کی عورتوں کو بیوہ اور ان کے بچوں کو یتیم کیا۔ مکہ جا کر عمرہ کرنے میں رکاوٹیں ڈالیں۔ اس قسم کے واقعات انہیں اس پر اکسا رہے تھے کہ قریش سے لڑ کر انتقام لیں اور انہیں ان کے کیے کا سبق دیں۔

دوسری طرف یہ صورتحال تھی کہ اگر مسلمان اپنے غموں اور شکایتوں کو بھلا دیں اور اپنے شکایتی جذبات کو دبا کر یک طرفہ طور پر خاتمہ جنگ کے لیے راضی ہو جائیں تو اس کے بعد معتدل فضا پیدا ہو جائے گی۔ معتدل فضا پیدا ہونے کے بعد اسلام کے تعارف کا کام تیزی سے بڑھ جائے گا۔ لوگ جو پہلے ہی سے اسلام کے قریب آ چکے ہیں، حالات کی موافقت انہیں تیزی سے اسلام کی طرف لانا شروع کر دے گی۔

قتال نام ہے خون کی قربانی دے کر اسلام کا دفاع کرنے کا۔ حدیبیہ نام ہے وقار کی قربانی دے کر خدا کے بندوں کے لیے خدا کے دین کا دروازہ کھولنے کا۔ یہی فرق یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ ثانی الذکر قربانی اول الذکر قربانی سے زیادہ عظیم ہے۔

مسلم نے ابو ہریرہؓ کے واسطہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے پسند ہے کہ ہم اپنے اخوان (بھائیوں) کو دیکھیں۔ صحابہ نے کہا کہ کیا ہم آپؐ کے اخوان نہیں ہیں اے خدا کے رسول۔ آپؐ نے فرمایا کہ تم لوگ میرے اصحاب ہو۔ ہمارے اخوان وہ لوگ ہیں جو ابھی نہیں آئے: وَدِدْتُ أَنَّا قَدْ رَأَيْنَا إِخْوَانَنَا، قَالُوا: أَوَلَسْنَا

إِخْوَانَكَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ؟ قَالَ: أَنْتُمْ أَصْحَابِي. وَإِخْوَانُنَا الَّذِينَ لَمْ يَأْتُوا بَعْدُ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 249)۔

ابوعبیدہ بن الجراح نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ اے خدا کے رسول، کیا امت میں کوئی ہم سے بہتر ہے۔ ہم آپ پر ایمان لائے۔ اور آپ کے ساتھ جہاد کیا۔ آپ نے فرمایا کہ ہاں۔ وہ لوگ جو میرے اوپر ایمان رکھیں اور انہوں نے مجھ کو دیکھا نہ ہوگا— يَا رَسُولَ اللّٰهِ أَحَدٌ خَيْرٌ مِنَّا آمَنَّا بِكَ وَجَاهَدْنَا مَعَكَ؟ قَالَ: قَوْمٌ يَجِيئُونَ مِنْ بَعْدِكُمْ يُؤْمِنُونَ بِي وَلَمْ يَرَوْنِي (المعجم الکبیر للطبرانی، حدیث نمبر 3538)۔

اس حدیث میں لَم یرَوْنیِ محض لفظی معنوں میں نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ ایک ایسا پیغمبر جو بعد کے زمانہ میں تاریخ کی سب سے بڑی شخصیت بننے والا ہو، جس کی عظمت مسلمہ عظمت کا درجہ حاصل کرنے والی ہو، اس کو ماننا کوئی امتیازی خصوصیت کی بات نہیں ہوسکتی۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس کو کسی معنوی مفہوم میں لیا جائے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جس پیغمبر کی منشاء کو دور اول کے اصحاب رسول نے براہ راست طور پر پیغمبر کو دیکھ کر اور اس سے سن کر مانا تھا، اس پیغمبر کی منشاء کو بعد کے اخوان رسول دیکھے اور سنے بغیر ذاتی دریافت کے ذریعہ معلوم کریں گے۔ اس معاملہ کی وضاحت ایک مثال سے بخوبی ہوتی ہے۔

اصحاب رسول کے سامنے بدر اور احد کا محاذ آیا۔ یہ محاذ جان کی قربانی کا طالب تھا۔ اصحاب رسول نے بلا تامل یہ قربانی پیش کردی۔ پیغمبر کا اشارہ پاتے ہی وہ بدر واحد کے میدان جہاد میں کود پڑے۔ پھر کسی کو اللہ نے شہادت دی، اور کوئی اس سے غازی بن کر واپس آیا۔

انہیں اصحاب رسول کے سامنے دوسرا محاذ وہ آیا جس کو ارباب سیر ”غزوۃ الحدیبیۃ“

کہتے ہیں۔ یہ دوسرا محاذ بھی قربانی کا محاذ تھا۔ البتہ ظاہری طور پر دونوں میں فرق تھا۔ اس دوسرے محاذ پر صرف ایک ابوبکر صدیق کو چھوڑ کر تمام کے تمام صحابہ تشویش میں مبتلا ہو گئے۔ وہی لوگ جنھوں نے پہلے محاذ پر یقین کا مظاہرہ کیا تھا، اس دوسرے محاذ پر شدید تردد میں پڑ گئے۔ یہاں تک کہ پیغمبر کے ذاتی اور شخصی زور پر انھوں نے اس کو قبول کیا۔

آج یہی تاریخ دوبارہ مسلمانوں کی طرف لوٹ آئی ہے۔ آج ایک طرف ساری دنیا میں ایسی روحیں موجود ہیں جو بظاہر غیر مسلم ماحول میں ہیں۔ مگر ان کی فطرت دین حق کو قبول کرنے کے لیے پوری طرح تیار ہے۔ لیکن موجودہ زمانہ میں مسلمانوں اور غیر مسلم قوموں کے درمیان ساری دنیا میں نزاع اور ٹکراؤ جاری ہے۔ اس نزاع اور ٹکراؤ نے اس معتدل فضا کا خاتمہ کر دیا ہے جس میں مذکورہ قسم کے غیر مسلم کھلے ذہن کے ساتھ اسلام کو دیکھیں اور اس کو قبول کر لیں۔

اب آج مسلمانوں کو دوبارہ وہی قربانی دینا ہے جو صلح حدیبیہ کے وقت اصحاب رسول نے دی تھی۔ ان کو ذاتی شکایتوں کو بھلا دینا پڑا تھا۔ آج بھی حالات کا تقاضا ہے کہ مسلمان اپنی ذاتی اور قومی شکایتوں کو بھلا دیں تا کہ داعی اور مدعو کے درمیان معتدل تعلقات قائم ہو سکیں۔

صحابہ کرام نے رسول اللہؐ کو دیکھ کر اور آپ کی براہ راست ذاتی ہدایت پر صبر کی قربانی دی تھی۔ آج مسلمانوں کو رسول اللہ کو دیکھے بغیر صرف آپ کی سیرت کو سامنے رکھتے ہوئے یہی صبر والی قربانی دینا ہے۔ آج کے مسلمان اگر یہ قربانی دے سکیں تو وہ مذکورہ حدیث کے مطابق اخوان رسول قرار پائیں گے، اور بلاشبہ کسی مسلمان کے لیے اس سے بڑی سعادت نہیں ہو سکتی کہ قیامت کے دن اس کا استقبال اخوان رسول کی حیثیت سے کیا جائے۔

جنگ پر بیعت نہیں

امن ایک ایجابی اہمیت کی چیز ہے۔ جبکہ جنگ کی کوئی ایجابی اہمیت نہیں۔ جنگ تمام تر ایک سلبی نوعیت کی چیز ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ امن انسانی معاشرہ کی ایک مستقل ضرورت ہے۔ جنگ صرف وقتی طور پر بطور دفاع مطلوب ہوسکتی ہے۔ وہ بھی ہمیشہ نہیں بلکہ صرف اس وقت جبکہ امن کی برقراری کی ہر ممکن تدبیر ناکام ہو چکی ہو۔ اور مقابلہ کے سوا کوئی اور صورت سرے سے باقی ہی نہ رہے۔

امن و جنگ کا یہ فرق اتنا قطعی ہے کہ ہر مذہب میں اس کو مستقل اصول کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔ اس معاملہ میں کسی مذہب کا کوئی استثناء نہیں۔ اسلام جو ایک غیر محرف مذہب ہے، اس میں بھی امن وجنگ کے بارے میں یہی تصور پایا جاتا ہے جو اوپر بیان ہوا۔

چنانچہ قرآن میں : الصُّلْحُ خَيْرٌ (4:128)۔ کی آیت نازل ہوئی۔ اس کا ترجمہ یہ ہے: صلح بہتر ہے۔ مگر قرآن میں کہیں بھی الحرب خیر (جنگ بہتر ہے) کے مفہوم کی کوئی آیت نازل نہیں ہوئی۔ اسی طرح — لَا تَتَمَنَّوْا لِقَاءَ الْعَدُوِّ وَسَلُوا اللّٰهَ الْعَافِيَةَ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 2966) کی حدیث موجود ہے۔ یعنی، دشمن سے مڈبھیڑ کی تمنا نہ کرو اور اللہ سے امن و عافیت مانگو۔ مگر اس کے برعکس، اس مفہوم کی کوئی حدیث موجود نہیں کہ لوگو دشمن سے جنگ کے متمنی بنو اور اللہ سے حرب و ضرب کی دعا کرو۔

یہ بات قرآن و حدیث میں نہایت واضح ہے۔ مگر موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا ایک طبقہ ظاہر ہوا ہے جو اپنے آپ کو اسلام پسند کہتا ہے مگر زیادہ صحیح طور پر اس کا نام جنگ پسند ہونا چاہیے۔ کیونکہ انہیں جنگ کی باتیں کرنا بہت پسند ہے۔ انہوں نے اقبال (وفات

1930) کو اپنا ہیرو بنایا ہے جس نے شاعرانہ تخیل کے تحت کہا تھا:

خودی ہے تیغ فساں لاالہ الااللہ

اگرچہ اپنی ذات کے لیے یہ لوگ بھی پوری طرح امن پسند ہیں۔ ان کا اصول ہے: جنگ نہ کرو البتہ جنگ کی باتیں خوب کرو۔ وہ خود اپنی ایک انگلی بھی کٹانا نہیں چاہتے مگر اپنی تقریر و تحریر میں سر کٹانے کو خوب گلوریفائی کرتے ہیں۔ اپنی اس دوعملی کے نتیجہ میں وہ خود تو ہمیشہ محفوظ رہتے ہیں۔ البتہ سادہ لوح مسلمان ان کی باتوں سے متاثر ہو کر مارے جاتے ہیں۔

اسلام کی تاریخ میں صلح حدیبیہ اسلام کی امن پسندی کی نہایت اعلیٰ مثال ہے۔ مگر ان جنگ پسند حضرات نے صلح حدیبیہ میں بھی جنگ کا اصول دریافت کر لیا ہے۔ وہ بیعت الرضوان کا حوالہ دے کر کہتے ہیں کہ دیکھو صلح حدیبیہ بھی جنگ کے منصوبہ سے خالی نہیں۔ مگر یہ حوالہ نہایت غلط اور بے بنیاد ہے۔

سیرت اور حدیث کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بیعت الرضوان جنگ کی بیعت نہیں تھی، بلکہ عدم فرار کی بیعت تھی۔ یہ بیعت حدیبیہ کے سفر میں پیش آئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ سے سفر کے لیے نکلے تو اس وقت آپ نے اعلان فرمایا تھا کہ ہم جنگ کے لیے نہیں جا رہے ہیں بلکہ عمرہ کے لیے جا رہے ہیں۔ حدیبیہ کے قیام میں بھی آپ نے بتکرار یہ واضح فرمایا کہ ہمارا مقصد ہرگز جنگ نہیں ہے۔ بلکہ صرف زیارت کعبہ ہے۔ ایسی حالت میں حدیبیہ پہنچ کر جنگ کی بیعت لینے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ پھر بیعت الرضوان کی حقیقت کیا تھی۔ اس کے سلسلہ میں اس کا مختصر تاریخی پس منظر بیان کرنا ہوگا۔

بیعت الرضوان (6ھ) اسلامی تاریخ کا مشہور واقعہ ہے جو حدیبیہ کے ضمن میں پیش آیا۔ یہ سفر اصلاً عمرہ کرنے کے لیے ہوا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب حدیبیہ کے مقام

پر پہنچے تو قریش نے آپ کو مکہ میں داخل ہونے سے روکا۔ اس وقت قریش سے آپ کی صلح کی بات چیت شروع ہوئی۔ اس دوران آپ نے حضرت عثمان بن عفان کو اپنا سفیر بنا کر قریش کے پاس بھیجا تا کہ وہ اہل مکہ کو بتائیں کہ آپ مکہ میں صرف عبادت کے لیے داخل ہونا چاہتے ہیں نہ کہ جنگ اور ٹکراؤ کے لیے۔

قریش اس بات پر راضی نہیں ہوئے۔ انہوں نے حضرت عثمان کو اپنے یہاں روک لیا۔ جب آپ کی واپسی میں تاخیر ہوئی تو مشہور ہو گیا کہ قریش نے حضرت عثمان کو قتل کر دیا ہے۔ یہ خبر بے حد غیر معمولی تھی۔ چنانچہ اس کو سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چودہ سو اصحاب کو جمع کیا اور ان سے بیعت لی اسی کا نام بیعت الرضوان ہے۔

یہ بیعت کس بات پر تھی۔ روایات میں آتا ہے کہ کچھ لوگوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے موت پر بیعت لی ہے۔ حضرت جابر بن عبد اللہ، جو خود اس بیعت میں شریک تھے، انہوں نے تردید کرتے ہوئے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے موت پر بیعت نہیں لی۔ بلکہ اس بات پر بیعت لی کہ ہم بھاگیں گے نہیں — إِنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم لَمْ يُبَايِعْنَا عَلَى الْمَوْتِ، وَلَكِنْ بَايَعَنَا عَلَى أَلَّا نَفِرَّ (البدایۃ والنہایۃ، جلد 4، صفحہ 380)۔ تمام سیرت نگاروں نے بیعت الرضوان کا یہی مفہوم لیا ہے۔ الفاظ اور سیاق کے مطابق اس کا کوئی اور مفہوم نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ابن قیم نے اپنی مشہور کتاب زاد المعاد میں بیعت الرضوان کے تذکرہ کے تحت یہ الفاظ لکھے ہیں: فَبَايَعُوهُ عَلَى أَلَّا يَفِرُّوا (زاد المعاد، جلد 3، صفحہ 259)۔

روایات میں آتا ہے کہ اس کے بعد قریش مکہ نے سہیل بن عمرو کو اپنا سفیر بنا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا۔ سہیل بن عمرو ایک اعتدال پسند آدمی تھے اور بعد

کو انھوں نے اسلام بھی قبول کرلیا۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب سہیل کو آتے ہوئے دیکھا تو آپ مطمئن ہو گئے اور فرمایا کہ قریش نے جب سہیل کو گفت وشنید کے لیے بھیجا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ صلح چاہتے ہیں (سیرت ابن ہشام، جلد 2، صفحہ 316)۔

حدیبیہ کے سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کامل امن پسندی کا مظاہرہ کیا۔ فریق ثانی کی اشتعال انگیزی کے باوجود آپ مشتعل نہیں ہوئے۔ ٹکراؤ کے ہر موقع سے یک طرفہ طور پر اعراض کرتے رہے۔ مثلاً دوران سفر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا کہ قریش کا 200 سواروں کا دستہ مکہ سے روانہ ہو کر آپ کی طرف آرہا ہے۔ آپ کو جب اس کی خبر ملی تو آپ نے اصحاب سے یہ نہیں فرمایا کہ جنگ کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ بلکہ آپ نے اپنا راستہ بدل دیا۔ اس طرح قریش کی فوج سے ٹکراؤ کی نوبت نہیں آئی۔

اپنی جماعت کے سب سے زیادہ نرم مزاج آدمی کو اس سفارت کے ساتھ بھیجا کہ ہم صلح کرنے کے لیے تیار ہیں۔ پھر جب قتل کی خبر ملی اس وقت بھی آپ نے ایسا نہیں کیا کہ خبر ملتے ہی قریش کے اوپر ٹوٹ پڑیں۔ بلکہ اپنے مقام پر ٹھہر کر لوگوں سے صرف اس بات کی بیعت لی کہ ہم یہیں جمے رہیں گے۔ قریش اگر خود سے لڑنے کے لیے آتے ہیں تو مقابلہ کریں گے۔ اور وہ صلح پر راضی ہوتے ہیں تو صلح کرلیں گے۔ خواہ یہ صلح یک طرفہ شرطوں پر کیوں نہ ہو، جیسا کہ آپ نے عملاً کیا۔ بیعت الرضوان کے باوجود صلح کرلینا اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ بیعت اصلاً جنگ کے لیے نہ تھی۔ اگر وہ جنگ کے لیے ہوتی تو ناممکن تھا کہ اس کے بعد اپنے دشمن سے یک طرفہ شرطوں پر صلح کرلیں۔

حضرت عثمان بن عفان جب مکہ گئے تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سفیر کی

حیثیت سے وہاں گئے تھے۔ بین الاقوامی رواج کے مطابق سفیر کا قتل اعلان جنگ کے ہم معنی ہوتا ہے۔ جب یہ خبر ملی کہ قریش نے آپ کے سفیر کو قتل کر دیا ہے تو قدرتی طور پر آپ نے اس کا مطلب یہ سمجھا کہ قریش اب آخری طور پر آمادہ جنگ ہو چکے ہیں، وہ کسی حال میں صلح اور امن کا معاملہ کرنے پر راضی نہیں ہیں۔ اس خبر نے وقتی طور پر صورت حال کو یکسر بدل دیا۔

ابتدائی صورتحال کے مطابق آپ کے سامنے صلح یا جنگ میں انتخاب (چوائس) کا مسئلہ تھا۔ اس وقت آپ نے جنگ کو چھوڑ کر صلح کا انتخاب فرمایا تھا۔ مگر قتل سفیر کی خبر نے ظاہر کیا کہ اب فرار یا جنگ میں سے کسی ایک صورت کے انتخاب (چوائس) کا مسئلہ درپیش ہے۔ یعنی قریش کسی حال میں بھی صلح پر راضی نہیں ہیں۔ وہ ہر حال میں جنگ کرنا چاہتے ہیں۔ اس وقت آپ نے اپنے اصحاب سے عدم فرار اور بصورت جارحیت دفاع کی بیعت لی۔ مگر جب معلوم ہوا کہ یہ خبر غلط تھی تو پھر دوبارہ آپ جنگ کو چھوڑ کر صلح پر راضی ہو گئے۔ حالانکہ یہ صلح آپ کو دشمن کی یک طرفہ شرطوں پر کرنی پڑی۔

بیعت الرضوان کا پیغام یہ ہے کہ تمہارے لیے اگر انتخاب (چوائس) فرار اور جنگ کے درمیان ہو تو فرار کو چھوڑ کر جنگ کا طریقہ اختیار کرو۔ اور اگر تمہارے لیے انتخاب (choice) صلح اور جنگ کے درمیان ہو تو جنگ کو چھوڑ کر صلح کا طریقہ اختیار کرو، خواہ یہ صلح فریق ثانی کی یک طرفہ شرائط پر ہی کیوں نہ ہو۔ مزید یہ کہ فرار کے مقابلہ میں عدم فرار کو اختیار کرنے کا حکم بھی مشروط حکم ہے نہ کہ مطلق حکم۔ کیونکہ حدیبیہ (6ھ) میں آپ نے فرار کے مقابلہ میں عدم فرار کا فیصلہ فرمایا۔ مگر اس سے پہلے مکہ (1ھ) میں اسی طرح کی صورتحال میں آپ نے وہاں سے ہجرت فرمائی۔

حدیبیہ دراصل عدم ٹکراؤ کی پالیسی کا دوسرا نام ہے۔ اسی پالیسی کا نام صبر ہے۔ اسلام میں صبر کی بے حد اہمیت ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی شخص کو صبر سے زیادہ بہتر اور کشادہ عطیہ نہیں دیا گیا: وَمَا أُعْطِيَ أَحَدٌ عَطَاءً خَيْرًا وَأَوْسَعَ مِنَ الصَّبْرِ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 1481)۔ صبر کی اہمیت اور افضلیت کے بارے میں اس قسم کے بہت سے اقوالِ رسول حدیث کی کتابوں میں آئے ہیں۔ مثال کے طور پر مسند احمد میں روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میں تمارے لیے صبر سے زیادہ کشادہ رزق اور کوئی نہیں پاتا: وَمَا أَجِدُ لَكُمْ رِزْقًا أَوْسَعَ مِنَ الصَّبْرِ (مسند احمد، حدیث نمبر 11091)۔

ان حدیثوں میں صبر کو رزق اور عطیہ کہا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ صبر کوئی سلبی چیز نہیں ہے، بلکہ وہ ایجابی چیز ہے۔ صبر محرومی نہیں ہے بلکہ یافت ہے۔ صبر بے عملی نہیں ہے بلکہ وہ سب سے بڑا عمل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ صبر پیغمبرانہ عمل (prophetic activism) یا اسلامی عمل (Islamic activism) کی اصل بنیاد ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا بتایا ہوا طریق کار تمام تر صبر کے اصول پر مبنی ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو جو قرآن دیا گیا وہ پورا کا پورا "کتاب صبر" ہے۔ جن آیتوں میں صبر کی براہ راست تعلیم دی گئی ہے، ان کا صبر کی آیت ہونا واضح ہے۔ لیکن غور کیجیے تو بقیہ قرآنی آیتیں بھی بالواسطہ طور پر صبر ہی کی آیتیں ہیں۔ مثلاً: اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ (96:1) عین صبر کی آیت ہے۔ یعنی، پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔ کیونکہ ماحول کی اشتعال انگیزیوں پر صبر کے بغیر اقرأ کا عمل نہیں کیا جا سکتا۔ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ (1:2) میں صبر کا لفظ نہیں مگر وہ عین صبر کی آیت ہے۔ کیونکہ نقصان اور محرومی پر

جب تک صبر نہ کیا جائے حقیقی کلمۂ حمد آدمی کی زبان سے نہیں نکل سکتا۔ قُولا لَهُ قَوْلاً لَّيِّناً (20:44)۔ یعنی، پس اس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا، شاید وہ نصیحت قبول کرے یا ڈر جائے۔ صبر کی آیت ہے۔ کیونکہ سرکش مخاطب کی دل آزار باتوں کو جب تک برداشت نہ کیا جائے اس سے نرم انداز میں گفتگو نہیں کی جاسکتی، وغیرہ وغیرہ۔

اس دنیا میں کامیابی کا واحد راز یہ ہے کہ ممکن سے اپنے عمل کا آغاز کیا جائے، اور ناکامی کا واحد سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ اپنی قوت اور طاقت کو ناممکن کے حصول میں لگا دیا جائے۔

اس کو دوسرے لفظوں میں اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ متشددانہ طریق کار آدمی کو تباہی کی طرف لے جاتا ہے اور پرامن طریق کار کامیابی کی طرف۔ متشددانہ طریق کار ہمیشہ بے صبری کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں پرامن طریق کار وہ لوگ اختیار کرتے ہیں جو نزاعی معاملات میں صبر وتحمل کا ثبوت نہ دے سکیں۔ امن کی طاقت اس دنیا میں سب سے بڑی طاقت ہے، اور صبر آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ امن کی طاقت کو کامیاب طور پر استعمال کر سکے۔

تکمیل دین

ختم نبوت اور تکمیل دین دونوں ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی تخلیقی اسکیم کے مطابق یہ لازمی طور پر ضروری ہے کہ اہل عالم کے سامنے ہر زمانہ میں خدا کی رہنمائی موجود رہے۔ پچھلے زمانوں میں یہ رہنمائی پیغمبروں کے ذریعہ فراہم کی جاتی تھی۔ انسان اول آدم علیہ السلام ہی کے وقت سے رہنمائی کا یہ سلسلہ شروع ہوا اور اس کے بعد ہر دور میں وہ مسلسل جاری رہا۔ یہی بات قرآن میں ان لفظوں میں کہی گئی ہے — ثُمَّ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا (23:44)۔ یعنی، پھر ہم نے لگاتار اپنے رسول بھیجے۔

محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں قرآن (23:40) میں اعلان کیا گیا کہ وہ آخری رسول ہیں۔ اب ان کے بعد کوئی اور رسول آنے والا نہیں ہے۔ یہ اعلان سادہ طور پر صرف فہرست انبیاء کے پورا ہو جانے کا اعلان نہ تھا۔ اس کا لازمی مطلب یہ بھی تھا کہ ذات نبوت اگرچہ اب دنیا میں موجود نہیں رہے گی مگر بدل نبوت ہمیشہ دنیا میں بدستور باقی رہے گا۔

تکمیل دین (بمعنی استحکام دین) دراصل اسی فیصلہ خداوندی کا ظہور ہے۔ ختم نبوت کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کو نبوت کا بدل یا اس کا قائم مقام بنا دیا۔ قدیم زمانہ میں دین عدم استحکام کا شکار ہوتا رہتا تھا۔ اس لیے نبی کے بعد وہ نبوت کا بدل نہیں بن سکتا تھا۔ پیغمبر آخر الزمان کے بعد، اللہ کی خصوصی نصرت کے ذریعہ دین کو پوری طرح مستحکم کر دیا گیا۔ اس طرح ختم نبوت کے بعد خود دین نبوت کا بدل بن گیا۔ قیامت تک یہ حالت باقی رہے گی، اس لیے اب قیامت تک محمد عربی کی نبوت بھی جاری رہے گی۔ اب کسی نئے نبی کے آنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

اسی معاملہ کو قرآن میں اکمال دین (یا تکمیل دین) کہا گیا ہے۔ یعنی دین کو اس طرح مستحکم کر دینا کہ قیامت تک اس کے لیے کسی قسم کا کوئی خطرہ باقی نہ رہے۔ قرآن کی سورہ نمبر 5 میں ارشاد ہوا ہے:

> الْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ دِينِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِيناً (5:3)۔ آج منکر لوگ تمہارے دین کی طرف سے مایوس ہو گئے۔ پس تم ان سے نہ ڈرو، تم صرف مجھ سے ڈرو۔ آج میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو کامل کر دیا اور تمہارے اوپر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو

دین کی حیثیت سے پسند کرلیا۔

اس آیت میں دین کامل سے مراد دین مستحکم ہے (لسان العرب، جلد 11، صفحہ 598، تفسیر النسفی، جلد 1، صفحہ 270)۔ پچھلے زمانوں میں دین میں بار بار تحریف وتبدیلی ہوتی رہتی تھی۔ مخالف طاقتیں پیغمبروں کے دین کو تاریخ تک سے مٹانے میں کامیاب ہوجاتی تھیں۔ پیغمبر آخر الزماں اور آپ کے اصحاب کے ذریعہ عالم انسانی میں ایسا انقلاب لایا گیا کہ دینی عدم استحکام کا مسئلہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔

ضحاک کے قول کے مطابق، قرآن کی یہ آیت فتح مکہ کے بعد 8ھ میں نازل ہوئی۔ یعنی ہجری کیلنڈر کے اعتبار سے چودہ سو سال پہلے۔ اس وقت کے حالات میں اس آیت کی حیثیت مستقبل کے بارے میں ایک جرأت مندانہ پیشین گوئی کی تھی۔ اس میں پیشگی طور پر یہ اعلان کیا گیا کہ اب تاریخ ایک نئے دور میں داخل ہوگئی ہے۔ اب خدا کے دین کے لیے خشیتِ انسانی کا مسئلہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔ اب خدا کا دین اتنا مستحکم ہو چکا ہے کہ مخالف طاقتیں آئندہ کبھی بھی اس کو زیر کرنے میں کامیاب نہ ہوسکیں گی۔

موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں تمام کام اسباب عادی کے تحت انجام پذیر ہوتے ہیں۔ اس صورت حال کو شامل کر کے مذکورہ آیت کی تفسیر کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس اعلان کا مطلب یہ تھا کہ آنے والے زمانوں میں تاریخ کا سفر صرف اس سمت میں ہوگا، جو دینِ خداوندی کے موافق ہو۔ آئندہ پیش آنے والے واقعات صرف وہی رخ اختیار کریں گے، جو دین خدا کا اثبات کرنے والے ہوں، نہ کہ اس کی تردید کرنے والے۔

یہ پیشین گوئی تمام زمانوں میں مکمل طور پر پوری ہوئی ہے۔ اس طرح خالص علمی اور تاریخی سطح پر یہ ثابت ہوا ہے کہ قرآن خدا کی طرف سے اتارا ہوا کلام ہے۔ کیونکہ خداوند عالم

کے سوا کوئی بھی تاریخ کے بارے میں ایسے فیصلہ کن اعلان پر قادر نہیں اور نہ کبھی کسی نے اس قسم کا فیصلہ کن اعلان تاریخ کے بارے میں کیا۔

اس مختصر صحبت میں میں تاریخ کے تین بڑے واقعات کا ذکر کروں گا۔ یہ واقعات وہ ہیں جو بظاہر مخالفت دین انقلاب کی حیثیت سے ظاہر ہوئے، مگر باعتبار نتیجہ وہ حامیِ دین انقلاب بن گئے۔ یہ تین انقلابات ہیں— آزادی، سائنس، اور سیکولرزم۔

1۔ موجودہ زمانہ آزادی کا زمانہ ہے۔ جب کہ پچھلے تمام زمانے اظہار خیال پر پابندی کے زمانے رہے ہیں۔ ہر انسانی گروہ میں، خواہ وہ بڑے ہوں یا چھوٹے، دنیا کے ہر حصے میں اور تاریخ کے ہر مرحلے میں، کسی نہ کسی شکل میں زبان وقلم پر احتساب قائم رہا ہے:

> Some form of censorship has appeared in all communities, small and large, in all parts of the world, at all stages of history. (*Encyclopedia Britannica*, Vol. 3, p. 1083)

آزادی اظہار پر اسی عمومی پابندی کا یہ نتیجہ تھا کہ مذاہب کی مقدس کتابیں کبھی کھلی تنقید کا موضوع نہ بن سکیں۔ تنقیدی جائزہ کی اس ممانعت کی بنا پر ایسا ہوا کہ ایک مذہبی کتاب اور دوسری مذہبی کتاب کا فرق بھی خالص علمی بنیاد پر واضح ہو کر سامنے نہیں آیا۔ مذہبی کتابوں کی حیثیت متعین کرنے کا معلوم ذریعہ صرف ایک تھا، اور وہ ان کتابوں کو ماننے والوں کا اپنا عقیدہ تھا۔ ہر گروہ اپنی مقدس کتاب کو یکساں درجہ میں آسمانی کتاب بتا رہا تھا، اس بنا پر لوگوں نے بھی ہر کتاب کو یکساں درجہ میں آسمانی کتاب فرض کرلیا تھا۔ حالانکہ اصل حقیقت یہ تھی کہ قرآن محفوظ آسمانی کتاب تھی، اور دوسری تمام کتابیں غیر محفوظ آسمانی کتاب، قرآن پوری طرح غیر محرف تھا، جب کہ دوسری تمام مذہبی کتابیں تحریف کا شکار ہو چکی تھیں۔

موجودہ زمانہ میں جب کھلی آزادی کا دور آیا تو ہر چیز کی بے روک ٹوک جانچ ہونے لگی۔ حتیٰ کہ مقدس مذہبی کتابیں بھی اس کی زد میں آ گئیں۔ یہ عمل پچھلے تقریباً تین سو سال سے اہل علم کے درمیان جاری ہے۔ حتیٰ کہ یہ ایک مستقل فن بن گیا ہے جس کو ہائر کریٹیسزم (higher criticism)، ہسٹاریکل کریٹیسزم (historical activism)، تنقید متن (textual criticism) وغیرہ کہا جاتا ہے۔

اس آزادانہ جانچ کا یہ عظیم فائدہ ہوا کہ قرآن اور دوسری مقدس کتابوں کا فرق خالص علمی اور تاریخی اعتبار سے ثابت ہو کر سامنے آ گیا۔ ان ناقدین نے جس طرح دوسری مقدس کتابوں کی جانچ کی۔ اسی طرح انہوں نے قرآن کی بھی بے رحمانہ جانچ کی۔ مگر آخر کار جو بات ثابت ہوئی وہ یہ تھی کہ قرآن ایک محفوظ کتاب ہے، اور اس کے مقابلہ میں ہر ایک غیر محفوظ کتاب۔ قرآن غیر محرف ہے، اور دوسری کتابیں محرف۔ قرآن ایک معتبر تاریخی کتاب ہے، جبکہ دوسری کتابوں کو تاریخی اعتباریت حاصل نہیں۔

مثال کے طور پر دور جدید کے علما نے قرآن کے مختلف نسخے مختلف ملکوں سے حاصل کیے۔ انہوں نے مختلف زمانوں کے قرآنی نسخے ہاتھ سے لکھے ہوئے یا مطبوعہ قسم کے اکٹھا کیے۔ ان تمام جمع شدہ قرآنی نسخوں کا ایک دوسرے سے تقابل کیا گیا۔ مگر قرآن کے ہزاروں نسخوں میں ایک اور دوسرے کے درمیان کوئی ادنی فرق بھی دریافت نہ ہو سکا۔ بعض آیتوں کے بعض الفاظ میں قرأت (لہجہ) کا فرق ضرور تھا۔ مگر جہاں تک مصحف میں کتابت کا سوال ہے، کتابت میں کوئی بھی جزئی یا کلی فرق ان میں پایا نہیں گیا۔

دوسری مقدس کتابوں کا معاملہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ ان کے مختلف نسخوں میں

ہزاروں واضح فرق پائے گئے۔ مثال کے طور پر تورات کے کچھ نسخوں میں ایک گروہ کی تعداد دس ہزار (ten thousands) بتائی گئی تھی۔ اور کچھ دوسرے نسخوں میں اسی گروہ کی تعداد کے لیے ہزاروں (thousands) کا لفظ درج تھا۔ انجیل میں ایک مقام پر حضرت مسیح کے لیے ابن اللہ (son of God) لکھا ہوا ملا۔ اور اس کے کچھ دوسرے نسخوں میں حضرت مسیح کو ابن داؤد (son of David) لکھا ہوا تھا، وغیرہ۔

موجودہ دورِ آزادی قرآن اور اسلام کے لیے ایک چیلنج بن کر سامنے آیا تھا۔ مگر آخری نتیجہ کے اعتبار سے دیکھیے تو وہ اسلام کے حق میں مفید ثابت ہوا۔ اس نے قرآن کے حق میں ایک نئی تاریخی دلیل فراہم کر دی۔ قرآن اور دوسری مقدس کتابوں کا فرق جو اب تک صرف مسلمانوں کے ذاتی عقیدہ کی حیثیت رکھتا تھا، وہ اب خود علم انسانی کی رو سے ایک ثابت شدہ حقیقت بن گیا۔ آزادی کا یہ طوفان بظاہر اہل اسلام کے لیے "عُسر" کا ایک واقعہ تھا۔ مگر آخری مرحلہ میں پہنچ کر وہ اہل اسلام کے لیے "عین یُسر" کے ہم معنی ثابت ہوا۔

2۔ دوسرا فکری انقلاب جدید سائنسی انقلاب ہے۔ خاص طور پر انیسویں صدی عیسوی میں کسی چیز کو دریافت کرنے کا وہ طریقہ وضع ہوا جس کو سائنسی طریقہ (scientific method) کہا جاتا ہے۔ اس طریقہ میں چیزوں کو قابل مشاہدہ یا قابل تجربہ واقعات کی روشنی میں جانچا جاتا ہے۔ اس طریقہ کے رواج سے انسان کو بہت سی نئی چیزوں کے بارے میں واقفیت ہوئی۔ مثلاً شمسی نظام کا تفصیلی علم، یا زمین کی تہوں کے بارے میں قطعی معلومات۔

ان مادی دریافتوں کے بعد ایک مستقل فلسفہ بنا جس کو عام طور پر پازیٹوزم (positivism) کہا جاتا ہے۔ اسی فلسفہ کے تحت یہ سمجھا جانے لگا کہ کسی حقیقی علم تک

پہنچنے کا معیار (criterion) صرف ایک ہے، اور وہ براہ راست تجربہ یا مشاہدہ ہے جو قابل تصدیق (verifiable) ہو۔

اس نقطہ نظر سے دیکھا گیا تو مذہبی معتقدات اس معیار علم میں پورے ہوتے نظر نہیں آئے۔ کیونکہ مذہبی عقائد تمام تر بالواسطہ استدلال یا استنباط کی بنیاد پر قائم تھے۔ مثلاً خدا کا وجود نا قابل مشاہدہ تھا۔ اس کے حق میں جو دلیل دی جاتی تھی وہ بس اس قسم کی تھی کہ اس عالم میں چونکہ ڈزائن ہے، اس لیے ضروری ہے کہ اس کا ایک ڈزائنر ہو۔ اس قسم کا استنباطی استدلال جدید علمی معیار کے مطابق غیر معقول (invalid) تھا۔ اس لیے ان کو فرضی توجیہات (pseudo-explanations) کہہ کر رد کر دیا گیا۔

علم کی دنیا میں تقریباً سو سال تک یہ فکری ہنگامہ جاری رہا۔ مگر اس نقطہ نظر میں فکری وزن صرف اس وقت تک تھا جب تک انسانی علم کی رسائی عالم کبیر (macro-world) تک محدود تھی۔ بیسویں صدی کے آغاز میں جب انسانی علم کی رسائی عالم صغیر (micro-world) تک پہنچ گئی تو ساری صورت حال یکسر بدل گئی۔

اب معلوم ہوا کہ براہ راست استدلال کا میدان بہت محدود ہے۔ نئے حقائق جو انسان کے علم میں آرہے تھے وہ اتنے لطیف تھے کہ صرف استنباط یا بالواسطہ استدلال ہی وہاں قابل عمل نظر آتا تھا۔ مثال کے طور پر جرمن سائنس داں رانٹجن (Wilhelm Conrad Rontgen, 1845-1923) نے 1895ء میں ایک تجربہ کے دوران پایا کہ اس کے سامنے کے شیشہ پر کچھ اثرات (effect) ظاہر ہو رہے ہیں جب کہ اس کے تجربہ اور اس شیشہ کے درمیان کوئی معلوم رشتہ موجود نہ تھا۔ اس نے کہا کہ یہاں ایک نا قابل مشاہدہ شعاع (invisible

(radiation) ہے جو 186000 میل فی سکنڈ کی رفتار سے سفر کر رہی ہے۔ اس کی نامعلوم نوعیت (unknown nature) کی بنا پر رانٹجن نے اس کا نام اکسرے (X-rays) رکھ دیا (*Encyclopedia Britannica*, Vol. 19 p. 1058)۔

بیسویں صدی میں اس طرح کے کثیر حقائق سامنے آئے جن کا براہ راست مشاہدہ ممکن نہ تھا، مگر ان کے بالواسطہ اثرات کی بنا پر ان کے وجود سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس لیے جدید علما مجبور ہوئے کہ براہ راست استدلال کے ساتھ استنباطی استدلال کو بھی ایک معقول استدلالی معیار کے طور پر تسلیم کریں۔ کیونکہ اس کے بغیر اکسریز کی تشریح نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس کے بغیر ایٹم کے سائنسی ڈھانچہ کو ماننا ممکن نہ تھا۔ اس کے بغیر بلیک ہول یا ڈارک میٹر کے وجود کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا تھا، وغیرہ۔

معیار استدلال میں اس توسیع کے بعد دینی معتقدات پر استدلال اتنا ہی معقول (valid) بن گیا جتنا کہ سائنسی نظریات پر استدلال۔ جس استنباطی منطق سے سائنس کے جدید نظریات ثابت کیے جا رہے تھے، عین اسی استنباطی منطق سے دینی عقیدہ بھی ثابت ہو رہا تھا۔

اس طرح چودہ سو سال پہلے قرآن کا یہ اعلان دوبارہ تاریخ میں قائم ہو گیا کہ انسانی افکار میں کوئی بھی تبدیلی اسلام کی حقانیت کو ردّ نہ کر سکے گی۔ آئندہ آنے والا کوئی بھی انقلاب صرف دین خداوندی کی تصدیق کرے گا۔ وہ کسی بھی حال میں اس کی تردید کرنے پر قادر نہ ہوگا۔

3۔ تیسرا فکری انقلاب جس سے بعد کی تاریخ میں اسلام کا سابقہ پیش آیا وہ سیکولرزم ہے۔ یہ فکر یورپ کی نشاۃ ثانیہ کے ساتھ شروع ہوا۔ یہ سیکولرزم ایک ایسی تحریک تھی جو بعد کو آنے والی دنیا کے بجائے موجودہ مادی دنیا کو ساری اہمیت دیتی تھی:

....a movement in society directed away from other

worldlines to this worldlines. (*Encyclopedia Britannica,* Vol. 10, p. 19)

سیکولرزم کا نظریہ جدید دنیا پر ایک طاقتور سماجی اور سیاسی فکر کی حیثیت سے چھا گیا۔ نظری اعتبار سے اگرچہ اس کا مطلب یہ تھا کہ کسی ملک کی اجتماعی پالیسی مذہبی امور میں عدم مداخلت (non-interference) کی بنیاد پر قائم کی جائے۔ مگر عملاً وہ ایک زبردست مخالف مذہب (anti-religious) طاقت بن گیا۔ یہ معلوم ہونے لگا کہ سیکولرزم کی لہر اولاً مذہب کو زندگی کے حاشیہ کی طرف دھکیل دے گی، اور اس کے بعد ایک غیر حقیقی نظریہ کی حیثیت سے مذہب کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جائے گا۔

مگر قرآن کی پیشین گوئی دوبارہ فیصلہ کن ثابت ہوئی۔ معلوم ہوا کہ دین خداوندی کا تعلق انسان کی ابدی فطرت سے ہے۔ مذہب کا احساس انسان کے لیے اسی طرح ناقابل تغیر ہے جس طرح پیاس کا احساس انسان کے لیے ناقابل تغیر ہے۔ سیکولرزم کی بنیاد پر بننے والے وسیع ترین ادارے اور انتہائی طاقتور حکومتیں بھی اس میں کامیاب نہ ہو سکیں کہ انسان خدائی دین کو چھوڑ کر سیکولرزم کو اپنا مذہب بنا لے۔

اس سلسلہ میں ایک سبق آموز تجربہ وہ ہے جس کی مثال ترکی میں ملتی ہے۔ کمال اتاترک نے ترکی میں سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے بعد 1924ء میں اسلامی خلافت کے خاتمہ کا اعلان کر دیا۔ انہوں نے جارحانہ سیکولرزم کو ملک کی پالیسی قرار دیا۔ انہوں نے ریاستی طاقت کے زور پر تمام دینی مدرسے اور تمام دینی ادارے یک لخت بند کر دیے۔ انہوں نے نئی قانون سازی کے ذریعہ ترکی کا پورا نظام لادینیت کی بنیاد پر قائم کر دیا۔ حتیٰ کہ ترکوں کے قدیم لباس کو بھی بزور تبدیل کر کے انہیں یورپی لباس پہننے پر مجبور کر دیا۔ اس سلسلہ میں ہر مخالفت کو طاقت کے ذریعہ کچل دیا گیا۔

اتاترک کے انتقال کے بعد ان کے ساتھی عصمت انونو (م 1973ء) ترکی کے صدر مقرر ہوئے۔ انہوں نے بھی پوری وفاداری کے ساتھ اتاترک کی جارحانہ سیکولر پالیسی جاری رکھی۔ مگر تقریباً پچاس سال کی مخالف اسلام حکومتی مہم کے باوجود ترکی میں اسلام زندہ رہا۔ اتاترک کی اسلام کو ختم کرنے کی پالیسی مکمل طور پر ناکام ہوگئی۔ حتیٰ کہ خود عصمت انونو کو اپنی آخر عمر میں اس کا اعتراف کرنا پڑا۔ عصمت انونو جب مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو آخر وقت میں انہوں نے اس معاملہ میں اپنا جو تاثر بیان کیا وہ عرب رپورٹ کے مطابق یہ تھا:

إِنَّنِي أَكَادُ أُصَدِّقُ مَا أَرَى. لَقَدْ بَذَلْنَا كُلَّ مَا نَسْتَطِيعُ لِانْتِزاعِ الْإِسْلَامِ مِنْ نُفُوسِ الْأَتْرَاكِ وَغَرْسِ مَبَادِئِ الْحَضَارَةِ الْغَرْبِيَّةِ مَكَانَهُ. فَإِذَا بِنَا نَفَاجَأُ بِمَا لَمْ نَكُنْ نَتَوَقَّعُهُ. فَقَدْ غَرَسْنَا العِلْمَانِيَّةُ فَأَثْمَرَ الْإِسْلَامُ (الوعی الاسلامی، ذوالقعدہ 1408ھ، العدد 287، صفحہ 27)۔ میرے لیے اس پر یقین کرنا مشکل ہے جس کو میں دیکھ رہا ہوں۔ ہم نے اپنے بس بھر تمام کوشش کی کہ ترکوں کے دل سے اسلام کو نکال دیں۔ اور اس کی جگہ مغربی تہذیب کو ان کے اندر داخل کر دیں۔ مگر حیرت انگیز طور پر نتیجہ ہماری توقع کے خلاف نکلا۔ چنانچہ ہم نے تو سیکولرزم کا پودا بویا مگر پھل نکلا تو وہ اسلام تھا۔

اس سلسلہ میں دوسری ناکام مثال سوویت یونین کی ہے۔ اس علاقہ میں اولاً فکری طور پر اور پھر 1917ء سے طاقت ور حکومت کے زور پر اسلام کو مٹانے کی کوشش کی گئی۔ مجموعی طور پر یہ کوشش تقریباً ایک سو سال تک جاری رہی۔ مگر 1991 میں خود کمیونسٹ ایمپائر ٹوٹ گیا۔ اور اس کے بعد حیرت انگیز طور پر اس کے ملبہ سے اسلام زندہ حالت میں نکل آیا۔

امریکی میگزین ٹائم (12 مارچ 1990ء) نے سوویت علاقہ کے بارے میں ایک

رپورٹ شائع کی تھی۔ اس رپورٹ کا خاص مقصد یہ معلوم کرنا تھا کہ نئے روس میں مذہب کی حیثیت کیا ہے۔ اس سلسلہ میں اس نے 55 ملین سوویت مسلمانوں کا بھی جائزہ لیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ اس علاقہ میں اسلام دوبارہ نئی طاقت کے ساتھ زندہ ہو گیا ہے۔ اس باتصویر رپورٹ کی سرخی بامعنی طور پر یہ تھی — کارل مارکس محمد کو جگہ دیتا ہے:

Karl Marx makes room for Muhammad.

اسلام کے خلاف تاریخ کا ہر چیلنج صرف یہ ثابت کر رہا ہے کہ اسلام ابدی طور پر ایک دین مستحکم ہے، اس کو کوئی زیر کرنے والا نہیں۔

آخری بات

یہاں ہم نے صرف دور جدید کے چند انقلابات کا مختصر ذکر کیا ہے۔ اسلام کے ساتھ اس قسم کے ناموافق واقعات پچھلے چودہ سو سال میں بار بار پیش آئے ہیں۔ ہر واقعہ اپنی ابتدا میں مخالفت اسلام کا واقعہ نظر آتا تھا۔ مگر اپنی انتہا پر پہنچ کر وہ عین حمایت اسلام کا واقعہ بن گیا۔ تیرھویں صدی عیسوی میں تاتاریوں کا غلبہ اور پھر اسلام کی فکری قوت سے ان کا مغلوب ہونا اسی نوعیت کی ایک مشہور مثال ہے۔

تاریخ کا یہ متواتر تجربہ ہمارے لیے نہایت حوصلہ بخش خوش خبری ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس دنیا میں اسلام کے حق میں فکری غلبہ کو ابدی طور پر مقدر کر دیا گیا ہے۔ اہل اسلام کو چاہیے کہ وہ کسی بھی طوفان کو دیکھ کر مایوس نہ ہوں۔ بلکہ یقین کے سرمایہ کے ساتھ اسلام کی دعوت کو لے کر آگے بڑھیں۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ مخالف کی زیادتیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اگر تم اس کے سامنے دعوتِ خیر پیش کرو تو تم دیکھو گے

کہ جو بظاہر تمہارا دشمن تھا وہ تمہارا قریبی دوست بن گیا ہے (فصلت، 41:34)۔

وَالآنَ وَنَحْنُ نُوَاجِهُ الصُّعُوبَاتِ وَالمُشْكِلَاتِ، لَوْ أَنَّنَا أَقَمْنَا القُرْآنَ فَسَوْفَ يُثْبِتُ التَّارِيخُ، وَكَأَنَّمَا سَيْفُ التَّتَرِ قَدْ ظَهَرَ مَرَّةً أُخْرَى لِيَتَحَوَّلَ إِلَى خَادِمٍ وَحَامٍ لِدِينِ اللّٰهِ كَمَا حَدَثَ فِي القَرْنِ السَّابِعِ الهِجْرِيِّ۔

پیغمبر اسلام کا اسوہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک شخص تھا جس کا نام مُسَیلِمہ بن حُبَیب تھا۔ وہ یمامہ کا رہنے والا تھا۔ اس نے پیغمبر ہونے کا جھوٹا دعویٰ کیا۔ 10 ھجری میں اس نے اپنے دو آدمیوں کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک خط بھیجا جس کا مضمون یہ تھا:

مِنْ مُسَيْلِمَةَ رَسُولِ اللّٰهِ، إِلَى مُحَمَّدٍ رَسُولِ اللّٰهِ: سَلَامٌ عَلَيْكَ، أَمَّا بَعْدُ، فَإِنِّي قَدْ أُشْرِكْتُ فِي الْأَمْرِ مَعَكَ، وَإِنَّ لَنَا نِصْفَ الْأَرْضِ، وَلِقُرَيْشٍ نِصْفَ الْأَرْضِ، وَلَكِنَّ قُرَيْشًا قَوْمٌ يَعْتَدُونَ (سیرۃ ابن ہشام، جلد 2، صفحہ 600)۔

مسیلمہ خدا کے رسول کی طرف سے محمد خدا کے رسول کے نام۔ تمہارے اوپر سلامتی ہو۔ اس کے بعد یہ کہ میں نبوت میں تمہارے ساتھ تمہارا شریک بنا دیا گیا ہوں اور یہ کہ نصف زمین (عرب) ہمارے لیے ہے اور نصف زمین قریش کے لئے۔ مگر قریش حد سے تجاوز کرنے والے لوگ ہیں۔

مسیلمہ کے سفیر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور اس کا خط پڑھا گیا تو آپ نے سفیروں سے پوچھا کہ تم لوگوں کا کہنا کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم بھی وہی کہتے ہیں جو وہ کہتا ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: اگر ایسا نہ ہوتا کہ سفیر قتل نہیں کیے

جاتے تو میں تم دونوں کی گردن مار دیتا : أَمَا وَاَللّٰهِ لَوْلَا أَنَّ الرُّسُلَ لَا تُقْتَلُ لَضَرَبْتُ أَعْنَاقَكُمَا)۔اس کے بعد آپ نے مسیلمہ کو حسب ذیل خط لکھوایا:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ، مِنْ مُحَمَّدٍ رَسُولِ اللّٰهِ، إِلَى مُسَيْلِمَةَ الْكَذَّابِ: السَّلَامُ عَلَى مَنْ اتَّبَعَ الْهُدَى. أَمَّا بَعْدُ، فَإِنَّ الْأَرْضَ لِلّٰه يُورِثُهَا مَنْ يُشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ، وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ (سیرت ابن ہشام، جلد 2، صفحہ 601-600) بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ محمد اللہ کے رسول کی طرف سے مسیلمہ کذاب کے نام۔ سلامتی ہے اس شخص کے لیے جو ہدایت کی پیروی کرے۔ اور زمین اللہ کی ہے۔ وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کا وارث بناتا ہے اور انجام صرف متقیوں کے لیے ہے۔

اس واقعہ میں ایک طرف سچے رسول اور جھوٹے رسول کا تقابل ملتا ہے۔ مسیلمہ کا خط واضح طور پر جھوٹے رسول کا خط ہے اور پیغمبر اسلام کا خط واضح طور پر سچے رسول کا۔

دوسری بات جو پیغمبر اسلام کے اسوہ سے معلوم ہوئی ہے وہ یہ کہ غیر قوم کا سفیر خواہ وہ بدترین مجرم کیوں نہ ہو، اس کو قتل نہیں کیا جائے گا بلکہ اس کو اس کے وطن کی طرف واپس کر دیا جائے گا۔ ان معاملات میں بین الاقوامی اصول ہی اسلام کا اصول ہے۔

پیغمبرانہ طریقہ

سیرت کی کتابوں میں جن واقعات کا ذکر ہے، ان میں سے ایک وہ ہے جس کو ’’حلف الفضول‘‘ کہا جاتا ہے۔ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب کہ آپ کو ابھی پیغمبری نہیں ملی تھیں۔ مکہ میں عبداللہ بن جُدعان کے مکان میں کچھ لوگ جمع ہوئے۔ انہوں نے مل کر یہ عہد کیا کہ وہ

مظلوم کی حمایت کریں گے اور حقدار کو اس کا حق دلائیں گے۔ جو افراد اس اجتماع میں شریک ہوئے، ان میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم بھی تھے۔ ابن اسحاق کی روایت ہے کہ پیغمبری کے بعد مذکورہ اجتماع (حلف الفضول) کا ذکر ہوا تو آپ نے فرمایا کہ اس وقت میں بھی اس میں شریک تھا۔ اور اب اسلام کے بعد بھی اگر مجھے اس کے لیے بلایا جائے تو میں لبیک کہوں گا: وَلَوْ أدعَى بِهِ فِي الْإِسْلَامِ لأجبتُ (سیرت ابن ہشام، جلد 1، صفحہ 124)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد حِلف الفضول والے کام کے بارے میں تھا۔ دوسری طرف دعوت توحید کے بارے میں آپ نے فرمایا کہ یہ میرا راستہ ہے۔ میں لوگوں کو پوری بصیرت کے ساتھ اللہ کی طرف بلاتا ہوں، میں اور میری پیروی کرنے والے بھی: هٰذِهٖ سَبِيلِي أَدْعُوا إِلَى اللهِ عَلَى بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي (12:108)۔

ان دونوں باتوں پر تقابلی اعتبار سے غور کیجیے۔ اس سے واضح طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ "حلف الفضول" والے کام میں آپ صرف مدعو کی حیثیت اپنے لیے پسند فرماتے تھے۔ جب کہ "دعوت توحید" والے کام میں آپ داعی کی حیثیت اختیار کیے ہوئے تھے۔ معلوم ہوا کہ ایسا ماحول جہاں شرک کی غلبہ ہو، وہاں دعوت توحید ہی اہل ایمان کا اصل ایجابی کام ہوگا۔ وہ داعی الی اللہ بن کر اٹھیں گے۔ جہاں تک سماجی امن اور اخلاقی سدھار کی بات ہے، اس میں وہ خیر طلب عناصر کے بلاوے پر وقتی طور پر ان کے ساتھ شریک ہو سکتے ہیں، مگر اسی کو اپنی دعوت وتحریک کی بنیاد نہیں بنا سکتے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانی بگاڑ کی اصل جڑ ہمیشہ خدا فراموشی ہوتی ہے، اور پیغمبر، اور اس کی اتباع میں اہل ایمان ہمیشہ جڑ پر محنت کرتے ہیں، نہ کہ شاخوں اور پتیوں پر۔

پیغمبرانہ اسلوب

پیغمبروں کی جو سیرت ہمارے علم میں آتی ہے اس کا ایک پہلو بڑا عجیب ہے۔ ہر پیغمبر اپنی ابتدائی زندگی میں لوگوں کا محبوب بنا ہوا تھا۔مگر جب اس نے پیغمبری کا کام شروع کیا تو انہیں لوگوں کے درمیان وہ انتہائی مبغوض شخص بن گیا۔لوگ اس کے دشمن ہو گئے۔خود پیغمبر آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی۔یہی معاملہ پیش آیا۔ پہلے آپ کی قوم آپ کو ''الامین'' کہتی تھی۔مگر جب آپ نے ان کو حق کا پیغام دینا شروع کیا تو وہ لوگ آپ کی ہلاکت کے درپے ہو گئے۔

یہ ایک مسلّم بات ہے کہ ہر پیغمبر اپنی سیرت و کردار کے اعتبار سے اعلیٰ ترین مقام پر ہوتا ہے۔وہ لوگوں کا خیر خواہ ہوتا ہے۔وہ لوگوں کی خدمت کرتا ہے۔وہ لوگوں کے درمیان بے ضرر بن کر رہتا ہے۔وہ لوگوں سے کسی چیز کی مانگ نہیں کرتا۔اس کا اخلاق اتنا اونچا ہوتا ہے کہ لوگوں کی برائی کا جواب بھی وہ بھلائی کے ساتھ دیتا ہے۔اس کا وجود سراپا نورانیت میں ڈھلا ہوا ہوتا ہے۔اس کے باوجود جب وہ پیغام رسانی کا کام شروع کرتا ہے تو لوگ نفرت کرنے لگتے ہیں۔

پیغمبر کے ساتھ یہ معاملہ معروف طور پر صرف '' کافروں'' کے درمیان نہیں ہوتا، بلکہ ٹھیک یہی معاملہ خود ''مسلمانوں'' کے درمیان بھی پیش آتا ہے۔حضرت مسیحؑ جن لوگوں کے درمیان مبعوث ہوئے وہ قدیم زمانہ کے مسلمان تھے۔مگر انہوں نے حضرت مسیح کے ساتھ بدترین سلوک کیا۔آپ کو ذلیل کیا۔آپ پر تھوکا۔آپ پر مشرکوں کی عدالت میں مقدمہ چلایا۔حتیٰ کہ آپ کو قتل کر دینا چاہا۔

پیغمبروں کی سیرت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے خلاف لوگوں کے غصہ اور دشمنی کا سبب صرف ایک تھا، اور وہ وہی چیز تھی جس کو موجودہ زمانہ میں تنقید کہا جاتا ہے۔ ابن اسحاق کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی قوم شروع میں دور نہیں ہوئی تھی۔ مگر جب آپ نے ان کے معبودوں کا تذکرہ کیا اور ان پر عیب لگایا تو اس کو انہوں نے بہت برا مانا۔ اس کے بعد وہ آپ کے دشمن ہو گئے: حَتّٰى ذَكَرَ آلِهَتَهُمْ وَعَابَهَا، فَلَمَّا فَعَلَ ذٰلِكَ أَعْظَمُوهُ وَنَاكَرُوهُ، وَأَجْمَعُوا خلافه وَعَدَاوَتَهُ (سیرت ابن ہشام، جلد 1، صفحہ 238)۔

ابن اسحاق نے جس چیز کو عیب لگانا کہا ہے اور جس کو مکہ کے مشرکین سب وشتم کہتے تھے، وہ آج کل کی زبان میں تنقید تھی۔ ہر نبی کا یہ طریقہ تھا کہ وہ مطلوب کی طرف بلاتے ہوئے غیر مطلوب پر تنقید کرتا تھا۔ یہی تنقیدی اسلوب تھا جس نے لوگوں کو پیغمبروں کا دشمن بنا دیا۔

اسوۂ حسنہ

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے قدیم مکہ میں دعوت کا کام شروع کیا تو مکہ کے لوگ، خاص طور پر وہاں کے سردار آپ کے سخت مخالف ہو گئے۔ انہوں نے آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو سخت ترین تکلیفیں دیں۔ مگر آپ کو حکم دیا گیا کہ تم کوئی جوابی کارروائی نہ کرو بلکہ یک طرفہ طور پر ان کی سختیوں کو نظر انداز کرو — دَعْ اَذٰهُمْ (33:48)۔

اس طرح آپ 13 سال تک صبر کرتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ لوگ آپ کی جان کے دشمن ہو گئے۔ انہوں نے تلوار لے کر آپ کے مکان کو گھیر لیا۔ اس وقت بھی آپ نے مقابلہ نہیں کیا۔ بلکہ اللہ کے حکم سے آپ خاموشی سے مکہ سے نکل کر مدینہ چلے گئے۔

مکہ کے لوگ اب بھی چپ نہیں بیٹھے۔ انہوں نے دھمکیاں دیں کہ وہ مدینہ پر حملہ

کریں گے اور اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ کو ختم کر دیں گے۔ چنانچہ ہجرت مدینہ کے ابتدائی دور میں آپ مہاجرین کے چھوٹے چھوٹے دستے مکہ کے راستوں پر بھیجتے تھے، تاکہ مکہ والوں کی سرگرمیوں سے واقفیت حاصل کریں، اور ان کے جارحانہ اقدام سے پیشگی طور پر باخبر ہو جائیں۔

رمضان 2ھ میں ابوسفیان کے تجارتی قافلہ کا واقعہ پیش آیا۔ اس کی حفاظت کے نام پر قریش کے تقریباً تمام سردار ایک طاقتور فوج لے کر نکلے۔ ان کا ارادہ تھا کہ وہ تجارتی قافلہ کو بچانے کے بعد مدینہ پر حملہ کریں۔ اس وقت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے براہ راست حکم کے تحت مدینہ سے نکلے۔ اللہ نے خصوصی طور پر فرشتوں کے ذریعہ اہل اسلام کی مدد کی۔ دونوں کے مقابلہ میں اہل مکہ کو زبردست شکست ہوئی۔

اس کے بعد بھی اہل مکہ خاموش نہیں رہے۔ انہوں نے بار بار جارحیت کرنا چاہا۔ مگر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم ٹکراؤ سے بچتے رہے۔ تاہم احد اور حنین کے موقع پر وہ یک طرفہ طور پر اہل اسلام پر ٹوٹ پڑے۔ اس کے نتیجہ میں جنگ واقع ہوئی۔

پیغمبر اسلام کا مقصد مخالفین کو قتل کرنا نہیں تھا بلکہ ان کو اسلام کے دائرہ میں داخل کر کے انہیں اسلام کی طاقت بنانا تھا۔ چنانچہ آپ نے حدیبیہ کے موقع پر یک طرفہ شرائط پر اہل مکہ سے دس سال کا ناجنگ معاہدہ کرلیا تاکہ دونوں فریقوں کے درمیان معتدل فضا قائم ہو اور دعوت کا عمل موثر انداز میں جاری ہو سکے۔

صلح حدیبیہ نے اہل اسلام کے لیے دعوت کے مواقع کھول دیے۔ چنانچہ تاریخ نے دیکھا کہ صرف دو سال کے اندر لوگ اتنی بڑی تعداد میں اسلام میں داخل ہوئے کہ کسی جنگ کے بغیر صرف عددی طاقت کے ذریعہ اسلام پورے عرب پر غالب آ گیا۔

ہجرت رسولؐ

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اپنی نبوت کے تیرھویں سال مکہ کو چھوڑ کر مدینہ چلے گئے۔ کچھ غیر مسلم مورخین اس کو فرار (flight) کہتے ہیں۔ مگر اسلامی تاریخ میں اس کو ہجرت کہا جاتا ہے۔ یہ محض خوش عقیدگی کی بات نہیں بلکہ ایک واقعہ کا اظہار ہے۔ اس قسم کا واقعہ عام طور پر فرار ہی ہوتا ہے۔ مگر یہ پیغمبر اسلام کا خصوصی کارنامہ ہے کہ آپ نے فرار کے معاملہ کو ہجرت کے معاملہ میں تبدیل کر دیا۔

عام لوگ جن کو اپنے ملک میں سخت حالات پیش آئے اور آخر کار ان کو وہاں سے "فرار" اختیار کرنا پڑا، وہ کون لوگ تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے حکومت وقت کے خلاف سیاسی تحریک چلائی۔ انہوں نے موجودہ حکمران کو بے دخل کر کے حکومت پر قبضہ کرنا چاہا۔ مگر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ سراسر اس کے برعکس تھا۔ آپ نے کسی کا اقتدار چھیننے کا منصوبہ نہیں بنایا۔ حتیٰ کہ مکہ والوں نے خود سے حکومت کی پیش کش کی تو اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ آپ لوگوں کو دینے کے لیے اٹھے تھے، نہ کہ لوگوں سے چھیننے کے لیے۔

پھر جب مکہ والوں نے آپ کو مکہ سے نکلنے پر مجبور کر دیا تو باہر جا کر آپ نے وہ نہیں کیا جو عام لوگ کرتے ہیں۔ آپ نے مدینہ میں بیٹھ کر مکہ والوں کے خلاف پروپیگنڈے کی مہم نہیں چلائی۔ اور نہ مکہ والوں کے خلاف کوئی سیاسی سازش کی۔ آپ مدینہ پہنچ کر بھی مکہ والوں کے خیر خواہ بنے رہے۔ آپ ان کے لیے دعائیں کرتے۔ آپ اس کے لیے تڑپتے کہ کاش یہ لوگ جہنم کے راستہ کو چھوڑ دیں اور جنت کے راستہ پر چلنے لگیں۔ آپ کی نظر اب بھی مکہ

والوں کے ملک و مال پر نہیں تھی بلکہ ان کی ہدایت اور نجات پر تھی۔ حتیٰ کہ مکہ والوں نے آپ کے خلاف جنگ چھیڑی تو آپ نے یک طرفہ شرائط پر ان سے صلح کرلی۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا مکہ چھوڑ کر مدینہ جانا خود اہل مکہ کے حق میں آپ کی ایک قربانی تھی۔ مدینہ میں قیام کے زمانہ میں بھی آپ اہل مکہ کے حق میں قربانیاں دیتے رہے۔ آپ نے نفرت کے واقعہ کو محبت میں تبدیل کیا۔ آپ نے بدخواہی کے معاملہ کو خیر خواہی کا رخ دے دیا۔ جو سلوک تخریبی ردعمل پیدا کرنے والا تھا، اس کو آپ نے تعمیری فضا پیدا کرنے کے لیے استعمال کیا— آپ کا یہی کارنامہ ہے جس کی بنا پر آپ کے ترک وطن کو فرار کے بجائے ہجرت کا نام دیا گیا ہے۔

قائد اتحاد

نبوت سے پہلے جب کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر ابھی 35 سال تھی، مکہ میں ایک واقعہ پیش آیا۔ یہ کعبہ کی تعمیر نو کا مسئلہ تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے کعبہ کی جو تعمیر کی تھی، وہ زمانہ گزرنے کی وجہ سے بوسیدہ ہوگئی تھی۔ چنانچہ قریش کو خیال ہوا کہ اس کو از سر نو تعمیر کیا جائے۔

پہلا مسئلہ قدیم دیوار کو توڑنے کا تھا۔ اب تمام لوگ ڈر گئے۔ ہر ایک اس اندیشہ میں تھا کہ اگر اس نے اس مقدس عمارت پر پھاوڑا چلایا تو کہیں اس کے اوپر کوئی آفت نازل نہ ہو جائے۔ آخر کار ولید بن مغیرہ نے ہمت کی۔ وہ کعبہ کے سامنے پھاوڑا لے کر کھڑا ہوا اور کہا: اللّٰهُمَّ لَمْ نَزِغْ ، اللّٰهُمَّ إنّا لَا نريدُ إلّا الخيرَ (سیرت ابن ہشام، جلد 1، صفحہ 180)۔ یعنی، اے اللہ، ہم نے ٹیڑھی راہ اختیار نہیں کی۔ اے اللہ، ہم بھلائی کے سوا کچھ نہیں چاہتے۔

اس کے بعد سب نے مل کر دیوار توڑی۔ مگر قدیم بنیاد کو باقی رکھا۔ ابن اسحاق کی روایت ہے کہ اس کھدائی میں ان کو ایک پتھر ملا۔ اس پر یہ کلمات لکھے ہوئے تھے:

مَنْ يَزْرَعْ خَيْرًا، يَحْصُدْ غِبْطَةً، وَمَنْ يَزْرَعْ شَرًّا، يَحْصُدْ نَدَامَةً، تَعْمَلُونَ السيئاتِ، وتُجزَوْن الْحَسَنَاتِ؟! أَجَلْ، كَمَا لَا يُجتنى مِنْ الشَّوْكِ العنب (سیرت ابن ہشام، جلد 1، صفحہ 182)۔ یعنی، جو آدمی نیکی بوئے گا وہ قابل رشک فصل کاٹے گا۔ اور جو آدمی برائی بوئے گا وہ ندامت کی فصل کاٹے گا۔ کیا تم لوگ برائی کروگے اور اچھا بدلہ پاؤ گے، ایسا نہیں ہوسکتا، جس طرح کانٹے کے پیڑ سے انگور نہیں توڑے جاسکتے۔

قریش کے ہر قبیلہ نے کعبہ کی تعمیر نو کے لیے پتھر جمع کیے۔ پھر اس کی تعمیر شروع کی۔ جب تعمیر اس مقام پر پہنچی جہاں حجر اسود کو دوبارہ لاکر نصب کرنا تھا تو قبائل کے درمیان جھگڑا ہوگیا۔ یہ ایک شرف کی بات تھی، چنانچہ ہر قبیلہ یہ چاہنے لگا کہ وہی حجر اسود کو اٹھائے اور وہی اس کو اس کے سابقہ مقام پر لاکر رکھے۔ اختلاف بڑھا۔ لوگ لڑنے مرنے پر تیار ہو گئے۔ یہاں تک کہ بنوعبدالدار خون سے بھرا ہوا ایک کٹورا لائے اور اس میں اپنی انگلیاں ڈال کر آخر وقت تک لڑائی کرنے کا عہد کیا۔

اسی تکرار میں چار یا پانچ دن گزر گئے۔ آخر ان کو ہوش آیا۔ سب کے سب مسجد کے اندر اکٹھا ہوئے۔ انہوں نے آپس میں مشورہ کیا اور انصاف پر راضی ہوگئے — ثُمَّ إِنَّهُمْ اجْتَمَعُوا فِي الْمَسْجِدِ، وَتَشَاوَرُوا وَتَنَاصَفُوا (سیرت ابن ہشام، جلد 1، صفحہ 182)۔ ابو امیہ بن المغیرہ اس وقت قریش میں سب سے زیادہ سن رسیدہ تھا۔ اس نے کہا کہ اے قریش

کے لوگو، تم لوگ اپنے اختلاف کا فیصلہ اس طرح کرو کہ کل صبح کو جو پہلا آدمی مسجد کے دروازہ سے داخل ہو اس سے اپنے معاملہ کا فیصلہ کرالو۔ سب نے یہ رائے مان لی۔

اگلے دن جو شخص سب سے پہلے مسجد میں داخل ہوا وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ لوگوں نے جب آپ کو دیکھا تو کہا کہ یہ تو "الامین" ہیں۔ ہم ان پر راضی ہیں، یہ تو محمد ہیں — هَذَا الْأَمِينُ، رَضِينَا، هَذَا مُحَمَّدٌ (سیرت ابن ہشام، جلد 1، صفحہ 182) اس کے بعد لوگوں نے اپنا مسئلہ آپ کے سامنے رکھا۔ آپ نے فرمایا کہ تم ایک کپڑا لاؤ۔ چنانچہ کپڑا لا کر آپ کو دیا گیا۔ آپ نے کپڑے کو زمین پر پھیلایا اور پھر حجر اسود کو اٹھا کر اس کپڑے پر رکھ دیا۔ آپ نے کہا کہ اب ہر قبیلہ اس کا ایک ایک کونا پکڑ لے پھر سب مل کر ایک ساتھ اس کو اٹھائیں۔

انہوں نے ایسا ہی کیا یہاں تک کہ جب وہ اس کو لے کر اصل مقام پر پہنچے تو آپ نے اپنے ہاتھ سے حجر اسود کو اٹھایا اور اس کو کعبہ کی دیوار میں وہاں رکھ دیا جہاں اس کو نصب کرنا تھا۔ اس کے بعد کعبہ کی تعمیر مکمل کی گئی۔ اختلاف اور لڑائی کا معاملہ پر امن طور پر حل ہو گیا۔ (سیرت ابن ہشام، جلد 1، صفحہ 197)

اس واقعہ سے اتحاد کے دو اصول ملتے ہیں۔ ایک یہ کہ قائد جو مرکز اتحاد کے طور پر کام کرے، اس کو اخلاقی اعتبار سے لوگوں کا معتمد علیہ ہونا چاہیے۔ لوگ اس کو سچے اور امانت دار کی نگاہ سے دیکھیں۔ لوگ اس کو اپنے سے کچھ اوپر محسوس کریں۔ جب تک ایسا ایک شخص درمیان میں نہ ہو، لوگوں کے درمیان اتحاد قائم نہیں ہو سکتا۔

دوسری بات یہ کہ قائد اتحاد دوسروں کا لحاظ کرنے والا ہو۔ ثمرۂ اتحاد میں وہ تمام لوگوں کو حصہ دار بنائے۔ اتحادی عمل میں وہ ہر ایک کو شریک کرے۔ کامیاب قائد دوسروں کے

درمیان انہیں کی طرح رہتا ہے۔ وہ ہر ایک کے ساتھ تواضع کا سلوک کرتا ہے۔ اس کے دل میں ہر ایک کے لیے خیر خواہی ہوتی ہے۔ وہ قائد ہو کر بھی اپنے آپ کو دوسروں کے برابر رکھتا ہے۔ یہی سچا قائد ہے۔

سنجیدگی شرط ہے

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللهَ كَثِيراً (33:21)۔ اللہ کے رسول میں تمہارے لیے بہترین نمونہ ہے، اس شخص کے لیے جو اللہ کا اور آخرت کے دن کا امیدوار ہو اور اللہ کو بہت زیادہ یاد کرے۔

قرآن کی اس آیت میں اللہ کے رسولؐ کو لوگوں کے لیے بہترین نمونہ بتایا گیا ہے۔ بظاہر یہ نمونہ قرآن اور حدیث اور سیرت کی کتابوں میں لکھا ہوا موجود ہے۔ مگر یہ نہیں فرمایا کہ اللہ کے رسول میں اس شخص کو اپنے لیے نمونہ ملے گا جو قرآن و حدیث اور سیرت کی کتابوں کو پڑھے بلکہ یہ فرمایا کہ یہ نمونہ جو پورے معنوں میں بہترین نمونہ ہے، وہ صرف اس شخص کو ملے گا جو اللہ سے ڈرے، جو آخرت کے لیے فکر مند ہو، جو اللہ کو بہت زیادہ یاد کرتا ہو۔

ایسا کیوں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول کا نمونہ جو کتابوں میں لکھا ہوا ہے وہ کوئی ریاضیاتی نوعیت کی چیز نہیں ہے۔ مثلاً کسی کتاب میں لکھا ہوا ہو کہ دو اور دو مل کر چار ہوتے ہیں، تو جو آدمی بھی اس کو کتاب میں پڑھے گا وہ اس کا ایک ہی مطلب نکالے گا۔ اس کو سمجھنے میں غلطی کرنے یا بھٹکنے کا کوئی امکان نہیں۔ مگر سیرت رسول کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ وہ ایک ایسی چیز ہے جس میں ہمیشہ مختلف تعبیرات کی گنجائش رہتی ہے۔ اس لیے اس کو صحیح طور

پر اخذ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی پوری طرح سنجیدہ ہو۔ ذہن پر اللہ کا تصور چھایا ہوا ہونا اور آخرت کے دن سے ڈرتے رہنا آدمی کے اندر یہی سنجیدگی پیدا کرتا ہے، اس لیے ایسا آدمی اس قابل ہوجاتا ہے کہ وہ رسول کے نمونہ کو صحیح طور پر اخذ کرسکے۔

جیسا کہ معلوم ہے، رسول اللہؐ کا نمونہ قرآن اور حدیث اور سیرت میں لکھا ہوا موجود ہے۔ مگر وہ دو اور دو چار کی طرح کوئی حسابی نوعیت کی چیز نہیں ہے۔ اس کا تعلق زندگی سے ہے۔ اور انسان کی زندگی ایک ایسی چیز ہے جو ہمیشہ حرکت میں رہتی ہے۔ وہ مختلف احوال سے گزرتی ہے۔ اس میں کبھی ایک قسم کی صورت حال پیش آتی ہے اور کبھی دوسری قسم کی صورت حال۔

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں مختلف قسم کی مثالیں ملتی ہیں۔ کبھی آپ دشمنوں کی مخالفانہ حرکتوں کو برداشت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور کبھی ان سے مقابلہ کرتے ہیں۔ کبھی آپ کو حکومت پیش کی جاتی ہے مگر آپ اس کو قبول نہیں کرتے اور کبھی خود حکومت قائم کرتے ہیں۔ کبھی آپ صرف ایمان اور اخلاق کی باتیں کرتے ہیں اور کبھی ایسے احکام بیان کرتے ہیں جن کا تعلق سیاست اور اجتماعی قانون سے ہوتا ہے۔ کبھی آپ آخرت کے مسئلہ پر اس طرح زور دیتے ہیں جیسے کہ وہی سب کچھ ہے اور کبھی دنیوی تدبیروں کی اہمیت بتاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اس قسم کا فرق واختلاف کے نمونہ کو تعبیر کی نوعیت ایک چیز بنا دیتا ہے۔ آپ کے نمونہ سے ہدایت لینے کے لیے ضروری ہوتی ہے کہ آدمی ایک چیز اور دوسری چیز کا فرق جانے۔ وہ ایک حالت میں اور دوسری حالت میں تمیز کرسکے۔ وہ اس حکمت سے آگاہ ہو کہ کب کون سا اسوہ مطلوب ہے اور کب کون سا اسوہ مطلوب ہے۔

اسی کا نام تعبیر صحیح ہے۔ اور اس تعبیر صحیح کی استعداد آدمی کے اندر صرف اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ خوف خدا اور فکر آخرت نے اس کو انتہائی حد تک سنجیدہ بنا دیا ہو۔ جو آدمی سنجیدہ نہ ہو وہ ایک موقع کی بات کو دوسرے موقع پر چسپاں کر دے گا۔ وہ اس فکری غلطی کا ارتکاب کرے گا جس کو "وَضْعُ الشَّيْءِ غَيْرَ مَوْضِعِهِ" کہا گیا ہے۔ وہ اس عوامی کہاوت کا مصداق بن جائے گا کہ — کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا، بھان متی نے کنبہ جوڑا۔

جس آدمی کے اندر گہری سنجیدگی اور شدید احتیاط کی مذکورہ صفت موجود نہ ہو وہ تعبیر کی غلطیوں کی وادی میں بھٹکتا رہے گا، وہ اسوہ رسول سے کبھی اپنے لیے نمونہ حاصل نہ کر سکے گا۔

ایسے شخص کا حال یہ ہوگا کہ جہاں احتساب خویش کے حکم پر عمل کرنے کی ضرورت ہو وہاں انتقام غیر کی آیت کا حوالہ دے گا۔ جہاں صبر کا موقع ہو وہاں وہ جہاد کی باتیں کرے گا۔ جہاں حدیبیہ کی سنت مطلوب ہو وہاں وہ دفاع کی حدیث سنائے گا۔ جہاں غیر قوم کے ساتھ مدعو کا معاملہ کرنا ہو وہاں وہ اس کے خلاف بدر و حنین کا معرکہ گرم کرنے پر تقریر کرے گا۔ جہاں خود اپنے اندر دینی کردار پیدا کرنے کا وقت ہو وہاں وہ پیغمبر کے حاکمانہ اسوہ کو جوش و خروش کے ساتھ پیش کرے گا۔ جہاں یہ ضرورت ہو کہ اہل ایمان دعوت الی اللہ کے لیے اٹھیں وہاں وہ قتال کی آیتوں اور حدیثوں کا دفتر کھول دے گا۔

ایک شہادت

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (1984) میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر جو مقالہ ہے، اس کے آخر میں مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ بہت کم بڑے لوگ اتنا زیادہ بدنام کیے گئے ہیں جتنا کہ محمد کو بدنام کیا گیا۔ قرون وسطی کے یورپ کے مسیحی علما نے ان کو فریبی اور عیاش اور خونی

انسان کے روپ میں پیش کیا۔ حتیٰ کہ آپ کے نام کا ایک بگڑا ہوا تلفظ مہاونڈ (نعوذ باللہ) شیطان کے ہم معنی بن گیا۔ محمد اور ان کے مذہب کی یہ تصویر اب بھی کسی قدر اپنا اثر رکھتی ہے۔ انگریز مصنف ٹامس کارلائل پہلا قابل ذکر مغربی شخص تھا جس نے 1840 میں بتاکید عوامی طور پر کہا کہ محمد یقینا سنجیدہ تھے کیونکہ یہ فرض کرنا بالکل مضحکہ خیز ہے کہ ایک فریبی آدمی ایک عظیم مذہب کا بانی ہوسکتا ہے:

> Few great men have been so maligned as Muhammad. Christian scholars of medieval Europe painted him as an impostor, a lecher, and a man of blood. A corruption of his name,'Mahound' even came to signify the devil. This picture of Muhammad and his religion still retains some influence. The English author Thomas Carlyle in 1840 was the first notable European to insist publicly that Muhammad must have been sincere, because it, was ridiculous to suppose an impostor would have been the founder of a great religion. (*Encyclopedia Britannica*, Vol.12 p. 609)

مغربی پروپیگنڈے کی تردید کے لیے ٹامس کارلائل نے یہاں جو دلیل استعمال کی ہے، وہی کسی شخص کے بارے میں رائے قائم کرنے کے لیے سب سے زیادہ درست اور یقینی ہے۔ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے، اسی طرح انسان اپنے کردار سے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جو شخص پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام پڑھے، جو یہ دیکھے کہ روز وشب آپ کن سرگرمیوں میں مصروف رہتے تھے اور یہ کہ آپ کے اثر سے کس قسم کی تحریک برپا ہوئی، وہ ہرگز یقین نہیں کرسکتا کہ یہ سب نعوذ باللہ ایک فریبی انسان کا کارنامہ ہے۔

ایک شخص جس کے کلام میں تعمیر انسانیت کی باتیں ہوں، جس کا لہجہ درد اور سوز سے بھرا ہوا ہو، جس کے مشن سے لوگوں کی زندگیوں میں صالح انقلاب آرہا ہو، وہ کبھی فریبی انسان نہیں ہوسکتا، فریبی انسان ایک فریبی تحریک اٹھا سکتا ہے، نہ کہ ایک صالح ربانی تحریک۔

مذہب امن

اسلام امن اور محبت کا مذہب

اسلام مذہبِ امن

یورپ کے ایک سفر میں میری ملاقات ایک مسلم نوجوان سے ہوئی۔ وہ ایک عرب ملک سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ روزگار کی تلاش میں تھے۔ اس سلسلہ میں وہ ایک غیر مسلم ادارہ میں انٹرویو کے لیے گئے۔ گفتگو کے دوران انٹرویور نے ان سے پوچھا کہ کیا تم مسلمان ہو۔ نوجوان نے کہا کہ ہاں۔ یہ سن کر انٹرویور نے فوراً کہا کہ پھر تو تم دہشت گرد ہو:

Then you are a terrorist.

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے ایک طبقہ کے کٹرپن اور اس کی جنگ جویانہ سرگرمیوں کی وجہ سے عام طور پر یہ سمجھا جانے لگا ہے کہ اسلام دہشت گردی (terrorism) کا مذہب ہے۔ اسلام اپنا مقصد جنگ اور تشدد کے ذریعے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ مگر یہ بات مکمل طور پر خلافِ واقعہ ہے۔

اسلام مسلمانوں کے کسی رویہ کا نام نہیں ہے۔ اسلام ایک اصولی مسلک کا نام ہے، وہ کسی قوم کے قومی طرزِ عمل کا نام نہیں۔ مسلمانوں کے عمل کو اسلام سے جانا جائے گا، نہ کہ اسلام کو مسلمانوں کے عمل سے جانچا جانے لگے۔ اگر کچھ مسلمان دہشت گردی کی روش اختیار کیے ہوئے ہیں تو اس کے ذمہ دار وہ خود ہیں، نہ کہ اسلام۔ ان کے اسلامی نعرہ کی وجہ سے ان کا عمل اسلام کا عمل نہیں بن جائے گا۔

اسلام پیغمبر اسلام کی تعلیمات اور آپ کے نمونہ حیات کا نام ہے۔ اور پیغمبر اسلام امن کے پیغمبر تھے، وہ جنگ کے پیغمبر نہیں تھے۔ اسی لیے قرآن میں آپ کو رحمۃ للعالمین کہا گیا

ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے کہ: ہم نے تم کو ساری دنیا کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے: **وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِلْعَالَمِينَ** (21:107)۔

علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد تھے۔ ان کے یہاں پہلا بچہ پیدا ہوا تو انھوں نے اس کا نام حرب رکھا۔ عرب ایک جنگجو قوم تھے۔ چنانچہ وہ جنگی ناموں کو پسند کرتے تھے۔ لیکن پیغمبر اسلام کو معلوم ہوا تو آپ نے حرب نام کو پسند نہیں کیا۔ آپ نے کہا کہ اس کے بجائے تم بچہ کا نام حسن رکھو (المعجم الکبیر للطبرانی، حدیث نمبر 2777)۔

اس سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا مزاج معلوم ہوتا ہے۔ آپ پورے معنوں میں ایک امن پسند انسان تھے۔ آپ کی امن پسندی اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ آپ حرب جیسا لفظ سننا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ آپ تشدد میں نہیں بلکہ حسن اخلاق میں یقین رکھتے تھے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم ایک عظیم انقلاب لے کر آئے۔ مگر یہ انقلاب امن کی قوت سے برپا کیا گیا، نہ کہ جنگ کی قوت سے۔ اگر کبھی آپ نے جنگ کی تو وہ مجبورانہ دفاع کے طور پر تھی، نہ کہ آپ کی اپنی پسند اور آپ کے اپنے انتخاب کے تحت۔

امن آپ کی زندگی کا ایک عمومی اصول تھا اور جنگ صرف ایک اتفاقی استثناء۔ چنانچہ اپنی 23 سالہ پیغمبرانہ زندگی میں آپ نے صرف تین لڑائی لڑی (بدر، احد، حنین)۔ یہ تینوں لڑائیاں دفاعی تھیں اور ان میں مجموعی طور پر صرف ڈیڑھ دن صرف ہوئے۔

زید بن مُہَلہِل نجد میں بعثت نبوی سے پہلے پیدا ہوئے۔ وہ شاعر تھے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے شمشیر زنی اور گھوڑے کی سواری میں شہرت حاصل کی۔ چنانچہ وہ زید الخیل کہے جانے لگے۔ خیل عربی زبان میں گھوڑے نیز گھوڑ سوار کو کہتے ہیں۔

انھوں نے اسلام سے پہلے فارِس (شہ سوار) اور شمشیر زن کی تعریف پر ایک پر جوش نظم

کہی تھی۔ اس میں وہ اپنے قبیلہ کے بارے میں کہتے ہیں کہ میری قوم لوگوں کی سردار ہے۔ اور سرداری اس وقت قائد بنتا ہے جب کہ شعلہ بار ہتھیلیوں نے جنگ کی آگ کو بھڑکا دیا ہو:

وَقَوْمِي رُؤُوسُ النّاسِ وَالرَّأْسُ قَائِدٌ

إِذَاالحَرْبُ شَنَّتْهاالأَكُفُّ المَسَاعِرُ

(لباب الاداب لأسامة بن منقذ، جلد 1، صفحہ 220)۔

زید الخیل ہجرت کے بعد مدینہ آ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے اور اسلام قبول کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زید الخیل کا نام پسند نہیں کیا۔ آپ نے ان کا نام بدل کر زید الخیر رکھ دیا۔ 9ھ میں مدینہ میں ان کا انتقال ہوا۔

یہ واقعہ اسلام کی اسپرٹ کو بتاتا ہے۔ اسلام دین رحمت ہے۔ اسلام کا مقصد آدمی کو زید شہ سوار بنانا نہیں ہے۔ بلکہ اسلام کا مقصد یہ ہے کہ آدمی زید صاحب خیر بنے۔ قدیم عرب میں گھوڑا دوڑانا اور تلوار کا کمال دکھانا ہیروانہ کام سمجھا جاتا تھا۔ پیغمبر اسلام نے ان کے جذبات کو موڑا۔ اور ان کو یہ ذہن دیا کہ وہ خیر کے حامل بنیں، وہ خیر کے میدان میں بڑے بڑے کارنامے انجام دیں۔ وہ لوگوں کو موت کا تحفہ نہ دیں بلکہ وہ لوگوں کو زندگی کا تحفہ دینے کی کوشش کریں۔

آج کل کی زبان میں اگر کہا جائے تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اسلام کا مقصد تخلیقی (creative) انسان پیدا کرنا ہے۔ اللہ پر ایمان آدمی کے اندر تخلیقی اوصاف کو جگا دیتا ہے۔ وہ ہر اعتبار سے ایک نیا انسان بن جاتا ہے۔ اس کی سوچ عام سوچ سے اوپر اٹھ جاتی ہے۔ اس کا کردار دوسرے لوگوں کے کردار سے بلند ہو جاتا ہے۔ وہ زمین میں رہتے ہوئے ایک آسمانی انسان بن جاتا ہے۔ وہ ظواہر میں جینے کے بجائے حقائق میں جینے لگتا ہے۔

دوسرے لوگ اگر اپنی ذات کو چاہنے والے ہوتے ہیں تو وہ خیر کو چاہنے والا ہوتا ہے۔

دوسرے لوگ اگر استحصال کرنے والے ہوتے ہیں تو وہ نفع پہنچانے والا ہوتا ہے۔ دوسرے لوگوں کے مزاج میں اگر سرکشی ہوتی ہے تو اس کے مزاج میں تواضع ہوتی ہے۔ دوسرے لوگوں کی خصوصیت اگر جنگ پسند ہوتی ہے تو اس کی خصوصیت امن پسند۔ دوسرے افراد اگر لوگوں کو مار کر خوش ہوتے ہیں تو وہ لوگوں کو زندگی دے کر خوشی حاصل کرتا ہے۔ دوسروں کے پاس اگر لوگوں کے لیے نفرت کا تحفہ ہوتا ہے تو اس کے پاس صرف محبت کا تحفہ، خواہ دوسرے لوگ اس سے نفرت کا معاملہ کیوں نہ کر رہے ہوں۔

صحیح البخاری میں عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک روایت ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کے اجتماعی امور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ کیا تھا۔ امام البخاری نے یہ حدیث چار ابواب کے تحت نقل کی ہے۔ اس روایت کے الفاظ یہ ہیں: مَا خُيِّرَ رَسُولُ اللّٰهِ صلی اللّٰه علیه وسلم بَيْنَ أَمْرَيْنِ إِلَّا أَخَذَ أَيْسَرَهُمَا (صحیح البخاری، حدیث نمبر 3560)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب بھی دو معاملوں میں سے ایک کو لینا ہوتا تو آپ ہمیشہ دونوں میں سے آسان کو لیتے تھے۔

یہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک سنت ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں کے درمیان آپ کو جو معاملات پیش آتے تھے، ان میں آپ ہمیشہ آسان پہلو کا انتخاب فرماتے تھے۔ جب ایک طریقہ امن کا ہو اور دوسرا طریقہ ٹکراؤ کا، ایک طرف نزاع ہو اور دوسری طرف موافقت ہو، ایک جنگ کا راستہ ہو اور دوسرا صلح کا راستہ ہو، تو ان تمام صورتوں میں آپ اسی صورت کو اختیار کرتے تھے جو نسبتاً سہل اور آسان ہو۔ غور کیا جائے تو یہ اصول آپ کی پوری زندگی پر چھایا ہوا نظر آئے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ سنت ایک معلوم اور مشہور سنت ہے۔ مگر عام طور پر اس کا انطباق صرف چھوٹے چھوٹے امور میں کیا جاتا ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم جب جماعت کے ساتھ نماز پڑھا رہے ہوتے اور پیچھے سے کسی بچہ کے رونے کی آواز آجاتی جس کو اس کی ماں مسجد میں لائی تھی تو آپ نماز کو مختصر کر دیتے۔ ایسی حالت میں آپ لمبی سورہ پڑھنے کے بجائے چھوٹی سورہ پڑھ کر نماز کو جلد ختم کر دیتے تا کہ بچہ کی ماں کو پریشانی نہ ہو (صحیح البخاری، حدیث نمبر 707)۔ مگر زیادہ بڑے بڑے امور میں اس سنت کا ذکر نہیں کیا جاتا اور نہ بڑے امور میں اس کو منطبق کیا جاتا ہے۔

مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تو اس وقت کعبہ میں 360 بت رکھے ہوئے تھے۔ اگر آپ کعبہ کی تطہیر سے اپنی مہم کا آغاز کرتے تو یہ آپ کے لیے مشکل انتخاب ہوتا۔ اس لیے آپ نے دلوں کی تطہیر سے اپنے کام کا آغاز فرمایا۔ چنانچہ قرآن میں پہلی آیت یہ اتاری گئی کہ: اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ (96:1)۔ یعنی، پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔ گویا کہ طَهِّرِ الْكَعْبَةَ مِنَ الْأَصْنَامِ (کعبہ کو بتوں سے پاک کرو) کے بجائے آپ کو یہ حکم دیا گیا کہ طَهِّرِ الْقُلُوبَ مِنَ الْأَصْنَامِ (دلوں کو بتوں سے پاک کرو)۔

مکی زندگی کے آخر میں آپ کے مخالفین آپ کو قتل کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ اس وقت ایک صورت یہ تھی کہ آپ دفاعی ذہن کے تحت تمام مسلمانوں کو متحد کر کے جنگ کا طریقہ اختیار کرتے۔ اس کے بجائے آپ نے یہ کیا کہ خاموشی کے ساتھ مکہ کو چھوڑ کر مدینہ چلے گئے اور دوسرے مسلمانوں کو بھی ایسا ہی کرنے کا مشورہ دیا۔ یہ مقابلہ کے بجائے ترک مقام کو اختیار کرنا تھا۔

حدیبیہ کے واقعہ میں آپ کے لیے جنگ اور واپسی میں انتخاب کا مسئلہ پیدا ہو گیا تھا۔ آپ نے یہاں بھی جنگ کے طریقہ کو چھوڑا اور میدان سے واپسی کے طریقہ کو لے لیا۔

جن لوگوں نے حج یا عمرہ کیا ہے۔ انھوں نے دیکھا ہے کہ کعبہ سے متصل ایک جگہ ہے جس کو حطیم کہا جاتا ہے۔ یہ جگہ حضرت ابراہیم کی تعمیر کے مطابق، کعبہ میں شامل تھی۔ بعد کو

مشرکین نے نئی تعمیر کے وقت اس کو الگ کر دیا۔ فتح مکہ کے بعد آپ کو موقع تھا کہ کعبہ کو ازسرنو بنا کر حطیم کو اس میں شامل کر دیں۔ مگر اس وقت کے حالات میں یہ ایک نزاعی کام تھا۔ چنانچہ نزاع سے بچنے کی خاطر آپ نے کعبہ کو اسی حالت میں چھوڑ دیا جیسا کہ مشرکین نے اسے بنایا تھا۔

غور کیا جائے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی اسی اصول (اختیار ایسر) کا مصداق نظر آئے گی۔ آپ نے ہمیشہ ہر معاملہ میں مشکل طریقہ کو چھوڑ کر آسان طریقہ کا انتخاب فرمایا ہے۔ اسی اصول کو موجودہ زمانہ میں پر امن طریقہ عمل (peaceful method) کہا جاتا ہے۔

جنگ اور تشدد کا طریقہ اسلام کے لیے مفید نہیں ہے۔ جنگ باز آدمی تشدد کے ذریعہ اپنا مقصد حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس قسم کا طریقہ اسلام کے لیے بالکل اجنبی ہے۔ کیونکہ اسلام کا مقصد دل و دماغ کو بدلنا ہے اور دل و دماغ کو بدلنے کا کام تشدد کے ذریعہ کیا جانا ممکن نہیں۔ دل و دماغ کو بدلنے کا کام نصیحت (persuasion) کے ذریعہ ہوتا ہے نہ کہ طاقت (force) کے ذریعہ۔

اسلام کا مقصد یہ ہے کہ اللہ کے بندوں کو اللہ کی معرفت حاصل ہو۔ لوگ آخرت کی جوابدہی کے احساس میں جینے والے بنیں۔ لوگوں کے اندر وہ اعلیٰ روحانی اوصاف پیدا ہوں جن کو تقویٰ، خشیت، انابت، تضرع، اخبات، وغیرہ الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ لوگ حق کو پہچاننے والے اور حق کا اعتراف کرنے والے بنیں۔ لوگوں کے اندر وہ ربانی شخصیت پرورش پائے جو جنت میں بسائے جانے کے قابل ہو۔

یہی اسلام کا اصل مطلوب ہے، اور جنگ یا تشدد کے ذریعہ اس مطلوب کو حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ اس کو حاصل کرنے کا ذریعہ صرف ایک ہے، اور وہ پر امن دعوت و تبلیغ ہے۔ اسلام کے طریق کار کو ایک لفظ میں دعوتی طریقہ کہا جا سکتا ہے، نہ کہ جنگ جویانہ طریقہ۔

دوسری بات یہ ہے کہ اسلام ایک دعوت ہے۔ اور دعوتی عمل صرف پر امن حالات میں انجام دیا جا سکتا ہے۔ جہاں تناؤ اور ٹکراؤ کا ماحول ہو وہاں دعوت وتبلیغ کا کام کرنا ممکن نہیں۔ اس لیے اسلام چاہتا ہے کہ ہر قیمت پر انسانوں کے درمیان امن قائم رہے۔ حتیٰ کہ امن کے قیام کے لیے اگر اہل اسلام کو یک طرفہ قربانی دینا پڑے تو یک طرفہ قربانی دے کر انہیں امن وامان کو قائم کرنا چاہیے۔

طریق کار ہمیشہ آدمی کے اپنے مشن کے اعتبار سے متعین ہوتا ہے۔ اسی لیے دادا گیری کرنے والے کا طریق کار ایک تاجر کے طریق کار سے مختلف ہوتا ہے۔ دادا کا مقصد لوگوں کو خوف زدہ کرنا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ لوگ جتنا زیادہ اس سے خوف میں رہیں گے اتنا ہی زیادہ اس کو اپنا مقصد حاصل کرنے کا موقع ملے گا۔ اس لیے دادا یہ کرتا ہے کہ وہ تشدد اور ٹکراؤ کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ وہ لوگوں کو اپنی طاقت کا تجربہ کراتا ہے۔ کیونکہ ڈر کی نفسیات اسی طریقہ کے ذریعہ پیدا کی جاسکتی ہے۔

مگر تاجر کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ تاجر کا مقصد لوگوں کو اپنا گرویدہ بنانا ہے۔ گرویدہ ہونے کے بعد ہی کوئی شخص ایک تاجر کے سامنے اپنی جیب خالی کرنے پر راضی ہوسکتا ہے۔ اس لیے تاجر محبت اور صلح کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ کیونکہ محبت اور صلح کے ذریعہ ہی وہ کسی کو اپنا گاہک بنا سکتا ہے۔

اسلام ایک دعوتی مذہب ہے۔ اس لیے اسلام اس کا تحمل نہیں کرسکتا کہ وہ دادا گیری والا طریقہ اختیار کرے۔ اسلام کے لیے صرف تاجر والا طریقہ ہی مفید اور کارگر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں یک طرفہ حسن سلوک پر زور دیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں جنگ کے بجائے صلح اور تشدد کے بجائے امن کی تاکید کی گئی ہے۔

اسلام کا مقصد لوگوں کا ذہن بدلنا اور ان کا دل جیتنا ہے۔ اور اس قسم کا سنجیدہ کام صرف پر امن طور پر ہی انجام دیا جا سکتا ہے۔ تشدد کا طریقہ اسلام کی راہ میں رکاوٹ ہے، نہ کہ معاون۔

دین انسانیت

اسلام دینِ انسانیت ہے۔ خدا نے بار بار اپنے پیغمبروں کے ذریعے ہدایت نامہ بھیجا۔ اسی خدائی ہدایت نامے کے محفوظ ایڈیشن کا نام اسلام ہے — زیر نظر کتاب میں اسی پہلو سے اسلام کا فکری مطالعہ کیا گیا ہے۔

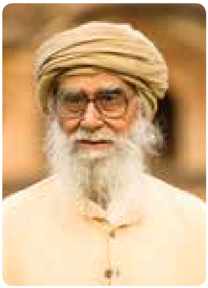

مولانا وحید الدین خاں (1925-2021ء) ایک اسلامی اسکالر اور امن کے سفیر تھے۔ انھوں نے اسلام کے حکیمانہ پہلو، مذہبی عدم تشدد، سماجی رواداری، ماڈرن ایج کے ساتھ اسلام کی مطابقت، اور دوسرے عصری مسائل کا حل پیش کیا ہے۔ مولانا نے عصری اسلوب میں 200 سے زیادہ کتابیں لکھی ہیں۔ ان کا انگریزی ترجمہ قرآن اپنی آسان اور قابلِ فہم زبان کی وجہ سے ساری دنیا میں مقبول ہے۔ انھوں نے 2001 میں سی پی ایس انٹرنیشنل کے نام سے نئی دہلی میں ایک ادارہ قائم کیا، تا کہ اس کے ذریعہ امن کلچر اور اسلام کی روحانی تعلیم کو ساری دنیا میں فروغ دیا جائے۔

mwkhan.com cpsglobal.org

PDF Order

ISBN 978-81-7898-782-8
9 788178 987828

Goodword Books
CPS International